سردار جعفری: کل اور آج

مرکز برائے اُردو زبان، ادب و ثقافت

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

گچی باؤلی، حیدر آباد

سردار جعفری: کل اور آج

مرتبین

ڈاکٹر ارشاد احمد   ڈاکٹر بی بی رضا خاتون

مرکز برائے اُردو زبان، ادب و ثقافت
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
گچی باؤلی، حیدرآباد

Sardar Jafri: Past and Present

by

Centre for Urdu Language, Literature & Culture

ISBN - 978-93-80322-04-9

کتاب : سردار جعفری: کل اور آج

اشاعت : جولائی' 2015ء

تعداد : چارسو (400)

ناشر : رجسٹرار' مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی' گچی باؤلی' حیدرآباد۔500032

مرتبین : ڈاکٹر ارشاد احمد' اسسٹنٹ پروفیسر' مرکز برائے اُردو زبان' ادب وثقافت

ڈاکٹر بی بی رضا خاتون' اسسٹنٹ پروفیسر' شعبہ اردو

طباعت : اے۔آر انٹرپرائزیز' حیدرآباد

پتہ : مرکز برائے اُردو زبان' ادب وثقافت

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی' گچی باؤلی' حیدرآباد 500 032

فون نمبر : 040-23008359, 23008360

ای۔میل : *zafaruddin65@gmail.com, cullcmanuu@gmail.com*

پیام

کارگزار وائس چانسلر

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

علی سردار جعفری 20 ویں صدی کے نمائندہ اردو شعراء میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ملک کی آزادی سے قبل اور مابعد سیاسی اور سماجی تبدیلیوں میں جن تحریکات نے نمایاں رول ادا کیا ان میں ترقی پسند تحریک کا اپنا مقام ہے۔علی سردار جعفری اس تحریک کے بجاطور پر سرخیل کہلانے کے مستحق ہیں۔

سردار جعفری کی شاعری ایک مقصد سے مربوط تھی اور ان کی زندگی بھی اسی مقصد کی تکمیل کے لئے وقف تھی۔ آزادی سے قبل وہ انقلاب کے داعی رہے اور آزادی کے بعد اپنی بقیہ تمام زندگی اسی ادھورے مشن کی تکمیل میں لگادی۔ وہ ہند۔پاک اتحاد کے بھی علمبردار تھے۔

علی سردار جعفری کی صد سالہ تقاریب کے موقع پر مرکز برائے اُردو زبان، ادب وثقافت نے دوروزہ قومی سمینار کا 25 اور 26 رفروری 2014ء میں انعقاد عمل میں لاتے ہوئے ان کی شخصیت اور مشن کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی عمدہ کوشش کی۔ ملک بھر سے نامور اسکالرس نے سردار جعفری کی شخصیت، مشن اور فن کے مختلف گوشوں کو اُجاگر کرتے ہوئے پر مغز مقالے پیش کیے۔ موضوع کی اہمیت اور تنوع کے پیش نظر ان مقالوں کو کتابی شکل دی جارہی ہے۔

اردو مرکز کے ذمہ دار اور ارکان اس کوشش کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مجھے امید ہے کہ مرکز، مستقبل میں بھی اہم موضوعات پر سمینار منعقد کرتے ہوئے مقالوں کو کتابی شکل دے کر اردو زبان کی خدمت کا سلسلہ جاری رکھے گا۔

خواجہ محمد شاہد

(پروفیسر خواجہ محمد شاہد)

فہرستِ مضامین

پیش لفظ

سردار جعفری صدی تقاریب کے حوالے سے مرکز برائے اُردو زبان' ادب وثقافت کی جانب سے منعقدہ دوروزہ قومی سمینار بعنوان ''سردار جعفری: کل اور آج'' میں پیش کردہ مقالوں کو شائع کرتے ہوئے ہمیں مسرت ہورہی ہے۔ اس سے قبل بھی مرکز کے زیر اہتمام منعقدہ سمینار کے مقالوں کی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے اور اس خوش گوار فریضے کی ادائیگی مرکز کی روایت کا حصہ ہے۔

اس صدی تقاریب کے ضمن میں اور اس سے قبل سردار جعفری کی شخصیت اور کارناموں پر متعدد تحریریں اور کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت ہمہ جہت ہے اور اردو زبان و ادب کے لیے ان کی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ لہٰذا ان کی شخصیت اور کارناموں پر مطالعے کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی جاتی رہے گی۔ زیر نظر کتاب بھی اسی احساس کے تحت شائع کی جارہی ہے۔

اس کتاب کے مقالات سردار جعفری کی شخصیت' ان کے افکار' ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی' ان کی شاعری' تنقید' نثر اور ٹیلی ویژن سیریل کے حوالے سے ان کی خدمات کا احاطہ کرتے ہیں۔

پدم شری جیلانی بانو نے اپنے مختصر مضمون ''ڈھونڈو گے' ہمیں ملکوں ملکوں' سردار جعفری...... کچھ یادیں کچھ باتیں'' میں سردار جعفری کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سردار جعفری کا عہد ان کی آواز بن گیا تھا۔ وہ ترقی پسند تحریک کے ایک ایسے معمار بن گئے تھے جنہوں نے نہ صرف نظری طور پر بلکہ عملی طور پر بھی تحریک کا دفاع کیا اور اس کے لیے تا زندگی سرگرم رہے۔ جیلانی بانو نے سردار جعفری سے اپنے ذاتی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ان سے ذاتی طور پر قریب تھے۔ تخلیقی زندگی کے ابتدائی دنوں میں سردار جعفری نے انہیں مناسب مشوروں سے نوازا اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ سردار جعفری کا یہ مشورہ نئے لکھنے والوں کے لیے نہایت اہم ہے کہ ''ایک ادیب فن کار ہمیشہ حق اور سچائی کی راہ دکھاتا ہے۔ وہ کوئی مخالفت اور مجبوری نہیں مانتا''۔

''علی سردار جعفری کی شخصیت کے چند پہلو'' کے عنوان کے تحت ڈاکٹر میر محبوب حسین نے سردار جعفری کی شخصیت کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس مقالے میں وہ جعفری صاحب کی زندگی کے مختلف ادوار کا جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سردار جعفری ایک اچھے انسان اور انسان دوست تھے۔ اس مقالے میں سردار جعفری کی اخلاقی خوبیوں کو نہایت تفصیل سے پیش کیا گیا ہے اور اس کی کوشش کی گئی ہے کہ کوئی پہلو چھوٹ نہ جائے۔ سردار جعفری کی فکری دنیا نہایت وسیع تھی جس کا محور ان کے سماجی افکار تھے۔

''سردار جعفری کی فکری تشکیل'' میں ڈاکٹر آمنہ آفرین نے جعفری صاحب کے بچپن میں جاگیردارانہ نظام کے مظالم کے خلاف ان کی ناپسندیدگی اور جدوجہد کو واضح کیا ہے۔ سردار جعفری کی تمام تخلیقی سرگرمیوں میں خواہ شاعری ہو یا نثر ان کے سماجی افکار کی نہایت گہری چھاپ نظر آتی ہے۔

''سردار جعفری کے سماجی افکار'' پروفیسر خواجہ محمد شاہد صاحب کا مختصر لیکن نہایت جامع اور مفید مقالہ ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے سردار جعفری کی فکری ترجیحات کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی سیاسی زندگی اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں پر گفتگو کی ہے۔ مقالہ نگار کا خیال ہے کہ سردار جعفری کی سیاسی زندگی کے حوالے سے بنیادی کام اب تک نہیں ہوا ہے کیونکہ اس سلسلے میں زیادہ مواد دستیاب نہیں۔ یہ مقالہ سردار جعفری پر اب تک کیے گئے تنقیدی کاموں پر ازسرنو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور مزید تنقیدی کاموں کی گنجائش کی طرف ہماری توجہ مبذول کرتا ہے۔

ترقی پسند تحریک اور سردار جعفری کے تعلق سے ڈاکٹر منظور احمد دکنی کا مضمون ''علی سردار جعفری کے ترقی پسند نظریات'' اور ظفر عبداللہ وانی کا مضمون ''علی سردار جعفری اور ترقی پسند تحریک'' شامل کتاب ہیں۔ ان مضامین میں سردار جعفری کی شخصیت اور فکر و فن پر ترقی پسند تحریک کے گہرے اثرات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

''مشترکہ کلچر اور سردار جعفری'' کے عنوان کے تحت نورالزماں مظہری نے اپنے مختصر مضمون میں سردار جعفری کو مشترکہ کلچر کا علمبردار قرار دیا ہے۔

راقم الحروف نے اپنے مضمون ''علی سردار جعفری کے شعری عوامل اور جہتیں'' میں سردار جعفری کی شاعری کے عوامل اور پس منظر کا جائزہ لیا ہے۔ سردار جعفری غالباً ہندوستان کے ایسے واحد شاعر ہیں جنھوں نے عظیم اکتوبر انقلاب، اس کے رہنما لینن اور سوویت اشتراکی سماج پر سب سے زیادہ نظمیں کہیں۔ ان کے یہاں مختلف شعری جہات دیکھنے کو ملتی ہیں اور فنی امتیازات انہیں کئی ترقی پسند شعرا سے ممیز کرتے ہیں۔

ڈاکٹر امام اعظم نے اپنے مقالے ''ترقی پسند غزل اور سردار جعفری'' میں ترقی پسند غزل کی خصوصیات اور سردار جعفری کی غزلوں میں روایتی رنگ کے ساتھ ساتھ بغاوت و انقلاب کی گھن گرج کو پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی غزل میں شور شرابے بھی ہیں، رات کا سکوت بھی، زندگی کی بلند آہنگی بھی ہے، فکری ترقی پسندی بھی ہے اور نئی روایت کی پاسداری بھی جو ترقی پسند شاعروں کی بھیڑ میں انھیں منفرد اور معتبر بناتی ہے۔ ترقی پسند شاعروں نے غزل کو ایک مخصوص نظریہ زندگی کا ترجمان بنانے کی کوشش کی جس نے غزل کی تہہ داری ایمائیت، غنائیت اور جمال کو ٹھیس پہنچایا، گویا زندگی اس دور کی غزل میں ایک لمحاتی اضطراری کیفیت بن کر رہ گئی اور غزل کو نقصان پہنچایا لیکن حصولِ آزادی کے بعد بدلا ہوا منظر نامہ غزل کے حق میں ہو گیا۔

علی سردار جعفری کی غزلیہ شاعری کا احاطہ ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی نے اپنے مقالے ''علی سردار جعفری کی غزلیں'' میں کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سردار جعفری نے شاعری کی ابتدا غزل ہی سے کی تھی۔ ویسے تو سردار جعفری نظم گو شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں لیکن انھوں نے غزلیں بھی لکھیں کیونکہ ان کو غزلیہ شاعری سے فطری مناسبت تھی۔ مضمون نگار کا دعویٰ ہے کہ سردار جعفری بھی اپنے معاصرین میں بہت سارے شعراء کی طرح تحریک کے مقاصد کو پس پشت ڈال کر ایسی شاعری کر سکتے تھے جو انھیں اپنے عہد کے ممتاز غزل گو شعراء کی صف میں کھڑا کر دیتی مگر انھوں نے اپنے جمالیاتی احساسات کو نظر انداز کر کے اپنے قلم کو اور خود کو عوامی مسائل کے حل کے لیے وقف کر دیا۔

پروفیسر مقبول فاروقی نے اپنے مقالے ''سردار جعفری کی سیاسی نظمیں'' کی ابتدا میں سیاسی نظام اور اہلِ اقتدار کی کارکردگیوں سے عوام الناس کی بیزاری کے اسباب پر بحث کی ہے۔ سردار جعفری چونکہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اور کمیونسٹ نظام کو سب سے بہتر نظام حکومت تصور کرتے تھے اسی لیے اس نظامِ حکومت کے تحت اقتصادی مساوات، رواداری، انصاف اور امن و سلامتی کی تشہیر کرتے نظر آتے ہیں۔ سردار جعفری کی شاعری میں سیاسی اور انقلابی رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ جس سے ان کی سیاسی بصیرت اور دور اندیشی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر بی بی رضا خاتون نے اپنے مقالے میں سردار جعفری کی شاعری میں امن و سلامتی کے پیغام کو موضوع بنایا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ انقلابیت، اشتراکیت اور ترقی پسندی کی طرح امن پسندی بھی ان کی شاعری کا

ایک اہم عنصر ہے۔ سردار جعفری کے تصور امن کا دائرہ بہت وسیع ہے وہ دوملکوں کی سرحدوں پر لڑی جانے والی خارجی جنگوں کی مخالفت ہی نہیں کرتے بلکہ کرۂ ارض پر جتنی داخلی جنگیں رنگ ونسل، علاقائیت، مذہب اور زبان وغیرہ کے نام پر لڑی جارہی ہیں ان سب کو ختم کر کے پر امن اور خوشحال زندگی گزارنے کے لیے دنیا کو گوشۂ عافیت بنادینے کے خواہاں ہیں۔

ڈاکٹر اسلم پرویز نے اپنے مقالے ''رجائیت اور امن وآشتی کا شاعر۔علی سردار جعفری'' میں سردار جعفری کی شاعری میں امن وآشتی کے پیغام اور رجائیت پسندی کو مثالوں سے واضح کیا ہے۔ان کی نظموں ''نئی دنیا کو سلام''،''امن کا ستارہ''،''سویت یونین اور جنگ باز''،''استالن کتھا'' ''کون دشمن ہے اور صبح فردا'' وغیرہ کے وساطت سے ان کے نظریہ امن وآشتی کی تشریح کی ہے۔

محمد مصاحب علی نے اپنے مضمون میں سردار جعفری کی شاعری میں احترام آدمیت کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔انھوں نے آدمی اور انسان کے فرق کو واضح کیا ہے اور کہا کہ آدمی ہی افضل ہے اور انسانیت کے بجائے آدمیت کی اصطلاح کا استعمال زیادہ موزوں ومناسب ہے۔سردار جعفری کی شاعری احترام آدمیت، انسان دوستی، انصاف، مساوات اور امن وسلامتی سے عبارت ہے۔

''علی سردار جعفری کے شخصی مرثیے'' کے عنوان سے محمد ارشاد علی نے سردار جعفری کے لکھے گئے شخصی مرثیوں پر تبصرہ کیا ہے۔ خصوصاً سردار جعفری کے وہ تین شخصی مرثیے جن میں دو بے حد اہم اور نابغہ روزگار شعراء غالب واقبال اور انقلابی شخصیت لینن سے متعلق ہیں۔

محترمہ سمیہ تمکین نے اپنے مضمون میں علی سردار جعفری کی شاعری میں پیکر تراشی کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔انھوں نے علی سردار جعفری کی شاعری میں پیکروں کے نظام والتزام اور پیکروں کے ذریعے پیدا ہونے والے حسن وتاثیر پر گفتگو کی ہے۔

ڈاکٹر جاں نثار معین نے اپنے مقالے'' علی سردار جعفری کی تخلیقات کا مطالعہ نسائی نقطہ نظر سے'' میں سردار جعفری کی شاعری میں عورت کے تشخص اور وجود کے حوالے سے بحث کی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ سردار جعفری کی شاعری میں عورت مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔انھوں نے عورت کے امیج کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے جن میں محبت، وفا، ممتا، ایثار وقربانی کا جذبہ، جذبہ حب الوطنی اور دلیری وجانبازی جیسے

اوصاف کی حامل مریم کا کردار صرف جاوید کی بیوی یا ہندوستان کی عورت نہیں بلکہ دنیا کی تمام بہادر عورتوں کی علامت ہے۔

ڈاکٹر محمد عبدالرؤف نے اپنے طویل مضمون ''علی سردار جعفری بحثیت شاعر' نقاد و صحافی'' میں سردار جعفری کے شعری سفر کی روداد تفصیل سے بیان کی ہے اور مختصراً ان کی تنقیدی اور صحافتی خدمات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ یہ مضمون نہایت معلوماتی ہے اور سردار جعفری کے کارناموں کے ایک اہم حصے کے تعارف پر مبنی ہے۔

سردار جعفری کی بنیادی شناخت ایک شاعر کی ہے لیکن ان کی نثری خدمات بھی نہایت وقیع ہیں۔ ''سردار جعفری کی نثری خدمات'' کے عنوان سے جناب حامد اکمل کا مضمون اس بات کا ثبوت ہے کہ کس طرح جعفری صاحب بحثیت شاعر غالب رہتے ہیں اور ان کی نثری خدمات کا اعتراف ابھی پوری طرح نہیں ہو پایا ہے۔

پروفیسر علی احمد فاطمی کا طویل اور نہایت مبسوط تنقیدی مقالہ شامل کتاب ہے جس کا عنوان ہے ''سردار جعفری کا تاریخی' تہذیبی اور تنقیدی شعور' ترقی پسند ادب اور پیغمبرانِ سخن' کے حوالے سے''۔ پروفیسر فاطمی ترقی پسند تحریک سے عملی طور پر وابستہ ہیں اور اپنی تنقیدی نگارشات میں اس تحریک کے اصول و نظریات پر بحث کرتے رہے ہیں۔ سردار جعفری کی تخلیقات کے مرتب ہیں اور تحریک سے وابستگی کی بنا پر سردار جعفری سے فکری ہم رشتگی بھی ظاہر ہے۔ انہوں نے 'ترقی پسند ادب' کو سردار جعفری کا سب سے اہم نثری کارنامہ تسلیم کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس تصنیف میں جذبہ' شعور' تصور و تخیل' فنکار کے فن اور جمالیاتی شعور پر پہلی بار کھل کر گفتگو ہوئی ہے۔ سردار جعفری کی تنقیدی فکر یہ ہے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک سرسید' حالی' شبلی' اکبر' اقبال وغیرہ کی جمہوری روایات کا تسلسل بھی ہے اور ایک ایسی نئی تحریک بھی جس سے ہمارا ادب پہلے کبھی واقف نہیں تھا۔ 'ترقی پسند ادب' اور 'پیغمبرانِ سخن' کے تنقیدی موازنے سے فاطمی صاحب اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سردار جعفری کا تنقیدی ذہن عالم انسانیت پر گہری نظر' تہذیبی یک جہتی کا ہمہ گیر مطالعہ اور دنیا کے انسانوں کی عظمت کی اصل شناخت کا زبردست مظہر بنتا ہے۔ وہ ان کو عام شاعروں اور نقادوں کی صف سے بلند کر کے ایک عظیم مفکر و دانشور کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے اور وہ اردو کے ترقی پسند نقادوں کی صف سے اٹھ کر اپنی تاریخی بصیرت' تہذیبی شعور اور بے مثال انسان دوستی کی وجہ سے اردو کی ترقی پسند فکر و دانشوری کی عظیم روایت کا ناگزیر حصہ بن جاتے ہیں۔

پروفیسر انور معظم کا مضمون ''علی سردار جعفری کی اقبال شناسی'' اقبال کے حوالے سے سردار جعفری کے تنقیدی رویوں کا احاطہ کرتا ہے۔ مضمون نگار نے سردار جعفری کی اہم تصنیف اقبال شناسی کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اقبال شناسی غالباً اشتراکی زاویہ نظر سے فکر اقبال کا پہلا مطالعہ ہے۔ یہ بات دیگر ہے کہ یہ اقبال کی کائنات کا جزوی احاطہ کرتا ہے۔

پروفیسر نسیم الدین فریس نے اپنے مقالے میں سردار جعفری کے مکاتیب کے حوالے سے ان کے خیالات اور محسوسات تک رسائی حاصل کی ہے۔ مقالے میں زیر بحث مکاتیب اردو زبان و ادب کی اہم شخصیات کو لکھے گئے ہیں۔ ان میں راج بہادر گوڑ، گیان چند جین، مظہر امام، سید عقیل رضوی، خلیق انجم، علی احمد فاطمی جیسی اہم شخصیات ہیں۔ فاضل مقالہ نگار نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سردار جعفری کے مکتوبات مختلف موضوعات پر ان کے افکار اور مختلف مسائل میں ان کے موقف کے آئینہ دار ہیں اور ان میں جعفری صاحب کا برسوں کا تجربہ اور مشاہدہ شامل ہے جس کے مطالعے سے بصیرت و آگہی کے نئے دریچے روشن ہوتے ہیں۔

پروفیسر وہاب قیصر کا مضمون بعنوان ''علی سردار جعفری کا سرمایۂ سخن'' مختصر مگر اہم مضمون ہے۔ سرمایۂ سخن سردار جعفری کی مرتب کردہ اردو اشعار کی ایک مختصر لغت ہے جو بقول مضمون نگار لغت نویسی کی روایت سے ہٹ کر مختلف انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس مضمون میں اردو کی دستیاب فرہنگوں اور لغات کے تناظر میں سردار جعفری کے سرمایۂ سخن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ سردار جعفری نے اس تصنیف میں الفاظ اور شعری آہنگ کا حسین امتزاج پیش کیا ہے۔ اس لغت کی خصوصیت یہ ہے کہ الفاظ اور ان کی تراکیب کے تمام شیڈس، معنی اور اشعار کے حوالے دیے گئے ہیں۔ سرمایۂ سخن کا بھرپور جائزہ لے کر مضمون نگار نے یہ دلچسپ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس میں غالب اور اقبال کے کلام سے بہت زیادہ استفادہ کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ سردار جعفری کی یہ تصنیف بھی ان کی غالب و اقبال پسندی کا ایک اور ثبوت فراہم کرتی ہے۔

'پیغمبران سخن اور میرؔ'' کے عنوان سے ڈاکٹر ریشماں پروین کا مقالہ سردار جعفری کی میر شناسی پر روشنی ڈالتا ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق ترقی پسند ناقدین میں سردار جعفری نقد میرؔ کے سلسلے کے اہم نقاد ہیں اور تفہیم میر کے سلسلے میں سردار جعفری کا مضمون ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

جناب شیخ عمران نے سردار جعفری کی افسانہ نگاری کا جائزہ ان کے منتخب افسانوں کی روشنی میں لیا ہے۔ مضمون نگار کا خیال ہے کہ سردار جعفری کے افسانوں میں عورت کی جیسی عکاسی ہے اس کی نظیر دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں ملنی مشکل ہے۔

محترمہ ثمینہ بیگم نے اپنے مضمون میں کہکشاں سیریل کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کہکشاں سیریل جعفری صاحب نے اپنی محنت اور لگن سے تیار کیا تھا جسے سیریل کا ناظر بخوبی محسوس کرسکتا ہے۔ یہ مضمون دراصل سردار جعفری کے سیریل کہکشاں کا نہایت خوبصورت تعارف ہے۔

ڈاکٹر ارشاد احمد کا مضمون ''اردو تحریک اور جعفری کمیٹی'' جعفری کمیٹی کی تشکیل اور اس کی سفارشات کے متعلق معلومات فراہم کرتا ہے۔ سردار جعفری آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو زبان کے فروغ کے لیے چلائی گئی اردو تحریک میں عملی طور پر شریک رہے۔ حکومت ہند نے اردو کے فروغ کے لیے گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کے لیے ماہرین کی مزید ایک کمیٹی تشکیل دی جس کا چیئرمین سردار جعفری کو مقرر کیا۔ یہ کمیٹی جعفری کمیٹی کے نام سے معروف ہے۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے اردو کے مختلف مسائل خصوصاً تعلیم کے حوالے سے گجرال کمیٹی اور جعفری کمیٹی کی سفارشات سے ہی رجوع کیا ہے۔ زیرنظر مقالے میں ان کی تفصیل موجود ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کتاب میں شامل مقالات سردار جعفری کی ہمہ جہت شخصیت اور فکروفن پر مختلف زاویہ ہائے نگاہ کا احاطہ کرتے ہیں۔ اُمید ہے کہ ان کی اشاعت سے سردار جعفری کی شخصیت اور فکروفن کے نئے گوشے روشن ہوں گے اور اردو زبان' ادب وثقافت کے لیے سردار جعفری کی عظیم خدمات کا اعتراف کیا جائے گا۔

سمینار کے انعقاد اور مقالات کو کتابی شکل دینے میں سابق وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں اور موجودہ کارگزار وائس چانسلر پروفیسر خواجہ محمد شاہد کی سرپرستی اور تعاون پر مرکز دونوں کا ممنون ومشکور ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ سردار جعفری سمینار کا انعقاد مرکز برائے اردو زبان، ادب وثقافت کے تحت جب عمل میں آیا تھا اُن دنوں پروفیسر خالد سعید یہاں کے ڈائرکٹر تھے۔ انھیں کی سرکردگی میں سمینار

منعقد ہوا، مقالے جمع کئے گئے اوران کی کمپوزنگ وغیرہ کا کام پورا کیا گیا تھا۔ مرکز کی جانب سے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ سمینار اور کتاب کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے میں ہمارے ساتھی محمد زبیر احمد اور آمنہ انجم نے بھی عملی تعاون کیا ہے میں ان کے بہتر مستقبل کی دعا کرتا ہوں۔ ڈاکٹر ارشاد احمد اور ڈاکٹر بی بی رضا خاتون کتاب کے مرتبین ہیں لہٰذا وہ بھی شکریے کے حقدار ہیں۔

سمینار میں انگریزی مقالات پیش کرنے کی اجازت تھی لہٰذا پروفیسر احتشام احمد خاں، ڈاکٹر محمد فریاد اور عارف معین کا مشترکہ مقالہ، ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی اور ڈاکٹر شاذلی حسن خاں کا مشترکہ مقالہ اور ڈاکٹر کے تیجسونی اور مسز طیبہ نازلی کے انگریزی مقالات سمینار میں شامل تھے۔ مقالے قابلِ قدر ہیں تاہم انھیں بعض تکنیکی وجوہات کی بنا پر شامل کتاب نہیں کیا جارہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ مقالہ نگار حضرات وخواتین اس معاملے کو ہماری مجبوری پر محمول کرتے ہوئے درگزر فرمائیں گے۔

کتاب کے تعلق سے آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

پروفیسر محمد ظفرالدین

ڈائرکٹر، مرکز برائے اُردو زبان، ادب وثقافت

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں: سردار جعفری...... کچھ یادیں

پدم شری جیلانی بانو

ترا خیال بھی کچھ اس طرح سے آیا ہے　　　　　　　کہ جیسے ساز کے تاروں پہ راگنی کا خرام

اور یہ راگنی سردار جعفری کی شاعری میں ہم آج تک سن رہے ہیں وہ ہر سنجیدہ مسئلے کو اسی شاعرانہ انداز میں سناتے رہے ہیں۔ سردار جعفری ان اہم ادیبوں کے ساتھ ہیں جو بدلتے ہوئے وقت، بدلتے ہوئے سماج اور بدلتے ہوئے ادبی مسائل کے ساتھ ساتھ ہمیشہ چلتے رہیں گے۔

سردار جعفری اپنے عہد کی آواز نہیں تھے۔ بلکہ وہ عہد ان کی آواز بن گیا تھا۔

وہ ہندوستان کے ان ادیبوں میں شامل ہیں جو دنیا سے کچھ لینے کی بجائے دنیا کو کچھ دینے کی جدوجہد کرتے رہے ہیں۔

سردار جعفری ادب کی بدلتی ہوئی تاریخ کے ساتھ ترقی پسند ادب کی تحریک میں سیاسی' سماجی اور تہذیبی مسائل کو شامل کرتے رہے ہیں۔

اس طرح وہ ترقی پسند ادب کی تحریک کے معمار بن گئے تھے۔

انہوں نے اس ادبی تحریک کو مستحکم کرنے' اسے آگے بڑھانے کے لئے ہندوستان کی ہر زبان کے ادیبوں' نوجوانوں کو توجہ دلائی تھی۔ اس کے لیے عملی طور پر بھی کام کیا تھا۔

کچھ گوشوں سے جب اس ادبی تحریک کی مخالفت بھی ہوئی تو سردار جعفری ہی اس ادبی تحریک کی مخالفت کا جواب دیتے رہے تھے۔

عصمت چغتائی کہتی تھیں کہ جب کوئی ادب کی ترقی پسند تحریک کی مخالفت کرتا ہے تو ہم سردار سے کہتے ہیں۔

''سردار۔ اب تو منہ بند کردے ان نقادوں کا۔''

اور سردار جعفری اپنے علم' اپنی خوش مزاجی' اپنی جادو بیانی کے ساتھ ترقی پسند ادب پر ہونے والی ہر تنقید کا جواب دیتے رہے ہیں۔ ان کے یہ جواب آج بھی ان کی شاعری میں سنائی دیتے ہیں آپ چاہیں تو ادبی اور

سیاسی مسلک سے اختلاف کر سکتے ہیں ترقی پسند تحریک کے سردار جعفری سے۔ لیکن انسانیت کا احترام اپنے اقدار کی پاس داری، علم و ادب سے سچی وابستگی کے لیے وہ عملی طور پر بھی آگے بڑھے۔

اس کے لیے سردار جعفری اور ان کے ساتھی ادیبوں کو جیل کی سزائیں ہوئیں...... وہ روپوش ہو گئے...... گورنمنٹ کی پابندیوں سے معاشی پریشانیاں بھی ہوئیں۔

اپنی ابتدائی زندگی میں وہ لکھنو یونیورسٹی میں کام کر رہے تھے۔ اور اپنے عملی کاموں کے ساتھ ساتھ اپنی شاعری میں سیاست، سماج اور تہذیب کے نام پر پھیلائی ہوئی دہشت پر احتجاج کر رہے تھے۔ ان کے احتجاج کو ایک جرم بتا کر جیل میں نظر بند کر دیا۔ مگر سردار جعفری اپنی شاعری میں ہر ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتے رہے۔ وہ شاعر تھے مگر ان کی نگاہ ساری دنیا کے بدلتے ہوئے حالات پر تھی۔ وہ اردو، فارسی، انگلش اور ہندی ادب کے مسائل سے بھی واقف تھے۔

یہ بہت پرانی بات ہے ہم نے لکھنا شروع کیا تھا نہ مردوں کے سامنے آتے تھے۔ حیدرآباد کے اور ہندوستان کے سب ہی ادیب شاعر ہمارے گھر آتے تھے۔ وہ سب ہمارے ابا کے دوست تھے۔ مجھے اپنے گھر کی ایک ادبی محفل یاد آ رہی ہے۔ شاید حیدرآباد میں ترقی پسند ادیبوں کی کوئی کانفرنس ہوئی تھی تو ہمارے ابا نے ان کی دعوت کی تھی۔ اس دعوت میں کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، شکیل بدایونی، مخدوم، سلیمان ادیب اور سردار جعفری بھی آئے تھے۔ ان شاعروں کی آواز لاوڈ اسپیکر کے بغیر سارے محلے میں گونج رہی تھی۔ سردار جعفری ہمارے ابا کے ساتھ حافظ شیرازی کے کسی فارسی شعر پر زوردار بحث کر رہے تھے ہم سب کے اصرار پر انھوں نے زوردار آواز میں اپنی غزل سنائی تھی۔

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا　　راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا

ہم نے سردار جعفری کو پہلی بار اسی زمانے میں دیکھا تھا۔

ہمارے ابا کے پاس ہندوستان اور پاکستان کے سب ہی ادیب شاعر آتے تھے۔ رسالے بھی آتے تھے۔ ان رسالوں کو پڑھنے کے بعد ہمیں بھی لکھنے کا شوق ہوا۔ میں ہندوستان اور پاکستان کے رسالوں میں کچھ لکھنے لگی۔ سردار جعفری کا ایک رسالہ ''گفتگو'' بھی آتا تھا۔ اس رسالے میں مشہور ترقی پسند ادیب لکھتے تھے۔

میں نے بھی ایک افسانہ ''گفتگو'' کو بھیج دیا۔ جعفری صاحب کو افسانہ پسند آیا ''گفتگو'' میں شامل کر لیا۔ شادی کے کئی برس بعد ہم دونوں بمبئی گئے تھے۔ عصمت آپا ہمیں بہت چاہتی تھیں۔ انھوں نے کہہ دیا تھا کہ بمبئی

آ ؤ تو ہمارے گھر میں رہنا۔ انور بھی سب ادیبوں شاعروں سے ملتے رہتے تھے۔ انور کو جعفری صاحب سے ملنا تھا۔ ان کے گھر گئے تھے ہم دونوں نے اس دن پہلی بار جعفری صاحب کو دیکھا تھا۔

سلطانہ بھابی اور جعفری صاحب ہمیں دیکھ کر خوش ہو گئے۔ انور سے حیدر آباد کے ادیبوں اور وہاں کی ادبی فضا پر باتیں کرتے رہے۔ پھر ''گفتگو'' والا میرا افسانہ یاد کر کے کہا

''بانو...... تم نے اس افسانے میں لکھا ہے کہ ایک فن کار حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی اور کو اپنا فن حوالے کر دیتا ہے بیچ دیتا ہے اپنا فن''

میں نے کہا۔ ''ہاں یہ تو ہو رہا ہے اب''

جعفری صاحب نے مجھے سمجھایا۔

''مگر تمہیں یہ بات نہیں ماننا چاہیے۔ تم تو یہ لکھو کہ ایک ادیب فن کار ہمیشہ حق اور سچائی کی راہ دکھاتے ہیں۔ وہ کوئی مخالفت اور مجبوری نہیں مانتے''

وہ سب ہی نئے لکھنے والوں کی تحریریں پڑھتے تھے اور انھیں مشورے بھی دیتے تھے۔

پھر جعفری صاحب نے ٹی۔ وی کے لیے مشہور شاعروں پر ایک سیریئل بنایا تھا ''کہکشاں''۔ اس سیریئل کی سب کہانیاں انھوں نے خود لکھی تھیں۔ ''مخدوم'' کا Episode مجھ سے لکھوایا۔ ''کہکشاں'' کے ڈائرکٹر جلال آغا سے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھ سے بات کر لیں۔

آج ہم جعفری صاحب کو کیسے یاد کریں؟ ہم تو انھیں بھول ہی نہیں سکے۔ وہ ہمارے سامنے ہیں۔ وہ جب بھی حیدر آباد آتے تھے۔ ہمارے گھر ضرور آتے تھے۔

دہلی میں کتھا ویمنس آرگنائزیشن کا ایک سمینار تھا۔ سب زبانوں کے ادیب اس میں شریک تھے۔ سمینار ختم ہوا۔ سب جانے لگے تو جعفری صاحب مجھے دیکھ کر رک گئے۔

''اکیلی آئی ہو...... انور نہیں آئے۔؟

میں نے کہا۔ ''انور کو یونیورسٹی میں کچھ کام تھا۔'' تو پھر جعفری صاحب نے کہا کہ ہوٹل ٹھیک ہے؟ میرا فون نمبر لو۔ کوئی کام ہو تو مجھے فون کر لینا۔''

اب میں جعفری صاحب کے بارے میں اور کیا کیا یاد کروں؟

جعفری صاحب ان ادیبوں میں شامل نہیں تھے جو صرف ادب اور شاعری کی دنیا میں کھوئے رہتے

ہیں۔ان کی نگاہ ساری دنیا کے بدلتے ہوئے حالات پر رہتی تھی۔

وہ اردو کے ساتھ ہندی، انگلش اور فارسی کے بھی ادبی رجحانات پر نظر رکھتے تھے۔

ہندوستان اور پاکستان کے بیچ سیاسی لیڈروں کی پھیلائی ہوئی دہشت کے خلاف انھوں نے پاکستان کے عوام کے لیے اس نظم میں پیار اور اعتبار کا ہاتھ بڑھایا تھا۔

ہاتھ میں ہاتھ لیے، سارا جہاں ساتھ لیے
تحفۂ درد لیے، پیار کی سوغات لیے

ریگ زاروں سے، عداوت سے گذر جائیں گے
خوں کے دریاؤں سے ہم پار اتر جائیں گے

اپنی ایک لمبی بیماری کے بعد جعفری صاحب حیدرآباد آئے تھے۔اپنے بیٹے ناظم کے گھر سے فون کر کے ہم دونوں کو بلایا۔انو رٹی۔وی کے لیے ان کا ایک انٹرویو لینا چاہتے تھے۔مگر طبیعت ٹھیک نہیں تھی ان کی۔ کچھ دنوں بعد انٹرویو دینے کا عدہ کیا تھا۔

لیکن ہم نے اس دن آخری بار جعفری صاحب کو خدا حافظ نہیں کہا تھا

کچھ اور بھی لوگ آگئے جوان سے پوچھ رہے تھے۔

''اب پھر آپ کب آئیں گے؟''

جعفری صاحب اپنے ان سب چاہنے والوں سے آج بھی کہہ رہے ہیں:

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
اور کونپلیں اپنی انگلی سے
میں پتی پتی، کلی کلی میں

بچوں کے دہن سے بولوں گا
جب بیج گریں گے دھرتی پر
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
اپنی آنکھیں کھولوں گا

پدم شری جیلانی بانو اردو ادب کی مشہور و معروف ناول و افسانہ نگار ہیں۔انھوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز ''موم کی مریم'' سے کیا۔ان کے دو ناول ''ایوان غزل'' اور ''بارش سنگ'' اور دو ناولٹ ''جگنو اور ستارے'' اور ''نغمے کا سفر'' ہیں۔افسانوی مجموعوں میں روشنی کے مینار' نروان' پرایا گھر' روز کا قصہ' یہ کون ہنسا' تریاق' بیچ کے سوا' بات پھولوں کی اور راستہ بند ہے' اہمیت کے حامل ہیں۔انھیں حکومت ہند نے پدم شری کے اعزاز سے نوازا اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ڈی لٹ کی ڈگری عطا کی۔انھیں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔آپ کو کئی دیگر انعامات و اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔ان کی کہانی نرسیا کی باولی پر ایک فلم Well Done Abba بنائی گئی ہے۔محترمہ جیلانی بانو ''اسمیتا'' جیسی سماجی و فلاحی ادارے کی صدر کی حیثیت سے سماجی و فلاحی خدمات انجام دے رہی ہیں۔

علی سردار جعفری کی شخصیت کے چند پہلو

ڈاکٹر میر محبوب حسین

علی سردار جعفری کی قابلیت بچپن ہی سے ظاہر ہونے لگی تھی۔ وہ ایک ذہین اور قابل طالب علم تھے۔ بچپن ہی سے وہ اشعار پڑھا کرتے۔ چھ سات سال کی عمر میں انہیں پانچ چھ سو اشعار یاد تھے۔ اپنی کم عمری میں انہوں نے عقد بیوگان کی تائید میں مدلل بحث کی تھی۔ سردار جعفری کی ازدواجی زندگی بہت خوشگوار تھی۔ ان کی اہلیہ سلطانہ جعفری نے لکھا ہے کہ وہ بہت وسیع خیال کے آدمی تھے۔ سردار کے ساتھ نصف صدی سے زیادہ کی زندگی بڑے اطمینان اور سکون سے گزری۔ دونوں میں کبھی اختلاف نہ ہوا۔ سلطانہ جعفری نہایت باوقار، بردبار اور رکھ رکھاؤ کی حامل تھیں۔ سلطانہ جعفری کی بیٹی دردانہ جعفری پہلے شوہر کی بیٹی ہیں۔ سردار جعفری نے انہیں اپنی سگی بیٹی ہی کی طرح چاہا۔ سردار جعفری اور ان کی اہلیہ سلطانہ جعفری زندگی کے ہر قدم پر ایک دوسرے کے مددگار رہے، ایک دوسرے کی پسند اور جذبات کا خیال کیا۔ ان دونوں میں کبھی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔ گھر کا ماحول پر سکون رہتا۔ سردار جعفری بے حد حسن پرست تھے لیکن اپنی بیوی سے زیادہ کسی کو نہیں چاہا۔ معاشی اور گھریلو ذمہ داریوں کو نبھاتے ہوئے سردار جعفری کی جیل کی زندگی میں وہ ان سے ملنے آیا کرتی تھیں۔ سردار جعفری کو بچوں سے پیار تھا۔ قیمتی چیزیں خراب کرنے پر بھی بچوں کو کبھی نہیں مارا۔ ان کی تعلیم و تربیت کا پورا خیال رکھا۔ دونوں بچے علی ناظم اور علی حکمت باپ کا بے حد ادب کرتے۔ ایک بیٹے نے اپنی عمر کے چار پانچ سال میں کسی بات پر خفا ہو کر باورچی کے منہ پر تھپڑ مار دیا سردار جعفری نے اس سے کہا یہ بہت بُری بات ہے۔ باپ کے کہنے پر اس لڑکے نے باورچی سے معافی مانگ لی۔ اس واقعہ کے بعد کسی بچے نے نوکروں سے بدتمیزی نہیں کی۔ سردار جعفری اپنی دلچسپ باتوں سے بچوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ان کا پوتا ان کا سب سے گہرا دوست ہے۔ پوتے پوتیوں کو تفریح کراتے ان کے ساتھ کھیلتے۔ شور شرابے سے جز بز نہیں ہوتے۔ اپنا کام کرتے رہتے۔ دن میں تھوڑا وقت بچوں کے ساتھ ضرور کھیلتے۔ سردار جعفری اپنے بھتیجوں کو بہت چاہتے۔ بہت خوشی سے دونوں بھتیجوں

کی شادیاں کیں۔ علی ناظم کی شادی حیدرآباد میں کی۔ شادی میں گھوڑے جوڑے کا کوئی سامان نہیں لیا۔ بہو سے بیٹیوں جیسا سلوک کرتے۔ والدین کی وفات کے بعد سردار جعفری نے اپنی بہنوں رباب اور ستارہ کو اپنے ہی پاس رکھا۔ یہ بہنیں نا کتخدا تھیں۔ عصمت چغتائی نے رباب جعفری سے کہا کہ سردار جعفری ایک بے بہا ہیرا ہے۔ ان دونوں بہنوں نے جعفری صاحب کی حیات ہی میں دنیا کو خیر باد کہا۔ رباب جعفری کی رحلت پر سردار جعفری نے جو اشعار سنائے وہ ان کے دل سے نکلی ہوئی آہیں تھیں۔ یہ دو بہنیں سردار جعفری ہی سے نہیں بلکہ ان کی اہلیہ سلطانہ جعفری پر بھی جان چھڑکتی تھیں۔ سردار جعفری گھر میں بڑوں سے لے کر بچوں تک کے دوست تھے، سب کے خیر خواہ، سب کے آرام کو اپنے آرام پر ترجیح دیتے۔ سب کے دکھ درد کے ساتھی رہے۔ سردار جعفری کا گھرانہ بڑا ایمان دار، مذہب کا پابند اور پرہیز گار تھا۔ ان کے خاندان میں اطمینان، سکون اور خوشی کا ماحول تھا۔ بھائی چارے، انسانی دردمندی کی تعلیمات تھیں۔ سردار جعفری اپنے گھر میں کام کرنے والے آدمیوں سے بہت شائستہ برتاؤ کرتے۔ گھر والوں کو تاکید کرتے کہ یہ محنت کش لوگ ہیں، ان سے اخلاق سے پیش آنا چاہئے۔ انہوں نے T.V. پکچر کی شوٹنگ میں کام کرنے والوں کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور وہ لوگ ان کی عزت افزائی سے متاثر ہوئے سردار جعفری محنت کاروں، کسانوں سے محبت کرنے والے آدمی تھے۔

سردار جعفری میں سادگی تھی، وہ منکسر المزاج، نرم خو، سادہ دل انسان تھے، عام شخص کی طرح لوگوں میں گھل مل جاتے۔ انہوں نے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر اخبار فروخت کیا۔ مئی 1966 میں مشاعرہ ان کی صدارت میں منعقد ہوا تھا اور وہ اسٹیج پر گاؤ تکیہ اور چادریں بچھانے میں خود بھی مدد کر رہے تھے، خود مہمانوں کو رخصت کرنے میں بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ پونے میں اردو اکیڈیمی کے سیمنار ''اردو صحافت'' میں والنٹروں کے ساتھ بڑے شوق سے کھانا اور دالچہ نوش کیا اور کہا کہ انہیں اپنے وطن کی بگھاری دال یاد آگئی جو انہیں بہت پسند تھی۔ سردار جعفری جلسوں کے منتظمین کو لانے اور لے جانے کی زحمت نہ دیتے۔ شعراء کی ایک دعوت میں سردار جعفری شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ عصمت چغتائی نے شرارت سے سردار کے کرتے کی آستین کھینچی۔ پوری آستین اُن کے ہاتھ آگئی۔ سردار جعفری نارمل رہے۔ پھٹا ہوا کرتا پہننے کی وجہ کا جواب دیتے ہوئے سردار جعفری نے کہا کہ میزبانوں نے میری شاعری سننے کے لیے بلایا ہے نہ کہ میرے کپڑے دیکھنے کے لیے۔ سردار جعفری نے کبھی کسی کو کمتر نہ سمجھا، کسی کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھا، نہ کبھی کسی کو چھوٹا سمجھا۔ کوئی انہیں شاعر ماننے سے

انکار بھی کر دیتا تو وہ ناراض نہ ہوتے، اپنی پیشانی پر بل نہ لاتے۔ تاریخ سے اچھی خاصی آگہی کے باوجود کہتے کہ ہندوستان کی تاریخ اور علوم کے بارے میں میری معلومات کتنی کم ہیں۔ نئے سال اور عید پر کارڈ بھیجا کرتے۔ خط کا ہمیشہ جواب دیتے۔ ان میں شرافت، محبت، دلنوازی، اور حسن اخلاق تھا۔ سردار جعفری نے اردو اکادمی کا ڈائرکٹر بننے کے بعد Motor Car لینے سے انکار کر دیا۔ یہ ان کی شرافت کی ایک مثال ہے۔

سردار جعفری نے اپنے ساتھی محمد اسد اللہ کے ساتھ سخت بارش کے دنوں میں بارش میں بھیگتے بس کے انتظار میں کھڑے رہتے۔ چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں میں کھانا کھاتے۔ ایرانی ریستوران میں آدھی پیالی سستی چائے پیا کرتے۔ پیسے نہ ہونے پر کتنی بار پیدل سفر کرتے۔ سردار جعفری نے نوکری نہیں کی۔ مشاعرے، ٹی وی پروگراموں اور بعد میں اکیڈیمیوں کے انعامات نے انہیں سہارا دیا۔ اگر وہ مشاعرے نہ پڑھتے اور سمیناروں میں شرکت نہ کرتے تو سفید پوشی برقرار رکھنا تک مشکل ہو جاتا۔ سردار جعفری اور ان کی اہلیہ سلطانہ نے 52 سالہ طویل مدت میں کیسی کیسی اذیتیں، مصائب اور پریشانیوں کا سامنا کیا۔ سردار جعفری قناعت پسند تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی Dignity کے ساتھ گزاری۔ سر کو اونچا ہی رکھا۔ انہوں نے وقار کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ ایک جگہ سردار جعفری نے لکھا ہے کہ "میرا تو بیشتر وقت فکر معاش میں ہی گزر گیا"۔

زندگی کے آخر وقت تک سردار جعفری کو محنت کرنی پڑی۔ انہیں روز کنواں کھودنا اور پانی نکالنا پڑتا تھا، تب ہی پیاس بجھتی تھی، وہ بھی پوری نہیں۔ پھر وہ تنہا نہیں تھے۔ ان کی دو غیر شادی شدہ بہنیں رباب اور ستارہ بھی ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ سردار جعفری اور ان کے گھر والے مالی مشکلات سے گزرے، چٹانوں سے ٹکرائے۔ سردار جیلوں میں رہے۔ آدرش کی خاطر جان پر دکھ سہنا بڑی بات ہے۔

سلطانہ جعفری نوکری کرتی تھیں، کمیون چلاتی تھیں۔ سردار جعفری کو کمیونسٹ پارٹی سے چالیس روپیہ ملا کرتے تھے۔ تیس روپیہ کھانے کے کٹ جایا کرتے تھے۔ سلطانہ جعفری نے سوشیل ایجوکیشن آفس میں کام کرنا شروع کیا۔ انھیں دو سو روپیہ تنخواہ ملا کرتی تھی اور انہیں ممبئی کے اسکولوں کے معائنے کے لیے بہت سی عمارتوں میں سیڑھیاں چڑھنی ہوتی تھیں جس کی وجہ ریڑھ کی ہڈی کا درد ستانے لگا۔ سردار جعفری اردو کے اتنے بڑے آدمی ہونے کے باوجود چھوٹے سے فلیٹ میں رہے۔ بدبودار، گندے اور ایک چارپائی کی گنجائش کے مختصر سے کمرے میں سالہا سال مقیم رہے۔ سردار جعفری نے ممبئی کی رہائش گاہ کی دشواریوں کا ذکر کیا۔ مکان کی پگڑی

پیش کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ کئی مہینے دوڑ دھوپ کے بعد بمشکل ایک کمرے کا مکان مل گیا۔ ان کے کمرے کے نیچے کا کمرہ مردہ خانہ تھا جہاں سے اسپتال میں مرنے والوں کی لاشیں ان کے عزیز واقارب کو دی جاتی تھیں۔ سردار جعفری سیتا محل میں 1962 سے رہتے تھے۔ اس سے پیشتر کھیت واڑی عرب بلڈنگ میں رہے۔ 1967 میں سردار جعفری نے باون ہزار روپیہ میں ایک فلیٹ خریدا۔ یہ فلیٹ بھی پوری طرح ان کا خریدا ہوا نہیں تھا۔ سلطانہ جعفری کی بہنوں نے سلطانہ کی دربدری دیکھ کر کچھ رقم دی۔ کچھ روپیہ سلطانہ کے پروویڈنٹ فنڈ سے اور تھوڑی سی رقم سردار جعفری کی کتابوں کی رائلٹی سے حاصل ہوئی تھی یہی فلیٹ ان کا کل سرمایہ ہے۔ سردار جعفری کی عمر جب ستر سال تھی اس وقت شوکت کیفی نے لکھا ہے کہ وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے ہیں جس میں صرف دو بیڈروم ہیں۔ ایک چھوٹا سا ہال ہے جس میں آٹھ لوگ رہتے ہیں۔ دو بہنیں، دو بیٹے، بڑے بیٹے کی بیوی، ایک تین سال کا پوتا اور ایک نوکر۔ سردار جعفری کے لکھنے کے کمرے میں لوگ رہتے ہیں۔ لوگ ملنے آتے ہیں اور وہیں بیٹھتے ہیں کیوں کہ کوئی ڈرائنگ روم نہیں ہے اور اسی کمرے میں یہ تخلیقی کام بھی کرتے ہیں۔ اتنے بڑے کنبے کو پالنے کے لیے سلطانہ جعفری اپنی کمر کی تکلیف کے باوجود نوکری کرتی ہیں۔ یہ لوگ اتنے حساس ہیں کہ کیفی اعظمی یا شوکت کیفی سے کبھی اپنی تکلیف کا اظہار تک نہیں کیا۔ مدد مانگنا تو دور کی بات ہے۔

علی سردار جعفری کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ علمی وادبی روایت پر اپنے ہمعصروں سے زیادہ عبور رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت میں خوشگوار اعتدال اور توازن ملتا ہے۔ وہ ایک عظیم دانشور تھے جن کے پاس فکر، علم اور عمل کا امتزاج نظر آتا ہے۔ سردار جعفری میں لیڈر شپ کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ وہ حالات سے باخبر تھے۔ وہ مخالفین، معترضین اور دشمنوں کے الزامات اور زہر افشانی پر یا تو جواب نہیں دیا کرتے یا ہنس کر ٹال دیتے۔ جھلاہٹ سے نہیں بلکہ پُرسکون انداز میں اپنے دلائل پیش کرتے۔ مخالفین، معترضین اور دشمنوں سے اختلاف میں دل شکنی، طنز یا نیچا دکھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ علی سردار جعفری اپنے دوست اور دشمن سبھی کے ساتھ محبت، شفقت رکھتے اور حتی المقدور مدد بھی کرتے۔ دوستوں کے گلے شکوے، لعن طعن، گھریلو قسم کی مشکلات سبھی موقعوں پر وہ مسکراتے۔ مسکراہٹ ان کی شخصیت کا حصہ بن چکی تھی۔

سردار جعفری نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جیل میں بند رہے۔ شاعری کے ذریعے وطن کی آزادی کے لیے خود بھی لڑے اور دوسروں کو بھی للکارا۔ اپنی نظموں کو آزادی کے لیے اسلحہ کے طور پر استعمال کیا۔ وہ مجاہد آزادی تھے۔ انہوں نے انقلابی اور باغیانہ نظمیں لکھیں، تقریریں کیں اور ہڑتالیں کیں۔

سردار جعفری انسانیت سے پیار کرتے ہیں۔ ان کی انسان دوستی بلا لحاظ مذہب، مسلک، ملک، وطن، زبان، رنگ و نسل تھی، وہ تمام انسانوں کو ایک اکائی اور ساری دنیا کو ایک شہر سمجھتے تھے۔ ان کے دل میں انسانیت کا درد تھا۔ وہ ہمدرد انسان تھے۔ ظلم، ستم، استحصال، ناانصافی کو ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ ان کی آنکھیں ہر ایک کے غم میں اشکبار تھیں۔ غریبوں، دکھیوں اور غمزدوں کے لیے رحم کے جذبات سے چھلک جاتی ہیں۔ مشرق و مغرب کے درمیان جو دیواریں حائل ہیں، ان کو منہدم کر دینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تخلیقات میں انسان دوستی کے فروغ کی مساعی کی۔ دانشوروں، Elite اور عوام سے دردمندانہ اپیل بھی کی کہ پنپنے والی فسطائیت کے خلاف کمر بستہ رہیں۔ انسانوں کے درمیان بڑھتی ہوئی دوری کو روکتے رہیں۔ انسانیت نواز فضا تیار کریں۔ انہوں نے نئی نسل سے کہا کہ انسانیت کی شمع فروزاں بجھنے نہ پائے۔ سردار جعفری کے دل میں انسان سے محبت رہی۔ کسی کو یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ کس کے دوست زیادہ ہیں اور کس کے کم ہیں۔ دوسرے ممالک میں جاتے تو دور دور سے لوگ ملنے آتے۔ سردار جعفری ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے دلدادہ تھے۔

سردار جعفری انسانیت کی عظمت کے قائل ہیں۔ انسان کے ہاتھوں کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں کیوں کہ وہ خام پتھر سے آئینہ بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ سردار جعفری انسان کے ہمدرد ہیں۔ انہوں نے ہر زمانے میں ظلم و ستم، استبداد و استحصال، ناانصافی و نابرابری، عصبیت و تنگ نظری، غلامی و محکومی کی مذمت کی۔ وہ آزادی و حریت، امن و شانتی، محبت و مساوات کے علمبردار رہے۔ انہوں نے غریبوں اور دکھ درد کے مارے ہوئے لوگوں کی ہمیشہ وکالت و حمایت کی۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی انسان کا خون بہے وہ اس پر تڑپ اٹھے۔ محبت، ہمدردی اور کسی کے بُرے وقت میں کام آنے کا جذبہ ان میں خوب تھا۔ اپنی نرم دلی کے باعث کسی کو تکلیف میں مبتلا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ممبئی سے باہر کے بیمار غریب لوگ علاج کے لیے ممبئی آیا کرتے۔ سردار جعفری کو ان کی حالت معلوم ہوتی تو وہ خود روپیہ دیتے، اپنے عزیزوں اور دوستوں اور مدد کرنے والے اداروں سے دلواتے۔ وہ ان ضرورت مندوں سے اپنے عزیز اور دوست کی طرح ملتے۔ یہ مدد ایسی ہوتی کہ دوسرے کو پتہ بھی نہیں چلتا

اور ضرورت مند کی خودداری کو ٹھیس بھی نہیں پہنچتی۔ گھر کے سامنے والی بلڈنگ کے سائے میں بارش سے بھیگتے ہوئے غریب بچوں کو کھڑا دیکھتے تو گھر سے چھوٹے چھوٹے کپڑے اور غذا کا انتظام کر دیتے۔ مزدوروں، فقیروں کے بچے ان سے پیسے مانگتے تو وہ انھیں گھر کے نیچے ہوٹل میں کھانا کھلا دیتے تاکہ ان میں مانگنے کی عادت نہ پڑے۔ چند لوگ ان کے گھر کے نیچے سردی سے کانپ رہے تھے ان کا دل دہل گیا۔ اپنا جاکٹ انہیں دے دیا۔ گھر کے سویٹر، جاکٹ دے دیئے۔ وہ لوگ دوسرے غربا کو بُلا لائے۔ سردار جعفری نے گھر والوں کے لیے ایک ایک جاکٹ چھوڑ کر سب غریبوں کو دے دیئے۔ بازار سے کچھ کپڑے منگوا کر بھی تقسیم کر دیئے۔ سردار کے گھر کا ایک ملازم تھا اُس نے شکایت کی کہ آپ کا گھر ہوٹل ہے ہمیں یہاں کام کرنا پسند نہیں۔ سردار نے اس کی تنخواہ دے دی اور کہا کہ میں تمہاری وجہ سے اپنے دوستوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ بعض کام کرنے والوں کو ٹی بی کا مرض نکلا۔ سردار جعفری نے انھیں اسپتال میں داخل کر کے علاج کروایا دواؤں اور کھانے کے اخراجات برداشت کیے جب وہ لوگ صحت مند ہو گئے تو انہیں آفس میں چپراسی کی جگہ دلوا دی۔

سردار جعفری جب اپنے گھر کے لیے پھل لاتے اُس وقت گھر کے نیچے غریب لوگ للچائی نظروں سے دیکھتے۔ سردار جعفری پھل بانٹ دیا کرتے۔ سردار جعفری اپنے لیے کسی کے پیسہ کے کبھی طلب گار نہیں تھے لیکن کسی دوسرے کی ضرورت پر وہ سب دوستوں کے دروازے کھٹکھٹاتے۔ اپنی طرف سے جتنا بن پڑا مدد کرتے۔ ایک نوکر نے سلطانہ جعفری کا منگل سوتر چرا لیا، پولیس اُسے مارنے لگی۔ سردار نے اپنی بیوی سے کہا کہ اُسے چھڑا دیجیے۔ وہ اپنے کسی شناسا کی بھی تکلیف کی خبر سن لیتے تو بے چین ہو جاتے۔ اپنی تہی دستی کے باوجود اپنے وسائل سے کوئی نہ کوئی صورت نکال لیتے اور اس کی مدد کر گزرتے۔ سردار جعفری دوستوں سے بھائیوں جیسا برتاؤ کرتے۔ ان کی خوشی وغم میں دامے، درمے اور سخنے مددگار ہوتے۔ گھر والوں، دوست احباب، افراد خاندان بیمار ہو جاتے تو دواخانہ بھیج کر علاج کرواتے۔ سردار جعفری ایک سچے، کھرے اور ہمدرد انسان تھے۔ پیسہ اُن کے پاس کبھی نہیں رہا۔ اپنی محبت سے انہوں نے جو کچھ بھی کمایا اسے دوستوں، رفیقوں اور ضرورت مندوں پر بشرطِ ضرورت خرچ کرنے میں تامل نہ کیا۔ کیفی اعظمی، کرشن چندر، ساحر اور ممبئی کے متعدد ادیبوں اور شاعروں کی بیماری میں ان کے کام آتے رہے۔ رفیعہ شبنم عابدی کے شوہر حسن اختر عابدی کو دل کے دوروں میں ڈاکٹر گوئل سے علاج کا انتظام کیا۔ کرشن چندر اور مظفر شاہ جہاں پوری کے علاج کے لیے گورنمنٹ سے

روپیہ دلوایا۔ ملکی اور غیر ملکی دوستوں کی محفلیں منعقد کر کے، دعوتیں کرتے، جب بھی زیادہ دوست اور عزیز گھر آجاتے تو سردار انہیں اپنے کمرے میں سلاتے اور خود زمین پر بستر بچھا کر سو جاتے۔ آرام کرتے وقت گھر میں ملنے کے لیے آتا تو جگا کر اٹھا دینے کا کہتے۔ دوستوں کو Receive کرتے ریلوے اسٹیشن جایا کرتے۔ گھر آنے والوں کی بات اطمینان سے سنتے، ان کی ضیافت کا خیال کرتے۔ رفیعہ شبنم عابدی کی بھیجی ہوئی کتابیں پڑھ ڈالیں اور ان کی خوبیوں کی تعریف کی۔ بیماری اور کمزوری میں ان کی کتابوں کی رسم اجراء میں شرکت کی۔ دشمنوں کے لیے کبھی حرف شکایت ہونٹوں پر نہیں لاتے۔ دشمن اپنی ذاتی غرض سے سردار جعفری کے پاس آتے اور وہ ان کی بھی ہر طرح مدد کرتے۔ پڑوسیوں کے کام آتے۔ سیتا محل میں رہنے والے کہتے کہ ہماری بلڈنگ میں سردار جعفری کے روپ میں ایک دیوتا رہتا ہے۔ وہ سب کے ساتھ بھلائی کرتا ہے۔

سردار جعفری نے ہمیشہ پس ماندہ اور دبے کچلے لوگوں کو اپنی تخلیقات سے جگانے کا کام کیا۔ انسانی زندگی کی بہتری کے لیے اپنے قلم کا استعمال کیا۔ سرمایہ داروں، زمینداروں اور انگریزوں کے ہاتھوں مزدوروں، کسانوں اور ہندوستانی عوام پر ہوئے مظالم واستحصال کے خلاف آواز بلند کی جس کے نتیجہ میں انہیں آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ جیل کی زندگی ملنے پر حکومت کے شکر گزار ہوتے تاکہ تھکے ہوئے دل ودماغ کو تھوڑا سا سکون مل جائے۔ اور بہت دنوں سے وہ جو لکھنا چاہتے تھے، وہ لکھ سکیں۔ انہوں نے پتھر کی دیوار، نیند، اودھ کی خاک حسین، تمہاری آنکھیں، شادی کا دن اور جیل کی رات بھی جیل میں لکھیں۔

سردار جعفری بہترین مقرر، بلند پایہ خطیب تھے۔ ادب، تاریخ، تہذیب، سیاست جیسے موضوعات ومسائل پر گھنٹوں تقریر کرتے۔ ان کی آواز مجمع میں ولولہ پیدا کر دیتی تھی۔ ان کی تقریر علم ومعانی کا تیز دھارا ہوتی، حقائق ودلائل سے بھرپور ہوتیں۔ ان کی تقریر سننے والا یہ چاہتا تھا کہ سردار کہیں اور ہم سنتے رہیں۔ تقریر کے دوران سامعین اپنی نشستوں پر جنبش تک کرنا بھول جاتے۔

سردار جعفری کے پاس زبردست قوت برداشت تھی جو صدیوں کے طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اٹل تھی۔ سردار جعفری نے حریفوں اور اپنوں کے پہنچائے ہوئے زخموں، گزند کو ہدیۂ تہنیت، ارمغان محبت، تسکین وطمانیت کا باعث سمجھا۔ وہ پوری تندہی سے اپنے مشن کی طرف جٹے رہتے۔ آواز میں خود اعتمادی

ہوتی۔قوت ارادی کے بہت مضبوط انسان تھے، وہ مستحکم ذہن رکھتے تھے۔وہ دھن کے پکّے تھے وقت کے پابند تھے۔ادبی تقاریب میں پابندئ وقت کے ساتھ شریک ہوتے۔وہ وعدے کے بڑے پکّے تھے۔ان میں مصلحت بینی نہیں تھی اور بہت جلد بے تکلف ہوجاتے تھے۔

سردار جعفری مزاجاً درویشانہ اور طالب علمانہ زندگی گزارتے۔جہاں علمی مشورے کی ضرورت ہوتی اپنے چھوٹوں سے بھی مشورہ کرتے۔انہیں حسین خواب دیکھنے کی ترغیب دیتے۔وہ وسیع القلب، عالی ظرف، وضع دار اور حقیقت شناس انسان تھے۔دوسروں کے فکر وفن کی تعریف کھلے دل سے کرتے تھے۔ہمیشہ چھوٹوں کا دل بڑھاتے۔مشاعروں میں نو جوان شعراء کو اولیت دیتے۔تصاویر میں کسی کے ساتھ ناانصافی دیکھی تو خود آگے بڑھ کر ان کے ساتھ تصویر لے لی۔سردار جعفری اپنے سے چھوٹوں سے نہایت محبت سے ملتے،ان کی گفتگو سنتے، گھر جاتے تو دروازے تک پہنچانے آتے۔جلسوں میں دوسروں کو صدر بنانے کا اصرار کرتے، نئے لوگوں کو آگے کرتے۔بزرگوں سے احترام وعقیدت اور چھوٹوں سے مشفقانہ انداز سے پیش آتے۔1984 میں کینیڈا میں ایوارڈ لیتے ہوئے جذبات سے مغلوب ہوگئے۔آواز بھرّا گئی۔رقت طاری ہوگئی۔وہ تقریر کرتے جاتے اور آنکھوں سے خوشی کے آنسو پوچھتے جاتے۔تقریر میں انہوں نے کہا مجھے زندگی میں بہت سے اعزازات ملے مگر یہ ایوارڈ انہیں ایسی سرزمین پر دیا جارہا ہے جہاں کی زبان انگریزی اور فرانسیسی ہے جہاں اردو کی شمع جلے بیس، بائیس سال ہوئے ہیں۔سردار جعفری خواتین کا احترام کرتے،ان کی ہمت افزائی کرتے اور کوششوں کو سراہتے۔سردار جعفری زندگی بھر ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔لیکن وہ جدیدیت کے شعرا اور ادیبوں کی آزادی کے بھی قائل تھے۔انہوں نے کہا ہر کسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے علم، مذاق، ذوق اور صلاحیت کے مطابق شعری تجربے کرے۔ان میں نہ چڑ چڑا پن تھا نہ کسی کو نیچا دکھانے کی کوشش تھی۔

اسلامی قدریں ان کی سیرت میں رچی بسی ہوئی تھیں۔خواجہ تصور علی حیدر نے لکھا ہے کہ سردار جعفری نے انہیں فجر کی نماز کے لیے اٹھایا۔سردار جعفری انٹرویو لینے والوں سے کہتے کہ سوالات صاف گو ہوں۔جواب میں وہ دوٹوک بات کرتے۔سردار جعفری صاف گو تھے اور صاف گوئی پسند کرتے تھے۔ان کے لہجے میں مٹھاس اور زور بھی تھا مگر زبردستی بالکل نہیں تھی۔وہ نفاست پسند، شگفتہ مزاج، ہنس مکھ، مرنجان مرنج، بذلہ سنج اور سلجھے ہوئے آدمی تھے۔باتیں کرتے وقت مسکراتے رہتے۔باتوں باتوں میں بہت سی پتے کی باتیں کہہ

جاتے۔ بچپن ہی سے غضب کا حافظہ پایا تھا۔ مرثیوں کے بند، لمبی لمبی نظموں کے اشعار، واقعات نوک زبان پر تھیں۔ کتابوں، دانشوروں کے نام یاد تھے۔ جو کچھ ایک دفعہ سن لیتے یا پڑھ لیتے، وہ انہیں یاد ہو جاتا۔ قلم سے رشتہ استوار کرنے والوں سے خوش ہوتے۔ سردار جعفری نے کبھی بے محابا اور مبتذل گفتگو نہ کی۔ انہیں الفاظ کی حرمت کا لحاظ رہتا۔ انہوں نے کبھی کسی کی حق تلفی نہیں کی۔ وہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے معاملات سلجھاتے۔ سردار جعفری خود انصاف پسند، فراخ دل، خوش اخلاق، خوش گفتار اور شائستہ کلام انسان تھے۔ ان کے سامنے کوئی شخص کسی دوسرے کے بارے میں ہتک آمیز باتیں کرتا ہے تو سردار جعفری اس گفتگو کو بالکل برداشت نہیں کرتے۔ اس کو اسی جگہ روک دیتے ہیں اور دوسرے کی صفائی میں بولنے لگتے ہیں۔ سردار جعفری نے کبھی بھید بھاؤ اور علمی وادبی تعصب سے کام نہیں لیا۔ نظریے پر اپنی ذات کو کبھی ترجیح دینے کی کوشش نہ کی، کبھی اپنے نام کا ڈنکا بجوانے کی کوشش نہیں کی۔ سردار جعفری جھوٹ، دھوکا اور منافقت سے دور تھے۔ بے جا تکلفات اور تصنع آمیز اخلاق سے گریز کرتے تھے۔ حسد ان میں نہ تھی۔ ان کی شخصیت کدورت سے پاک تھی۔

سردار جعفری کی شاعری میں انسانیت کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ وہ خلوص ومحبت کا پیکر ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری، نثری خدمات، تقاریر میں اظہار محبت، دوستی و یگانگت، بھائی چارہ، انصاف پسندی، انسان کا احترام، عوام کا درد، ظلم واستبداد سے نفرت، تابناک مستقبل کی بشارت دی ہے۔ وہ اپنی ادبی عظمت کے ساتھ حسن اخلاق اور شفقت ومحبت کے پیکر تھے۔ انہوں نے لوگوں کو اپنے اخلاق سے اپنا گرویدہ بنایا۔

سردار صرف اردو کے دانشور نہ تھے بلکہ تمام زبانوں کے عالمی ادب میں ایک علم دوست اور انسان دوست دانشور تھے۔ بیسویں صدی کے انسانیت کے محرک اور متحرک انسان تھے۔ سردار جعفری پیار ومحبت کے آدمی تھے۔ انسان دوستی ان کا پیغام تھا۔ غلامی کی زنجیروں کو وہ توڑنا چاہتے تھے۔ نفرت کی دیواروں کو گرانا چاہتے تھے۔ دلوں کو جوڑنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ظلم اور جبر کے خلاف جدوجہد کی اور اس کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیا۔ وہ انسانیت کی ابدی اور مثبت قدروں پر ایقان رکھتے تھے۔ معاشرتی استحصال وعدم مساوات جیسے مسائل کی طرف پوری دنیا کی توجہ مرکوز کرتے۔ عالمی امن، انسانی مساوات اور رواداری کی دعوت دیتے، انہوں نے قلم کی حرمت کو مقدم گردانا۔ انہوں نے لہو کی عظمت کو پہچانا۔ سردار امن عالم کا تمنائی

اور شیدائی تھا۔ انہوں نے بے حد مصروف زندگی گزاری انہوں نے کبھی وقت نہیں گنوایا۔ اپنی ذاتی زندگی کی دلچسپیوں سے تقریباً کنارہ کش ہو گئے تھے۔ نگار عظیم لکھتی ہیں:

''سردار جعفری کسی ایک شخصیت، تحریک یا روایت کا نام نہیں بلکہ ایک مکمل داستان کا نام ہے...... تنگ نظری، ظلم، ناانصافی، معاشرتی المیوں اور انسانی استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے والا علی سردار جعفری عاجزی اور انکساری کی ایسی مثال تھے جس کا کوئی ثانی نہیں'' (میں مر کے امر ہو جاؤں گا نیا سفر۔ جولائی تا دسمبر 2000 صفحہ 116)

ڈاکٹر میر محبوب حسین نے شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد میں اسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ بعد ازاں انھیں یو جی سی سے ایمیریٹس فیلوشپ ملی۔ انہوں نے اردو نثر میں غیر صحافتی سیاسی ادب پر تحقیق کی اور یونیورسٹی آف حیدرآباد سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے یو جی سی ریسرچ اسوسی ایٹ شپ بھی حاصل کی اور ایک کتاب ''1857 اور ادب'' لکھی ہے۔

سردار جعفری کی فکری تشکیل

ڈاکٹر آمنہ آفرین

سردار جعفری کی فکری تشکیل میں ان کے بچپن اور خاندان کے ساتھ بلرام پور کا وہ ماحول بھی کارفرما تھا، جس میں انہیں مذہبی ماحول کے ساتھ ساتھ جاگیردارانہ نظام کے مظالم بھی اپنے آنکھوں سے دیکھنے پڑے۔ اسی وقت سے ان کی فکر کی ابتداء ہو چکی تھی۔ اور یہ فکر گاندھی جی کی تلاش حق اور پلوٹارک کی کتاب مشاہیر روما کو پڑھنے کے بعد بھی ذہن میں واضح نہیں ہو پائی تھی پھر کچھ واقعات نے ان کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ نگار کے پرچوں میں نیاز فتح پوری کی تحریروں اور اقبال کی بانگ درا دونوں کے امتزاج سے وہ اپنی فکر کو نئی سمت دینے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کے بعد علی گڑھ میں ان کے قیام اور تعلیم کے دوران جو اساتذہ و ساتھی تھے اس کے علاوہ ملنے جلنے والوں کا وسیع حلقہ اور کچھ کتابوں نے انہیں متاثر کرنے اور ان کی فکر کو جلا دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس وقت تک ان کا دوستانہ حلقہ اتنا بڑھ چکا تھا کہ وہ ہر چھوٹے اور بڑے معاملات کو ساتھ مل کر حل کرتے۔ لکھنو میں اپنی تعلیم کے زمانے سے ان کی شخصیت میں ایک انقلاب آ چکا تھا اور عالمانہ فکر بھی۔ جس کے نتیجے میں انہیں جیل بھی جانا پڑا۔ اس کے بعد وہ ترقی پسند تحریک سے اس طرح جڑے رہے کہ وہ تحریک تو کمزور پڑ چکی تھی، لیکن اس تحریک کو لے کر سردار جعفری کے جذبات اور اس سے متعلق ان کی فکر میں کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آیا۔ جس کا جیتا جاگتا ثبوت ان کی تحریریں ہیں۔

میں اپنے مقالے کی شروعات سردار جعفری کی خودنوشت کے ان جملوں سے کرتی ہوں:

> ''میں نے ہمیشہ قلم کو ہاتھوں کا تقدس، ذہن کی عظمت اور قلب انسانی کی وسعت سمجھا ہے۔ اور قلم کے بتائے ہوئے ہر نقش کو سجدہ کیا ہے۔ اس لیے جب قلم جھوٹ بولتا ہے یا چوری کرتا ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میرے ہاتھ گندے ہو گئے ہیں۔ میں ہر ادیب سے یہ توقع کرتا ہوں کہ وہ اپنے قلم کا احترام کرے گا کیونکہ اس کے نفس کی عزت اور شرافت اسی طرح برقرار رہ سکتی ہے۔''

(''شخصیات اور واقعات'' از جنید احمد، 1991ء۔ ص۔ 221)

سردار جعفری کے والد اور ان کے چچا دونوں اپنے سارے خاندان کے ساتھ بلرام پور میں رہتے تھے۔

جہاں ان کا ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ چچا بڑے عہدے پر فائز تھے اور والد چھوٹے عہدے پر۔ لیکن پورے خاندان کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کا خاندان ایماندار اور مذہب کا پابند تھا۔ اسی لیے انہیں بچپن میں سلطان المدارس لکھنؤ میں داخل کیا گیا تھا لیکن ان کی طبیعت مدرسہ کی تعلیم کو قبول نہ کرسکی اور وہ کئی بار وہاں سے بھاگ آئے۔

سردار جعفری کو گھر میں جس طرح کا ماحول ملا تھا اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ عید، بقرعید، عید غدیر بڑی شان سے مناتے تھے۔ شعبان کے مہینے میں بارہویں امام کا یوم ولادت مناتے تھے اور محرم بڑے جوش وخروش سے مناتے۔ دس دن مسلسل مجلیس ہوتی تھیں اور پڑھنے کے لیے لکھنؤ سے ذاکر آیا کرتے تھے۔ اسی طرح سال کے دوسرے مہینوں میں بھی مجلیس اور محفلیں ہوتی تھیں۔ جس کی بدولت سردار جعفری اس عہد کے تمام بڑے ذاکروں کو سن چکے تھے۔ کلمہ اور تکبیر کے بعد انہوں نے پہلی آواز انیسؔ کے مرثیوں کی سنی تھی۔ جس کے اثر سے انہوں نے 16 برس کی عمر میں خود مرثیے کہنے شروع کیے۔

وہ لکھتے ہیں:

آتا ہے کون شمع امامت لئے ہوئے	اپنی جلو میں فوجِ صداقت لئے ہوئے
اللہ رے حسن فاطمہ کے ماہتاب کا	ذروں میں چھپتا پھرتا ہے نور آفتاب کا

(مذکورہ کتاب، ص۔ 231)

اس مرثیے پر ان کے گھر والوں سے انہیں بہت داد ملی، لیکن تنقید کرنے والوں کی بھی کمی نہیں تھی۔

قرآن انہوں نے بچپن میں ہی بہار کے ایک مولوی صاحب سے پڑھا تھا۔ ان کے والد صاحب کے پاس مذہبی کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ انہوں نے تمام پیغمبروں کو پڑھ لیا تھا اور مرثیہ خوانی کے ساتھ ساتھ حدیث خوانی بھی کرنے لگے۔ ان سب کے اثر سے انہوں نے سیکھا کہ حق اور صداقت کے لیے جان کی بازی لگا دینا انسانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ شہادت حسین کے واقعات اور اقبال کے کلام سے وہ بہت متاثر ہو چکے تھے۔

سردار جعفری کی شخصیت میں بچپن سے فکری عنصر موجود تھا۔ وہ کسی کی سوچ کو اپنا کر آگے بڑھنے کے عادی نہیں تھے بلکہ خود اپنی ایک سوچ وفکر رکھتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر غور کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ یہ اپنے بھائی، بہنوں سے تبادلہ خیال بھی کرتے تھے۔ بقول سردار جعفری رات کو سب بھائی بہن بستروں پر لیٹ

جاتے تھے تو کوئی ایک بہن شرلک ہومز کی کہانیاں، راشد الخیری کے ناول یا عظیم بیگ چغتائی کی کوئی کتاب پڑھ کر سناتی، اس سے تھک جانے کے بعد جناتوں کے قصے شروع ہوتے جو دلچسپ ہونے کے باوجود دل میں دہشت پیدا کرتے۔

سردار جعفری کی فکر کی ابتداء تو بہت پہلے ہو چکی تھی۔ لیکن چند واقعات نے ان کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب برپا کیا۔ وہ خود کہتے ہیں کہ مجھے اس سوال نے کبھی پریشان نہیں کیا کہ یہ دنیا کیوں ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ لیکن اس سوچ نے بے چین کر دیا ہے کہ یہ دنیا ایسی کیوں ہے۔ یہیں سے ان کی فکر نے سنجیدہ صورت اختیار کی۔ انہیں شکار اور گھوڑ سواری کا بے انتہا شوق تھا۔ اور یہ بندوق لیے گاؤں گاؤں جنگل جنگل گھوما کرتے تھے۔ اس طرح اودھ کی دیہاتی زندگی سے پوری طرح واقف ہو چکے تھے۔ اور انہیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ اس زمین پر جتنی پگڈنڈیاں نہیں ہے اتنے خون کے دھارے اس کے جسم میں ہیں۔ ان بھیانک تصویروں نے ان کے فکر کو اور بھی بڑھا دیا۔

آہستہ آہستہ انہیں جاگیرداری نظام سے بھی نفرت ہونے لگی تھی۔ کیونکہ کسانوں پر ان کے مظالم بڑھتے جا رہے تھے اور ان کو روکا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ سردار جعفری کے ذہن میں کئی سوالات نے جگہ پالی تھی۔ وہ سوچتے تھے یہ مخلوق کہاں سے آئی ہے اور ان پر اس طرح کے مظالم کیوں ہو رہے ہیں۔ اس پر کوئی احتجاج کیوں نہیں کیا جاتا وغیرہ۔ اسی دوران انہیں معلوم ہوا کہ اسلام میں زمین کی ملکیت کا کوئی تصور نہیں۔ اس وقت انہیں پہلی بار پتہ چلا کہ سماجی زندگی اور ذاتی زندگی میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔

سردار جعفری اپنے گھر اور گھر والوں سے زیادہ دنیاوی فکر میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اس بات کا اندازہ اس وقت ہوا جب وہ اپنے گھر میں عید غدیر کے دن قصیدہ پڑھنا چھوڑ کر چلے ہوئے گاؤں کی تفصیلات جاننے آئے پنڈت نہرو کی تقریر سننا پسند کیا تھا جو جاگیرداری ظلم و استبداد کے موضوع پر تھی۔

سردار جعفری نے دو اہم کتابوں کا مطالعہ کیا تھا جس نے ان کی زندگی کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ ایک تھی مہاتما گاندھی کی کتاب ”تلاش حق“ اور دوسری پلوٹارک کی کتاب ”مشاہیر یونان و روما“۔ ان کتابوں نے ان کے ذہن میں پیدا ہوئے سوالات کو کم کرنے کے بجائے دل میں اور آگ لگا دی۔ کتابیں، رسائل اور اخبار انہیں حل نہیں کر سکتے تھے۔ کسانوں کے ایک اور واقعے نے ان کے جذبات اور فکر کو بڑھا دیا۔ اس وقت انہوں

نے ایک نظم کہی۔ بقول سردار جعفری ''خدا نہ تو غرناطہ و بغداد کے ایوانوں میں ہے نہ امیروں کے محلوں میں۔ خدا جو کی روٹی میں ہے، پیوندوں کی چادر میں ہے اور کربلا میں چمکنے والی حسین ابن علی کی تلوار میں''۔

اس نظم پر داد تو ملی لیکن والد صاحب کے ایک دوست نے ان سے پوچھا۔ سردار جعفری لکھتے ہیں:

''تم خدا کو مانتے ہو' وہ مجھے اس طرف لے جانا چاہتے تھے کہ امیر و غریب سب خدا کے بنائے ہوئے ہیں، لیکن گفتگو میں بات یہاں آ پہنچی میں نے کہا کہ ''میں خدا کو اس لیے مانتا ہوں کہ رسول کو مانتا ہوں، بزرگوں کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ لیکن میں اس وقت ان کے سامنے گستاخ ہو گیا تھا، میں یہاں تک کہہ گیا کہ'' آپ کے پاس خدا ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے، لیکن میرے پاس ہے اور وہ یہ کہ رسول نے کہا ہے کہ خدا ہے۔'' میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا اور دیر تک اقبال کی بانگ درا پڑھتا رہا۔'' (مذکورہ کتاب، ص۔232)

اب بانگِ درا سردار جعفری کو زبانی یاد ہو چکی تھی اور گھر میں بھی ان کا احترام کیا جانے لگا۔ ان کی فکر کا دائرہ اتنا بڑھ چکا تھا کہ اب وہ اپنا زیادہ تر وقت کتابیں پڑھنے میں گذارتے۔ اسی دوران انہیں نگار کے کچھ پرچے مل گئے۔ جس میں نیاز فتح پوری کی تحریر میں انقلاب روس کا ذکر تھا۔ سردار جعفری نے اقبال کی خضر راہ کو اس کے ساتھ ملا کر ایک نئی دنیا کی تعمیر شروع کی۔ یہ ان کی فکر کا نقطہ عروج تھا۔ اب انہوں نے بلرام پور سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا۔

سردار جعفری کی فکر نے انہیں 1933ء میں علی گڑھ پہنچا دیا۔ اس وقت یہ 20 برس کے تھے۔ اور ذہنی الجھنوں کے شکار تھے۔ علم سے ہی ان الجھنوں کو سلجھا سکتے تھے پھر انہوں نے آسکر وائلڈ کو پڑھا۔ اس وقت انہوں نے ڈرامہ ''دو دیوانے'' تخلیق کیا جو علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا۔ پھر انہوں نے گوئٹے کی ''ورتھ'' پڑھ کر ادب کی حقیقت کو جانا۔

سردار جعفری کی سوچ اور فکر نے ایک نیا موڑ لیا جب انہوں نے فرحت اللہ انصاری کی تقریر سنی۔ لیکن ان کی تقریر انگریزی میں ہوا کرتی تھی جس میں ایک لفظ تھا ''بورژوا'' جو سردار جعفری کی سمجھ میں نہیں آیا۔ تقریر کا شوق سردار جعفری کو بھی بہت تھا۔ اس وقت انہوں نے لینن کی سوانح عمری کا مطالعہ کیا۔

گھر کا مذہبی ماحول، گاندھی جی کی کتاب، نہرو کی تقریر، جاگیرداروں کے کسانوں پر مظالم،

آسکر وائیلڈ ، گوئٹے ،فرحت اللہ انصاری اور لینن سے واقفیت سردار جعفری کی انقلابی فکر میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

اسی زمانے میں ان کی ملاقات مجاز، رشید جہاں، محمود الظفر ، جاں نثار اختر، آل احمد سرور، اختر حسین رائے پوری، سبط حسن، شوکت عمر، خواجہ منظور حسین اور منٹو سے ہو چکی تھی۔ بعد میں منٹو سے اختلافات بھی ہوئے لیکن ذاتی دوستی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

1936ء میں انگریزوں کے خلاف سیاسی سرگرمی کے جرم میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے نکلنا پڑا۔ 1939ء میں سرادار جعفری لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم۔اے کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔اس زمانے میں ان کی ایک نظم شائع ہوئی جس کے آخری دو شعر تھے:

؎ عام ہو غالب و اقبال کی رعنائی فکر ۔۔۔ بے زبانوں کو زباں دے کے زباں داں کر دیں

؎ کھول دیں سب کے لیے قفلِ درِ میخانہ ۔۔۔ حضرت جوش کو سر حلقۂ رنداں کر دیں

(''ترقی پسند تحریک کی نصف صدی'' ازعلی سردار جعفری، 1987ء، ص۔48)

سردار جعفری کی فکر اس وقت ایک باقاعدہ صورت اختیار کر چکی تھی ترقی پسندی کے ادب میں۔اب وہ ہر چیز کو دیکھتے ہوئے سوچ سمجھ اور فکر کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا ایک نظریہ رکھتے تھے۔ان کی فکر کی جڑیں اتنی مضبوط ہو چکی تھی کہ یہاں سے وہ کسی قیمت پر پیچھے نہیں ہٹ سکتے تھے۔جس کے نتیجے میں انہیں دو بار جیل بھی جانا پڑا۔ترقی پسند تحریک کی نصف صدی کے دوسرے خطبے میں سردار جعفری کہتے ہیں:

''میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ 1940ء میں جب میں نے لکھنؤ یونیورسٹی کے سکریٹری ہونے کی حیثیت سے طلباء کو سر مارلیسن گورنر کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے آمادہ کیا اور ہندوستان کے یہ چیف جسٹس لکھنؤ میں کانوکیشن کا خطبہ نہیں پڑھ سکے تو یو۔ پی کے گورنر نے وائس چانسلر کو یہ ہدایت دی کہ مجھے یونیورسٹی سے خارج کر دیا جائے۔لیکن وائس چانسلر نے برطانوی حکومت کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ وائس چانسلر حبیب اللہ صاحب تھے اور میرے استاد انگریزی کے پروفیسر سدھانت۔ دونوں نے میرا حوصلہ بڑھایا آخر کار حکومت نے مجھے گرفتار کر کے ایم۔اے فائنل کا امتحان دینے سے روک دیا۔ (ترقی پسند تحریک کی نصف صدی ص۔60)

یہ ان کی زندگی کے واقعات میں سے ایک اہم واقعہ رہا۔جیل سے 8 ماہ بعد رہائی عمل میں آئی۔اس

کے بعد بلرام پور میں نظر بند رہے۔

1940ء میں سردار جعفری کی ملاقات مخدوم سے ہوئی۔ اس سے پہلے مخدوم سے ''نیا ادب'' کے سلسلے میں خط و کتابت ہو چکی تھی۔ سردار جعفری لکھنؤ میں تھے اور مخدوم حیدر آباد میں۔ جیل میں رہنے کی وجہ سے انہیں اس وقت مخدوم سے زیادہ تفصیلی گفتگو کا موقعہ نہیں مل سکا۔ پھر جب وہ 1941ء میں مخدوم سے ملے۔ یہاں انہیں تفصیلی تبادلۂ خیال کرنے کا وقت مل گیا۔ سردار جعفری ''مخدوم سرخ سویرے کا شاعر'' میں لکھتے ہیں:

''یہ تصویر ہماری اس وقت کی جذباتی کیفیات کی ترجمان تھی۔ ہمارا پورا ''نیا گروپ'' اسپین کی خانہ جنگی سے بہت متاثر تھا۔ ہم نے اسی زمانے میں اسپین کے شاعر لورکا کی کچھ نظمیں اور نوجوان انگریزی ادیب کاڈویل ریلف فاکس اور جان کرافورڈ کے حالات پڑھے تھے۔ ہمارے دل میں بھی یہ امنگ تھی کہ ان جمہوری ادیبوں کی طرح ظلم، جہالت، شہنشاہیت اور بربریت کے خلاف لڑکر ہم بھی کہیں اپنی جان دے دیں۔''

(نوائے ادب، جنوری، مارچ 2004ء، مضمون مخدوم: سرخ سویرے کا شاعر، از سردار جعفری، ص۔ 3)

1941ء میں سردار جعفری کی عالمی فکر کی یہ بہترین تصویر کشی ملتی ہے۔ 1942ء میں کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری جناب پی سی جوشی اور سجاد ظہیر نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو ممبئی کے ایک کمیونسٹ اخبار کے لیے استعمال میں لائیں۔ اس وقت سجاد ظہیر اور سردار جعفری دونوں نے اس اخبار کی ذمہ داری سنبھال لی۔ سردار جعفری لکھتے ہیں:

''اس اخبار کی کی اشاعت نے میری صلاحیتوں کو جلا بخشی اور کمیونسٹ پارٹی نے مجھے باقاعدہ اپنا کارڈ ہولڈر بنالیا۔ جس کی میں نے ۵۸ء (58) کے بعد کوئی تجدید نہیں چاہی۔ لیکن میں مارکسسٹ رہا۔ اس پارٹی سے منسلک رہ کر مجھے سمترا نندن پنت' جوش ملیح آبادی اور دوسرے کئی دانشوروں سے ملنے کے مواقع ملے۔ کئی فلمی ستارے بھی ہمارے دفتر میں آتے تھے۔ خصوصاً کے ایل سہگل' پرتھوی راج کپور' کے این سنگھ یہ سب میرے بے حد چاہنے والے تھے''۔

(کتاب نما' علی سردار جعفری نمبر' نومبر 1990 مضمون ''لمحوں کے چراغ جل رہے ہیں'' ص: 60)

اس وقت تک ان کی کہانیوں کا مجموعہ منزل (1938)، منظر عام پر آچکا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی میں داخل

ہونے کے بعد ان کا شعری مجموعہ پرواز اور نئی دنیا کو سلام منظر عام پر آ چکے تھے۔

30، جنوری 1948ء میں سردار جعفری کی شادی سلطانہ منہاج سے ہوئی۔ اسی دوران سردار جعفری نے پابلو نرودا کی ایک انگریزی کتاب "Residence on Earth" پڑھی۔ یہ نظموں کا ایک انتخاب تھا جو ہسپانوی زبان سے انگریزی میں ترجمہ تھا۔ یہ کتاب سردار جعفری کو اتنی پسند آئی کہ وہ جب دوسری بار 1949ء میں جیل گئے تھے اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ اس کا ذکر سردار جعفری اپنے مضمون "شخصیت پابلو نروادا" میں اس طرح کرتے ہیں:

> "مجھے اپریل 1949ء میں دوبارہ گرفتار کر کے آرتھر روڈ جیل بھیج دیا گیا جہاں سے ڈیڑھ ماہ بعد تبادلہ سنٹرل جیل ناسک ہو گیا۔ اس جیل یاترا میں جو کتابیں میری رفیق رہیں ان میں نرودا کی Residence on Earth بھی تھی۔ جس پر آج تک آرتھر روڈ اور ناسک سنٹرل جیل کے جیلروں کے دستخط ہیں میں جولائی 1950ء تک جیل میں رہا اور عید سے ایک دن پہلے رہائی کا پروانہ ملا۔ یہ رہائی اتنی اچانک تھی کہ میں گھر پر اطلاع بھی نہ دے سکا تھا، جب میں نے عید کے دن صبح ہی صبح دروازہ کھٹ کھٹایا تو سلطانہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ اور سب سے پہلی جو چیز انہوں نے مجھے دی وہ ترکی کے شاعر ناظم حکمت کی نظمیں تھیں جن کا ترجمہ ہماری ایک دوست صابرہ زیدی نے امریکہ سے بھیجا تھا۔"

(گفتگو، سہ ماہی، مارچ اور جون 1975ء، مضمون "پابلو نرودا" ص۔ 32)

پابلو نرودا اور ناظم حکمت سے سردار جعفری بہت متاثر ہو چکے تھے۔ پابلو نرودا چلی کا باشندہ تھا۔ جسے اپنے ملک سے جلاوطن کیا گیا تھا۔ اور ناظم حکمت برسوں سے ترکی کی ایک جیل میں بند تھا اور یہ ترقی پسند حلقوں میں کافی مقبولیت رکھتا تھا۔ ناظم حکمت اور سردار جعفری دونوں کے خیالات، سوچ اور فکر میں مماثلت تھی جس کی وجہ سے دونوں کی دوستی اتنی گہری تھی کہ سردار جعفری نے اپنے بیٹوں کے نام ناظم اور علی حکمت رکھ لیے۔

سردار جعفری کی زندگی کے تمام واقعات اور وہ جتنی بھی شخصیات سے مل چکے تھے اور جتنی کتابیں وہ پڑھ چکے تھے اور جتنے تجربات اور مشاہدات کا سامنا کر چکے تھے، ان سب کے ساتھ ان کی فکر کا دائرہ اور بھی وسیع تر ہو گیا۔ جو ہمارے سامنے ان کی تصانیف کی شکل میں موجود ہیں۔

سردار جعفری کی کتاب مخدوم محی الدین (سوانح تنقید) 1948ء خون کی لکیر (نظمیں، 1949ء)

امن کا ستارہ (نظمیں، 1950)، ترقی پسند ادب (تنقید، 1951)، ایشیا جاگ اٹھا (طویل نظم، 1952)، پتھر کی دیوار (نظمیں، 1953)، لکھنؤ کی پانچ راتیں (نثر، 1962)، ایک خواب اور (نظمیں، 1965)، پیراہن شرر (نظمیں، 1966)، پیغمبران سخن (مضامین، 1970)، منتخب قومی شاعر ہندوستانی شاعری آزادی کے بعد (1973) اقبال شناسی (تنقید، 1976)، لہو پکارتا ہے (نظمیں 1978)، ترقی پسند ادب کی نصف صدی (خطبہ، 1987) اس کے علاوہ 300 سے زیادہ مضامین ملتے ہیں۔ ان کی ان تمام ادبی کاوشوں میں ان کی ذہنی وفکری تربیت دیکھی جاسکتی ہے۔ ان میں حسن بیان، حسن الفاظ اور حسن اظہار نمایاں ہے۔ اور ان کے فکر وخیال میں ارتقاء نظر آتا ہے۔

سردار جعفری اپنی تخلیقات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''میری تخلیقات پر صوفی سنتوں اور فقیروں کا گہرا اثر ہے۔ سنت گیانشور، امیر خسرو، کبیر اور سنت تکا رام نے انسانیت کو اونچا مقام دیا اور طبقاتی فرق کو ختم کیا وہی اثر میری تصنیفات میں درآیا ہے۔ انسانی معاشرے کی آزادی اور انسان کی سربلندی کی لڑائی لڑی ہے میں نے اپنے قلم کو انسانی زندگی کی بہتری کے لیے ہی استعمال کیا ہے۔''

(اردو دنیا' سہ ماہی' جنوری تا مارچ' 1998 'مضمون''علی سردار جعفری سے ملاقات'' ص:78)

1958ء میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی نے تلنگانہ کے لئے حکومت کے خلاف جدوجہد شروع کی جس کے نتیجے میں سردار جعفری کو پارٹی سے خارج کردیا گیا۔ اس کے اچانک بعد سردار جعفری کی فکر کا انداز بھی بدل گیا اور وہ کلاسیکی ادب کی طرف مائل ہوگئے۔ میر، غالب، اقبال، کبیر، پر زیادہ توجہ دینے لگے۔ اب وہ آرائش اور دل آویزی کو اہمیت دینے لگے۔ اب ان کی راہیں بدل چکی تھیں۔

سردار جعفری کی فکر کا سلسلہ اس وقت بھی نظر آتا ہے جب انہیں 1997ء میں گیان پیٹھ ایوارڈ دیا جارہا تھا۔ ان کی فکر غالب اور اردو کو لے کر اس طرح ہے:

''یہ کیسی عجیب بات ہے کہ آزادی کے 50 سال بعد بھی غالب اور اردو دونوں بے گھر ہیں۔ اردو فرقہ وارانہ سیاست کا شکار ہوگئی تقسیم ہند نے سب سے زیادہ نقصان اردو زبان کو پہنچایا ہے۔ اگر اس وقت غالب کے دوسوسالہ جشن اور آزادی کے پچاس سالہ جشن کے

موقع پر غالب کو گلی قاسم جان میں اپنا گھر مل جائے اور اردو کو شمالی ہندوستان میں اپنا علاقہ جہاں سے وہ ہندی کے ساتھ دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے زندہ رہ کر ترقی کر سکے تو بہت بڑے نقصان کی تلافی ہو جائے گی۔''

(کتاب نما، مضمون ''اردو اور غالب دونوں کو گھر چاہیے'' 1998ء۔ص۔34)

سردار جعفری کی فکر ان کی آخری تحریر میں بھی دیکھی جا سکتی ہے اور یہ فکر تھی زبان کی۔ رضا جعفری لکھتے ہیں:

''انتقال سے کچھ مہینے پہلے وہ اپنے بستر پر بے حس پڑے تھے۔ ایسے میں اچانک کہیں دور سے کوئل کی آواز سنائی دی۔ ان کی بھتیجی جو پاس ہی بیٹھی تھی بے ساختہ بول پڑی:

''کہیں کوئل بول رہی ہے ....''

اس کا جملہ ختم ہوتے ہی ایسا لگا جیسے سردار جعفری کے بے حس جسم میں ایک ارتعاش سا پیدا ہوا ہو۔ اسی وقت ان کے ہونٹ آہستہ سے ہلے۔ وہ بجھی ہوئی آواز میں کہہ رہے تھے:

''کوئل بولتی نہیں، کوئل کوکتی ہے ....''

اور پھر اپنی ذہنی کمزوری میں وہ برابر دہراتے رہے۔

''کوئل کوکتی ہے ....''

چچا جان! یہی جملہ اس کاغذ پر لکھ دیجیے ....''

اور سردار جعفری نے بچوں کی طرح کہنا مانتے ہوئے کانپتے ہاتھوں سے ٹوٹی پھوٹی تحریر میں پورے کاغذ پر جملہ پھیلا دیا۔

''کوئل کوکتی ہے ....''

شاید یہی ان کی آخری تحریر ہے جو ان کی بھتیجی کے پاس کسی گراں قدر سوغات کی طرح آج بھی محفوظ ہے۔'' (ماہنامہ آجکل، سردار ماموں، اگست، 2003ء۔ص۔20)

سردار جعفری کی فکر زندگی کے آخری لمحات تک بھی تشکیل پاتی رہی۔ ان کی فکر کے تعلق سے جگن ناتھ آزاد نے لکھا ہے:

''نالۂ نیم شبی اور آہ سحر گاہی ایک ایسی کیفیت ہے جو باکمال افراد اور پہنچے ہوئے انسانوں کو ملتی ہے۔

یہ تو ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جو غور اور فکر کرنے والے فنکاروں کو نصیب ہوتی ہے اور یہ نعمت غیر مترقبہ علی سردار جعفری کے حصے میں بھی آئی ہے۔''

(سردار جعفری کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر از جگن ناتھ آزاد، 2004ء۔ص۔10)

سردار جعفری کی فکر کا دائرہ صرف ترقی پسند مصنفین تک محدود نہیں تھا۔ اور وہ صرف ہندوستان ہی کے تخلیق کاروں کی تخلیقات نہیں پڑھتے تھے بلکہ ساری دنیا کے ادب پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ اسی بات کو علی احمد فاطمی نے بھی لکھا ہے :

''سردار جعفری کا مطالعہ ایک عام ترقی پسند ادیب و ناقد کی حیثیت سے محض اقبال، پریم چند، جوش جیسے ترقی پسند فنکاروں تک محدود نہیں رہتا بلکہ ان کی فکر کی فطرت ہندوستانی تہذیب کی جڑوں میں پیوست کبیر، جیسے ہندوستانی شعراء کو سمجھنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور یہی جذبہ گرونانک، ٹیگور اور نذر الاسلام اور آگے بڑھ کر پابلو نرودا، ناظم حکمت جیسے صوفی و انقلابی شاعروں تک لے جاتا ہے۔ جن کی تفہیم انہیں ہندوستان کی اصل تہذیب و تمدن کی طرف لے جاتی ہے اور اس فکری و تہذیبی تناظر میں، وہ جب میر و غالب کی طرف آتے ہیں تو ایک نئی تصویر سامنے آتی ہے۔''

(''نئی تنقید، نئے اقدار'' ستمبر، 1999ء۔ص۔146)

علی احمد فاطمی نے سردار جعفری کی فکر کو ان کے جملہ تخلیقات کے آئینے میں دکھایا ہے لیکن اس کے بر خلاف خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''اقبال بننے کے لیے تو اس خطیبانہ لہجہ اور جذباتی ہیجان پر قابو پا کر فکر و تجسس کی دشوار گزار منزلیں طے کرنی پڑتیں اور کبھی ''سوز و ساز رومی'' کبھی ''پیچ و تاب رازی'' کے درمیان نقطۂ توازن تک پہنچنے کے لیے اپنی راتوں کی نیندیں حرام کرنی پڑتی ہیں اور یہ ہر شخص کے بس کی بات بھی نہیں ہے مگر انیس کے تخیل کی بلندی اور کائناتی مشاہدے کی وسعت اور جوش کی سی نگاہ تماشا اور حواس خمسہ کی بیداری کا بھی جعفری نے کوئی اہتمام نہیں کیا۔ اور اپنے جذباتی محسوسات کو صرف سیاسی ہنگامہ آرائی اور عارضی و ہنگامی مسائل سے غیر معمولی تاثیر پذیری تک محدود کر دیا۔ اس طریقہ کار نے جعفری کے دائرہ فکر کو محدود کر ان کے رقبہ شاعری کو خاصا تنگ بنا دیا ہے''۔

(اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، 2002ء۔ص226)

خلیل الرحمن اعظمی نے سردار جعفری کی فکر کو ترقی پسندی ہی تک محدود رکھا ہے۔ لیکن زاہدہ زیدی نے اپنے مضمون ''علی سردار جعفری کی فکری اور فنی جہات'' میں ان کے فکر کے تعلق سے اپنا نظریہ اس طرح پیش کرتی ہیں:

''وہ ایک خلاق، مفکر اور۔۔۔ شاعر تھے جن کی شاعری کا کینوس اور فکر کا دائرہ کافی وسیع تھا اور ان کی فکری جہات متنوع اور ارتقاء پذیر ہیں۔ پروٹسٹ کے جذبے اور انقلابی نظریے کے اظہار سے لے کر وسیع آفاقی وژن اور فلسفیانہ تفکر اور ماورائی احساس تک اس نے کئی مراحل طئے کیے۔ اور ہر منزل پر ان کی فکر والہانہ جذبوں سے سرشار رہی۔ شدت فکر و احساس وژن کی وسعت اور اسلوب کی بلند آہنگی سردار جعفری کی شاعری کی کچھ نمایاں خصوصیات ہیں۔''

(سردار جعفری ''شخصیت اور فن'' مرتبہ اصغر عباس، 2002ء۔ ص 129)

سردار جعفری کے فکری پہلو کو لے کر اردو ادب کے بہت سارے ناقدین نے روشنی ڈالی ہے عبدالستار دلوی سردار جعفری کی فکر کو کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

''جعفری صاحب کی تازہ کار اور توانا فکر ابتداء ہی سے انقلابی اور معلمانہ فکر اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یہ انقلاب اور اصلاح نظریاتی اور فکری اصلاح ہے، یہ فکر و خیال کی انجمن ظلم و جور اور اعلیٰ انسانی اقدار کے لیے نبرد آزما ہونے کا درس دیتی ہے اور ادب کے قارئین کی ذہنی تربیت کرتی ہے۔ اس میں عصری تقاضے سیاسی رمز و کنائے، فکری اور شاعرانہ بلندیاں، انسان نوازیاں، بھائی چارہ، دوستی اور سیکولرزم کے ساتھ حب الوطنی کی اعلیٰ قدریں بھی شامل ہیں۔ وہ ذہنی زندگی کو تاریخ کے جمال اور جلال دونوں سے بیک وقت متعارف کراتی ہیں۔''

(''مہاتما گاندھی، اردو، اقبال اور دوسرے مضامین'' ص۔ 225)

مختصر طور پر اس پورے مقالے کا ماحاصل یہ ہے کہ سردار جعفری کی فکری تشکیل کے ان تمام پہلوؤں کو جاننے اور سمجھنے کے بعد مختلف ناقدین کی آراء کی فکر کو دیکھتے ہوئے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ سردار جعفری کی فکر میں ایک ارتقاء ہے۔ بچپن میں ملے مذہبی ماحول ہی سے ان کی فکر کی شروعات ہو چکی تھی۔ اس کے بعد ان کی آزاد خیال طبیعت نے انہیں ہر چھوٹے بڑے واقعہ پر غور کرنے پر مجبور کیا۔ بلرام پور چھوڑنے کے بعد تو ان کی فکر میں انقلاب کا پہلو نمایاں ہو چکا تھا۔ ان کی اس فکر نے انہیں کبھی داد دلائی تو کبھی رسوا کیا۔ اسی فکر کا نتیجہ تھا

کہ انہیں دوبار جیل جانا پڑا۔ اس سب کے باوجود سردار جعفری کے فکر کے دائرے اور بھی وسیع ہوتے گئے۔ جس کی مثال ان کی عمدہ تحریریں اور تقریریں ہیں۔ جس کو کسی نے سراہا ہے تو کسی نے بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مخالفت کے باوجود سردار جعفری کے ارادوں کی مضبوطی میں بالکل فرق نہیں آیا اور وہ اپنی عالمی فکر کو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھاتے گئے۔ ان کا مطالعہ جتنا گہرا تھا اتنا ہی وسیع تھا اور ان کی فکر بھی مطالعہ کے ساتھ ساتھ قدم سے قدم ملاتی گئی۔

میں ہوں صدیوں کا تفکر، میں ہوں قرنوں کا خیال
میں ہوں ہم آغوش اَزل سے ابد سے ہم کنار

ڈاکٹر آمنہ آفرین کو یونیورسٹی آف حیدرآباد نے ''اردو میں منی افسانہ'' کے موضوع پر ایم۔فل اور ''اردو میں تجریدی افسانہ'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی ہے۔

سردار جعفری کے سماجی افکار

پروفیسر خواجہ محمد شاہد

تخلیق کار اور عوام کے بیچ میں جو باہمی رشتے ولی دکنی نے قائم کئے تھے ان کی روایتیں اور حکایتیں کبیر، میر، نظیرا کبرآبادی، سودا اور بعد میں حالی، اکبرالہ آبادی، حسرت وغیرہ نے جاری رکھیں۔ ان ہی شعرا کی طویل صف میں سردار جعفری بھی کھڑے نظر آتے ہیں۔ لیکن سردار جعفری کی ایک مخصوص حیثیت یہ تھی کہ وہ ایک تحریک سے منسلک تھے۔ وہ تحریک تھی ترقی پسند تحریک جس کے وہ سالاروں، مبلغین اور منتظمین میں شامل تھے۔ اسی لئے جوان کے ہم خیال تھے وہ ان کے ہم سفر بن گئے لیکن مخالفین نے ان کو نشانہ بنالیا جس کی وجہ سے ان کی شاعری اور فکر دونوں سخت حملوں کی زد سے بچ نہیں سکے۔ ان کے بارے میں زیادہ تر تحریریں ان کی ترقی پسند فکر سے متاثر ہوکر ان کی حمایت یا مخالفت میں لکھی گئی ہیں اور ہمیں ان کی شاعری ہو کہ نثر دونوں کے بارے میں بڑے متضاد مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں۔ کچھ نقاد اور شاعر تو ان کو شعرا کی صف میں شامل کرنے کو بھی تیار معلوم نہیں ہوتے ۔ یہ کوئی چونکا دینے والی بات نہیں ہے کیونکہ غالب اور اقبال کے ساتھ بھی ان کے کچھ معاصروں نے کچھ یہی رویہ روا رکھا تھا۔ کسی شخص کو بڑے شاعر یا ادیب کے مرتبہ پر فائز ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ سب اس کی تعریفیں کریں یا اس نے کوئی کمتر کلام یا نثر نہیں لکھی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جو ادب انسانی جذبات اور رشتوں سے جڑا ہوتا ہے وہی دیرپا ہوتا ہے کیونکہ اس کی جڑیں زندگی کی حقیقتوں سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ زندگی کی بنیادی حقیقتیں ہر زمانے میں تقریباً ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ غالب کے الفاظ میں ان کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

اس پس منظر میں سردار جعفری نے کفر کے خلاف اپنا فیصلہ واضح اور بآواز بلند طے کر لیا تھا۔ ان کی جو ترجیحات تھیں وہ صاف تھیں ان کی تخلیقات میں ان کی یہ ترجیحات بالکل عیاں تھیں اور ان کو اس میں کوئی تکلف یا افسوس بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی بھی دفاعی نہیں رہے۔ ان کو اپنے خیالات اور فلسفہ کی سچائی پر پورا یقین تھا۔ سردار جعفری خود لکھتے ہیں کہ انہوں نے ''یہ نتیجہ نکالا کہ فتنہ وفساد برپا کرنے والے صاحبانِ اقتدار ہیں''۔ وہ یہ مانتے تھے کہ خدا نہ تو بادشاہوں کے درباروں میں نہ دولت کے ڈھیر میں ہے، خدا تو غریب کے جھونپڑے میں ہے۔ ان کو مہاتما گاندھی کے اس قول پر یقین تھا کہ ''بھوکوں کے سامنے خدا بھی روٹی کے سوا کسی اور روپ میں ظاہر نہیں ہوسکتا''۔ سردار جعفری کے ان خیالات کو کسی ایک سماج، ملک یا دور تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی فکر کو وقت کے حدود میں قید نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وجود انسانی کے ہر دور اور ہر خطہ میں سردار جعفری کے خیالات کی اہمیت ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا ادب ہر جگہ سمجھا جاتا اور پسند کیا جاتا ہے۔ سردار جعفری نے اپنی شاعری، نثر، خطابت، تنقید، فلمیں، سیریل جیسے ذرائع ترسیل کو لگاتار اپنی فکر اور خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اسی ایمان کے ساتھ انہوں نے حسین ابن علی کی تلوار کے مماثل اپنے قلم کو حق وانصاف کے لئے استعمال کیا۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کے مطابق ان کو زندگی کی صحیح بصیرت حاصل تھی۔ حالانکہ وہ میر کی طرح یہ نہیں کہتے کہ ۔

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

لیکن وہ اپنے بارے میں یہ ضرور کہتے تھے کہ ۔

کوئی دیوانہ ہے لیتا ہے سچ کا نام اب تک
فریب و مکر کو کرتا نہیں سلام اب تک

لیکن وہ یہ بھی ضرور چاہتے تھے کہ:

گفتگو بند نہ ہو

بات سے بات چلے
محفل شام صبح تک چلے

اپنی انہی فکری ترجیحات کی وجہ سے سردار جعفری کو کسی کا بھی کام اور کلام نہیں جچا، چنانچہ وہ کہتے ہیں ۔

سارے اشعار بے کیف سے لگ رہے ہیں

وہ میرے اپنے اشعار ہوں یا کسی اور کے

وہ زندگی کے حقائق کو محدود نظریہ سے دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ وہ کہتے ہیں ۔

ان میں تلوار کی دھار بجلی کی تیزی نہیں ہے

صرف اشکوں کے طوفاں خوابوں کے رومان ہیں

خوں کی گرمی نہیں ہے

وہ تو زندگی کو نازک خیالی کے حوالے سے نہیں بلکہ ناقابل تردید تلخ حقیقتوں کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے میں یقین رکھتے تھے، چنانچہ وہ کہتے ہیں

گہری بہت شکن ہے جبینِ حیات کی ۔۔۔ یہ خط نہیں مصورِ رنگیں کمال کا

فولاد کی گرج ہے یہ آہن کا شور ہے ۔۔۔ نغمہ نہیں ہے شاعرِ نازک خیال کا

لیکن یہ زمانہ سردار جعفری کے فکری نظام اور ادبی سفر کا اولین دور تھا جس کی معراج یہ تھی کہ "کوئی ادب اس وقت تک عظیم نہیں ہوسکتا جب تک اس کا ایک اعلیٰ سماجی مقصد نہ ہو"۔

(بھیونڈی کا مینی فیسٹو)

اسی لئے سردار جعفری نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا:

شاعرو! ساتھیو!

اپنے تاریک اندیش رومان کے ساز توڑ دو

اپنے مضراب کو پھینک دو

اس کے نغموں سے آنسو ٹپکتے رہیں گے

اپنی شہرت کے اونچے مناروں سے

نیچے اتر آؤ

کاکلوں کی گھنی چھاؤں سے

سرخ پرچم کے سایے میں آؤ

اور نئے گیت گاؤ

مزدور کے ساز پر

گاؤ جمہور کے ساز پر

گاؤ گرجتے ہوئے بادلوں کی طرح

گاؤ کڑکتی ہوئی بجلیوں کی طرح

آندھیوں کی طرح

زلزلوں کی طرح

گولیوں کی طرح اپنے الفاظ دشمن پر برساؤ

سارے عالم پر چھا جاؤ

(رومان سے انقلاب تک)

وہ لکھتے تھے:

''ہم انقلابی دور سے گزر رہے ہیں۔ ہمارے پیش نظر ایک ایسی دنیا ہے جو موجودہ دنیا سے بہت مختلف ہے۔ ہمیں وہاں تک پہنچنا ہے۔ ہر وہ چیز جو ہمارے راستے میں حائل ہے، اسے روند کر وہاں پہنچنا ہے۔''

(پیش لفظ ''منزل'' ۱۹۳۹ء)

سردار جعفری نے اپنی نظم ''بغاوت'' میں بغاوت کو عصر حاضر کے سپوتوں کا ترانہ بنا دیا۔ انہوں نے سب کو آواز دی:

اٹھو ہند کے باغبانو اٹھو — اٹھو انقلابی جوانو اٹھو

کسانوں اٹھو، کامگارو اٹھو — نئی زندگی کے سردارو اٹھو

غلامی کی زنجیر کو توڑ دو — زمانے کی رفتار کو موڑ دو

(''جمہور'' ۱۹۴۶ء)

اپنی نظم ''کشاکش''، میں سردار جعفری یہ بھی کہنے لگے:

کاٹنا پڑتا ہے تلواروں کو تلواروں سے
اپنی طاقت کو ذرا اور بڑھانا ہوگا
ہے زمانے میں تشدد ہی تشدد کا جواب
جبر سے ظلم کی ہستی کو مٹانا ہوگا

دنیا بھر کا ترقی پسند ادب ان کا نمائندہ ادب بن گیا اور اس طرح ان کی تحریک عالمی تحریک کا حصہ بن گئی۔

ساتھیو آج یہ سب تمہارے طرفدار ہیں
سب تمہارے مددگار ہیں
سب تمہارے لئے لڑ رہے ہیں
اور میں گا رہا ہوں
اور میرے ساتھ پبلو نرودا چلی کا جواں سال شاعر
پیرس کا آتش نفس آراگوں ہے
لورکا والٹ وہٹ مین
گورکی اور پشکن
دانتے اور ہومر
سب ہم آواز ہیں

(سیلاب چین)

سردار جعفری کے ادبی سفر کا دوسرا دورہ ہے جس میں انہیں یہ احساس ہوا کہ صرف ایک آئیڈیالوجی ہی صحیح نہیں ہوتی ہے بلکہ دوسرے نقطۂ نظر میں بھی سچائی ہو سکتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سنجیدہ تنقید کا خیر مقدم اور مخالف نقطۂ نگاہ کے خلوص کا احترام کرتے ہیں لیکن تنگ نظری اور صوبائی عصبیت کی داد دینے سے قاصر ہیں (ترقی پسند ادب)۔ اب سردار جعفری یہ کہتے ہوئے بھی سنائی دیتے ہیں:

''ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس شاعری کی بھی ضرورت ہے جو ایک وقتی لمحہ کی ضرورت کو پوری کر رہی ہو اور اس شاعری کی بھی جو لمحاتی اور وقتی سطح سے بلند ہو کر دائمی قدر کی بھی حیثیت حاصل کر سکے۔''

(سردار جعفری کا انٹرویو۔ ماہنامہ افکار کراچی۔ سردار جعفری نمبر، نومبر۔۱۹۹۱ء)

اسی انٹرویو میں جعفری یہ بھی مانتے ہیں کہ ''ماضی کا پورا ورثہ ہمارا ورثہ ہے اور وہ ہمارے شعور کا حصہ بنتا جاتا ہے۔'' وہ آگے کہتے ہیں کہ ''ہم (ترقی پسند) فن، حسن اور افادیت تینوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔'' اب جعفری کو ہندوستانی ادب ''قدامت پرست'' نہیں دکھائی پڑتا جیسا کہ ترقی پسندوں کے شروع کے مختلف مینی فیسٹو میں محسوس ہوتا تھا۔

پیغمبرانِ سخن (فروری ۱۹۷۰ء ایڈیشن) کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ:

''کبیر، میر اور غالب یہ تینوں شاعر میرے نزدیک ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں... میرے لئے کبیر، میر اور غالب کی شاعرانہ دنیا کی بازیافت خود میری شعر گوئی کے لئے ضروری ہے۔ میں جس نظریۂ جمال اور نظریۂ تاریخ پر یقین رکھتا ہوں اور جو میرے اندر گذشتہ تیس سال میں رچ بس چکا ہے، میں نے اسی نظریے سے ان بزرگ شعرا کے کلام پر نظر ڈالی ہے۔ یہ کلام ابدی قدروں کا حامل ہے۔ لیکن اپنے عہد سے بے نیاز نہیں ہے۔ وقت کی وہ روانی جو ماضی، حال اور مستقبل کو ایک بہتے ہوئے دریا میں پیش کرتی ہے اس کی موجوں میں شعر و فن بھی شامل ہے۔''

سردار جعفری کے ادبی سفر کے ارتقا کی منزلوں کی پہچان تو بہت نمایاں ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کی فکری جہتیں بھی بالکل واضح ہیں جن کی بہت اہمیت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ انسان اور انسانیت کی عظمت، عالمیت اور عالمی امن، جنگ اور خون خرابے کے خلاف مہم، مزدور و کسان کی برتری، تصوف اور بھگتی کی اہمیت، مظلوم کی طرفداری، وطن پرستی، ان کی اہم فکری ترجیحات تھیں۔ سب سے اہم بات یہ کہ انہیں یقین تھا کہ ان کا مشن ان کی زندگی کے ساتھ محدود نہیں ہے، یہ چلتا رہے گا۔

اس خطیب خوش گفتار نے خود اپنے متعلق یہ پیشن گوئی کی تھی کہ:

جب آنکھوں کے دیے بجھ جائیں گے
اور برگ زباں سے نطق و صدا کی

ہر تتلی اڑ جائے گی
تو میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا

سردار جعفری کی شخصیت کا ایک اور اہم پہلو تھا جس پر توجہ کی ضرورت ہے اور وہ ہے ان کی سیاسی زندگی۔ سردار جعفری کی سیاسی زندگی اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں بہت زیادہ مواد نہیں ملتا ہے یا یہ کہا جائے کہ اس پہلو پر ابھی بالکل ہی کام نہیں ہوا ہے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ میری معلومات کے مطابق ان کی سیاسی زندگی پر الگ سے کوئی واضح مضمون یا کتاب ہمارے سامنے نہیں ہے۔ ان کے متعلق جتنی بھی کتابیں یا خاص نمبر شائع ہوئے ہیں وہ زیادہ تر ان کے ادبی سفر تک محدود ہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں چاہے وہ علی گڑھ میں ہو یا لکھنؤ، سردار جعفری نے سیاسی سرگرمیوں میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ علی گڑھ سے ان کا اخراج بھی ان کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ہوا تھا۔ لکھنؤ میں تو انہوں نے اسٹوڈینٹ یونین کا الیکشن لڑا اور جیتا بھی۔ اس وقت وہ کمیونسٹ پارٹی کی اسٹوڈینٹ ونگ، اسٹوڈینٹ فیڈریشن آف انڈیا کے ممبر تھے اور اسی کے ٹکٹ پر انہوں نے اسٹوڈینٹ یونین کا الیکشن لڑا تھا۔ سردار جعفری نے اپنی جیت درج کر کے شاید پہلی مرتبہ زمیندار و تعلقہ دار لابی کو لکھنؤ یونیورسٹی کی اسٹوڈینٹ یونین سے باہر کر دیا تھا اور پھر اسی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ان کا نام یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا۔ ان کو جیل اور نظر بندی کی سزا بھگتنی پڑی۔ ۱۹۴۲ء میں سردار جعفری ممبئی چلے گئے اور کمیونسٹ پارٹی کے باضابطہ ممبر ہو گئے۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کے اردو اخبار کی مجلس ادارت میں ان کا نام رہا لیکن یہ نہیں معلوم ہے کہ اس کے علاوہ ان کی کوئی دوسری سیاسی مشغولیت تھی کہ نہیں؟ اس کی زیادہ تفصیلات نہیں ملتی۔

سردار جعفری، کمیونسٹ پارٹی کی ممبر شپ اور اپنے سیاسی کاموں کی وجہ سے ممبئی میں جیل بھی گئے۔ جیل میں اسٹرائیک کرنے کو کہا گیا اور اس میں ناکامی کی وجہ سے کمیونسٹ پارٹی میں معتوب بھی ہوئے۔ ان پر یہ بھی ''الزام'' لگایا جاتا ہے کہ وہ نہرو اور اندرا گاندھی کے قریب رہے۔ دوسرے الفاظ میں کانگریس پارٹی سے لگاؤ رکھا۔ اندرا گاندھی کے دور اقتدار میں انہوں نے ایمرجنسی کی حمایت بھی کی۔ سردار جعفری جو ایک بہت ہی ذہین

اور پختہ سوچ رکھنے والے شخص تھے، ان سے یہ امید نہیں کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی مخصوص سوچ یا نظریہ کے بغیر ہی سیاسی تبدیلی کے سفر پر گامزن رہے ہوں گے۔ میرا ذہن بغیر کسی / واضح ثبوت کے سردار جعفری کے خلاف کسی بھی تہمت کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے۔

اسی طرح سردار جعفری کی زندگی سے جڑا ہوا ایک اور اہم سوال ہے جس کا بھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملتا اور وہ سوال ہے کہ ایک وقت انہوں نے اردو کے رسم الخط کو تبدیل کرنے کی تحریک کی حمایت یا قیادت بھی کی تھی۔ سردار جعفری نے ایسا کیوں کیا، سردار کی وجوہات کیا تھیں؟ کیا دلائل تھے؟ ان کا بھی دانشورانہ طور پر تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ قیاس اغلب ہے کہ سردار جعفری جیسے سمجھ دار اور مدلل ذہن نے اگر اس تجویز پر اپنے دستخط ثبت کئے تھے اور اس تجویز کو حیدر آباد کے ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں پیش کیا تھا تو ان کے سامنے جو وجوہات رہی ہوں گی وہ بہت ہی اہم ہوں گی، جس کی وجہ سے وہ اردو کے تاریخی رسم الخط سے محروم ہونے کو تیار ہو گئے تھے۔ سردار جعفری نے اس تجویز کے منفی اور مثبت پہلوؤں پر ضرور غور کیا ہوگا اور مثبت پہلوؤں کو زیادہ پایا ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ اس تجویز کے ساتھ جو شرائط منسلک تھیں وہ اتنی سخت تھیں کہ اس پر ہندی والوں کو اگر اتفاق ہوتا تو ہندی کو بھی اپنی سنسکریاتی شکل کو ختم کرنا ہوتا۔ ہندی کو اردو کے خزانہ سے بہت کچھ قبول کرنا پڑتا اور اردو ہندی مل کر شاید ایک نئی زبان کی تشکیل کرتیں۔ ضروری نہیں ہے کہ یہ خیال صحیح ہو۔ سردار جعفری نے بذات خواد اپنی عمر کے بعد کے دور میں اپنی اس رائے سے رجوع کر لیا تھا۔ اس مسئلے پر سردار جعفری کے حوالے سے ریسرچ ہونی چاہئے۔

کسی بڑے آدمی بشمول ادیب و شاعر کے لئے ضروری نہیں ہے کہ اس کا عمل، قول یا اس کی فکر ہمیشہ صحیح ہو۔ بڑا پن تو شاید اسی میں مضمر ہے کہ آدمی اپنی غلطی کو تسلیم کرے، سردار جعفری میں یہ قوت تھی۔ پروفیسر شمیم حنفی کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ سردار جعفری کا ادب یا تفکر اتنا کمزور نہیں ہے کہ وہ کسی تنقید سے گھبرائے۔ سردار جعفری کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں کہ "سردار جعفری کی شاعری اتنی عظیم ہے کہ وہ تنقید نگاروں کے پیمانوں پر کھری اترتی ہے اور اسے کسی تنقیدی محاسبہ سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے" (سردار جعفری اور ادب کی سماجی معنویت)۔ سردار خود لکھتے ہیں کہ "نظریات ذاتی جائیدادیں اور موروثی اوقاف نہیں ہیں جنہیں "مخالفین" کی دستبرد سے بچانے کے لئے تلواریں میان سے کھینچ لی جائیں" (ترقی پسند ادب)۔

''میرے اور میرے ترقی پسند دوستوں کے درمیان بعض چیزیں مشترک ہوں گی۔ بعض باتوں پر اتفاق ہوگا اور بعض باتوں پر اختلاف رائے۔ اتفاق رائے تحریک کو مضبوط کرے گا اور اختلاف رائے تنقید کو آگے بڑھائے گا۔ میں اپنے نقطۂ نظر سے یہ بتاؤں گا کہ ادب کیا ہے اور اسے کیا ہونا چاہیے۔ اس نقطۂ نظر کی وضاحت کو تحریک میں شریک ہونے کی شرط سمجھ لینا غلطی ہے پھر بھی تحریک میں شریک ہونے کی ایک شرط ہے جس پر تمام ترقی پسند مصنفین متفق ہیں اور وہ ہے ادب میں عوامی زندگی کی ترجمانی کرنا۔ یہ ترجمانی کس طرح کی جائے، اس پر اختلاف ہوگا اور بہت دن تک رہے گا۔ اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ زندگی اور عمل کی دلیل ہے'' (ترقی پسند ادب)۔ وہ آگے لکھتے ہیں ''میں اپنی غلطی کا ہر وقت اعتراف کرنے اور اسے درست کرنے کے لئے تیار ہوں۔'' سیاسی اور ادبی اختلافات کی ڈھال لے کر اعتراضوں سے منہ نہیں پھیرنا چاہئے بلکہ اس کا سچائی اور خلوص کے ساتھ علمی مقابلہ کرنا چاہئے۔ اسی بحث ومباحثہ اور محاسبہ کے عمل سے ہی فکر انسانی کی ترقی و ارتقا ہوتی ہے۔

پروفیسر خواجہ محمد شاہد: کارگزار وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی۔ اس سے قبل پروفیسر خواجہ محمد شاہد اسی یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر کے طور پر مئی 2013 سے کارکرد تھے۔ وہ اکیڈیمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر اور مرکز پیشہ وارانہ فروغ برائے اردو میڈیم اساتذہ کے انچارج ڈائرکٹر بھی تھے۔ پروفیسر خواجہ محمد شاہد ایک نہایت قابل اور تجربہ کار منتظم اور ماہر تعلیم ہیں۔ اپنے کیریر کے دوران مختلف تعلیمی اداروں اور انجمنوں سے سرگرمی کے ساتھ مربوط رہے جن میں قومی سطح کے صنعتی شعبے میں تحقیق وترقیاتی ادارے، اسکول، کالجس اور یونیورسٹیز شامل ہیں۔ پروفیسر خواجہ شاہد نے یو پی ایس سی کے ایک سینئر عہدیدار کی حیثیت سے امتحانی اصلاحات پر عمل کیا اور ملک کے مختلف مراکز پر امتحانات کی نگرانی کی۔ انھوں نے سیول سرویسس امتحان میں اصلاحات کے لئے پروفیسر الگھ کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کی۔ یہی سفارشات سیول سرویسس امتحانی نظام کی موجودہ تبدیلیوں کی بنیاد ہیں۔

علی سردار جعفری کے ترقی پسند نظریات

ڈاکٹر منظور احمد دکنی

اردو ادب ۱۸۵۷ء تا ۱۹۳۵ء مختلف حالتوں سے دوچار رہا اور عالمی تحریکات و تغیرات سے متاثر بھی رہا۔ فکری و فنی اعتبار سے اردو ادب میں نئے انداز نمایاں ہوئے اور اسی عہد میں ایک ایسا انقلاب برپا ہوا جس کی گونج سے ایوان ادب میں تبدل کی ہلچل پیدا ہوئی۔ یہ ترقی پسند تحریک کی آواز تھی، جسے ترقی پسند قلم کاروں نے فیصلہ کن تحریک قرار دیا اور اس کے مفید نتائج سامنے آئے۔ یہ تحریک پورے ربع صدی سے زائد عروج و ارتقاء کے مدارج طے کرتی رہی لیکن اس کے اثرات آج تک بھی ادب میں محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ اس ضمن میں سردار جعفری لکھتے ہیں:

''اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہ ملک کی سب سے بڑی ادبی تحریک ہے جو صرف ایک زبان تک محدود نہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کی ہر زبان کے بہترین ادیب اس تحریک سے وابستہ ہیں ویسے اس کے لیے یہ سعادت بھی کچھ کم نہیں کہ اس کو ٹیگور اور پریم چند، جوش اور والاتھول کی سرپرستی نصیب ہوئی اور اقبال کی دعائیں ملیں۔ اس کے پہلے اعلان نامے پر مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عابد حسین اور نیاز فتح پوری کے بھی دستخط تھے اور اس کے نوجوان قافلے میں نومشق ادیبوں کی ہمت افزائی کے لیے مجنوں اور قاضی عبدالغفار جیسے پختہ کار ادیب شامل رہے''۔ (ترقی پسند ادب، از: علی سردار جعفری، ص ۱۷)

ترقی پسند تحریک کو عالمی تحریک کی حیثیت حاصل رہی اور اس تحریک کے اثرات تمام زبانوں کے ادب پر مرتب ہوئے ہیں۔ تحریک کے ابتدائی نقوش کو سمجھنے کے لیے عالمی حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ۱۹ویں صدی کا آغاز دنیا کے لیے انقلاب عظیم ثابت ہوا۔ ۱۹۱۷ء کا سرخ انقلاب جو کارل مارکس کے نظریات کا پیش خیمہ تھا اس نے نہ صرف روس بلکہ تمام دنیا کو متاثر کیا۔ اور عالم گیر پیمانے پر سرمایہ دارنہ نظام کے خلاف نفرت کا اظہار کیا جانے لگا۔ روس کے انقلاب سے دنیا میں عوامی تحریک کو تقویت ملی اور ایشیاء کے محکوم ممالک اپنی

گہری نیند سے جاگ اٹھے۔ ہندوستان میں ۱۹۱۷ء تک تعلیم یافتہ طبقہ ہی ان بین الاقوامی حالات سے متاثر تھا۔صحافت کی عوامی مقبولیت نے دنیا کے حالات کی خبریں پہنچانی شروع کردیں۔ ہندوستان میں بھی سماجی وسیاسی سطح پر بہت سی اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اندرونی ہنگاموں اور مطالبات آزادی نے شعروادب کو بھی متاثر کیا۔اردو شعروادب کے جن قلم کاروں نے اس تحریک کے ذریعے ادب کی آبیاری کی ان میں سجاد ظہیر، جذبی، مخدوم، سردار جعفری، کرشن چندر، مجاز، ساحر، فیض، خواجہ احمد عباس، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، خلیل الرحمٰن وغیرہ کے نام خصوصی طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔ترقی پسند ادب کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں خلیل الرحمٰن اعظمی کہتے ہیں:

> ’’دوڈھائی سال کے اندر ترقی پسند ادیبوں کی تحریک کو ہندوستان کی تمام زبانوں میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ ٹیگور اور اقبال، پریم چند اور عبدالحق، جواہر لال نہرو اور سروجنی نائیڈو، آچاریہ نریندر دیو اور جے پرکاش نارائن جیسے عالموں ادیبوں اور سیاست دانوں نے اس تحریک کے مقاصد کو لبیک کہا اور ہر طرح سے ان کی ہمت افزائی کی۔ ہر شہر اور ہر علاقہ میں نوجوان ادیب اس رجحان سے متاثر ہو رہے تھے اور ان کے تحریروں میں ایک نیا شعور اور نیا احساس جنم لے رہا تھا۔ بنگالی زبان کے مشہور ماہنامہ ’’پر چئے‘‘ نے اپنی زبان کے ترقی پسند ادیبوں کے مضامین اور نظموں کو خاص طور پر جگہ دینی شروع کی۔ حیات اللہ انصاری نے کانگریس کی طرف سے ایک ہفتہ وار اخبار ’’ہندوستان‘‘ لکھنو سے جاری کیا تھا۔جس میں ترقی پسند تحریک کی کانفرنسوں کی روئداد اور تقریروں کے علاوہ وہ نئے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات بھی شائع ہونے لگیں‘‘۔
>
> (ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمٰن اعظمی ،ص ۵۸)

ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ۱۹۵۶ء تک کامیابی کے ساتھ جاری رہی اور اس تحریک نے ایک عہد ساز رول ادا کیا۔ زبان وادب میں ہندوستان کی وہ فرسودہ روایت جو مذہب اور رسومات کے سہارے پروان چڑھ رہی تھی‘ ترقی پسندوں کے زیر اثر ادبا و شعراء کی نگارشات کے ذریعہ تقریباً خاتمہ کی طرف تھی اور ایک نئی روایت کا آغاز ہوا جس نے شعور کی رو بدل دی۔ اگر چہ اس تحریک کی مخالفت بھی کی گئی۔ ان اعتراضات پر علی سردار جعفری کہتے ہیں۔

''ترقی پسند تحریک اور ادب پر اعتراضات پہلے بھی ہوتے تھے آج بھی ہوتے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔لیکن اس زمانے میں اعتراضات کا انداز بدل گیا ہے۔خواہ وہ فن کے نام پر کیے جاتے ہوں یا ہنگامی موضوعات کے نام پر لیکن بار بار جو اعتراض دوہرایا جارہا ہے وہ یہ ہے کہ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے موضوعات پہلے سے طے شدہ ہیں اور طے شدہ موضوعات پر اچھا ادب تخلیق نہیں کیا جاسکتا۔یہ اعتراض اس لیے بے معنی ہے کہ اس میں تاریخی بصیرت کی کمی ہے۔واقعہ یہ ہے کہ ادب کے موضوعات ساری دنیا اور ہر زمانے میں اور ہر زبان میں پہلے سے طے شدہ ہیں''۔

(ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، مرتبہ: قمر رئیس، عاشور کاظمی، ص ۶۴)

علی سردار جعفری کی زندگی ترقی پسند تحریک کے فروغ واشاعت میں گزری۔ان کی یہ وابستگی نہ صرف شعر وادب ہی تک رہی بلکہ انہوں نے کمزوروں اور مزدوروں کی حمایت میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کا عملی مظاہرہ کیا، جو ان کے مضبوط عقیدے اور مربوط اعتماد کو نمایاں کرتا ہے۔ان کی پرورش جس ماحول میں ہوئی تھی اور جس دور میں ان کے شعور کی آنکھ نے بصیرت عطا کی اس میں اس قسم کا میلان ورجحان کچھ تعجب خیز بھی نہیں تھا۔بیسویں صدی کا یہ وہ دور ہے جب ہر جانب انقلاب کی گونج سنائی دے رہی تھی۔زمینداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف مزدوروں اور کسانوں کو متحد کرنے کی کوششیں تیز تر ہورہی تھیں۔خواتین کی بیداری اور انہیں با اختیار بنانے کی صدائیں بلند ہورہی تھیں۔ذرائع ترسیل وابلاغ کی مقبولیت کے سبب، دنیا کے انقلابات کے اثرات ہندوستانی سماج اور سوسائٹی پر مرتب ہورہے تھے بلکہ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ اب ایک نئے انقلاب کی آمد آمد ہے۔ہر چند کہ سرمایہ داروں اور زمینداروں کی سازشیں بھی عروج پر تھیں۔عدل وانصاف کا حصول دشوار ہی نظر آرہا تھا۔ایسے پرآشوب ماحول میں علی سردار کی شخصیت کی تشکیل وتعمیر ہوئی۔

علی سردار جعفری بلرام پور کے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔جہاں کی عالی شان حویلی میں ان کی پیدائش ہوئی۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اس کے بعد کسی قریبی مدرسہ میں انہیں داخل کرایا گیا۔جہاں انہوں نے دینی تعلیم کے علاوہ گلستان و بوستاں وغیرہ پڑھی۔مگر بہت جلد یہاں کے مقامی اسکول میں داخلہ لیا اور ہائی اسکول کامیاب کرکے ۱۹۳۳ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ان کی ابتدائی تعلیم سے علی گڑھ کا سفر کافی کرب آمیز رہا۔بچپن میں وہ بہت دردناک واقعات کا نظارہ کرچکے تھے کہ کس طرح گاؤں کے کسانوں

اور پسماندہ لوگوں کا استحصال کیا جاتا ہے۔ ان کے اندر کا انسان جاگ اٹھا اس سلسلے میں وہ اپنے بچپن کا ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ایک بار ایک ہرواہی ہمارے گھر میں اناج صاف کرنے آئی تھی۔ وہ چاول صاف کرتی جاتی تھی اور ایک مٹھی کچے چاول اپنے منہ میں ڈال لیتی تھی۔ یکا یک میرے بہنوئی کی نظر پڑ گئی۔ انہوں نے ڈانٹ کر پوچھا کہ منہ میں کیا ہے؟ ہرواہی گھبرا کر جلدی جلدی کچے چاول چبانے لگی۔ میرے بہنوئی نے لپک کر اس کے منہ پر گھونسا مارا۔ ہرواہی نے خون کی ایک کلی کے ساتھ کچے چاول تھوک دئے۔ وہ غریب کئی دن کی بھوکی تھی۔''

(علی سردار جعفری بحیثیت نظم گو: تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، طاہرہ بانو، ص ۷۵)

یہ اور اس طرح کے کئی واقعات کے اثرات ان کے دل و دماغ کو بے چین کر دیتے اور وہ سوچتے رہتے کہ یہ دنیا ایسی کیوں ہے؟ بلرام پور اور اس کے قُرب و جوار کی زندگی، غربت، مفلوک الحالی، سردار جعفری کو مضطرب کر دیتی۔ ظلم وستم کے مختلف واقعات اور حالات کی وجہ سے انہوں نے وہ عیش و آرام کو ترک کر دیا اور مطالعہ کی طرف راغب ہو گئے۔ مگر جب وہ علی گڑھ پہنچے تو انہیں انسانیت کا عملی مظاہرہ کرنے کے مواقع آئے اور ان سے فائدہ اٹھایا اور عملی طور پر اس دور کی مختلف تحریکات میں شامل ہوئے مگر ان کی ان سرگرمیوں کی وجہ سے انگریزی حکومت نے انہیں علی گڑھ سے نکال باہر کیا۔ اس دوران وہ ترقی پسند نظریات سے متاثر ہوئے اور اکابر قلم کاروں کا مطالعہ کیا بالخصوص لینن، گاندھی جی،، نہرو وغیرہ کی سوانح عمریاں پڑھیں اور اس طرح اشتراکی کتابوں کے مطالعے اور منٹو اور مجاز وغیرہ کی صحبت نے انہیں اشتراکی تحریک کی راہ پر ڈال دیا اور انہیں محسوس ہوا کہ ان کی زندگی کا مقصد شاید مل گیا ہے۔ اس طرح وہ مارکسی نظریہ کے حامی ہو گئے اور اس دور میں جس طرح کی، شاعری کی اس میں مارکسی نظریات کی عکاسی نظر آتی ہے۔ مجاز، رشید جہاں، سجاد ظہیر، سبط حسن وغیرہ سے قربت نے ان کے اس نظریے کو مزید پختگی عطا کر دی۔

تمناؤں میں کب تک زندگی الجھائی جائے گی   کھلونے دے کر کب تک مفلسی بہلائی جائے گی
نیا چشمہ ہے پتھر کے شگافوں سے ابلنے کو   زمانہ کس قدر بیتاب ہے کروٹ بدلنے کو

اس طرح وہ باضابطہ ترقی پسند تحریک کا حصہ بنے رہے اور اسی میں انہیں اپنی منزل نظر آنے لگی۔ ۱۹۴۳ء میں ان کا شعری مجموعہ ''پرواز'' منظر عام پر آیا جس میں سردار جعفری کی موضوعاتی نظمیں ملتی

ہیں۔جوانی، سماج، بغاوت، مزدور لڑکیاں، عورت وغیرہ ان کی ابتدائی نظمیں ہیں جن میں انقلاب کی گونج صاف طور پر سنائی دیتی ہے۔

مراجی لگ نہیں سکتا ہے شاہوں کی شبستاں میں
بنایا ہے نشیمن میں نے زخموں کے گلستاں میں
مرے ہونٹوں پہ نغمے کانپتے ہیں دل کے تاروں کے
میں ہولی کھیلتا ہوں خون سے سرمایہ داروں کے
حقیقت سے میری کیوں بے خبر دنیائے فانی
بغاوت میرا مذہب میرا مسلک جوانی

(نظم: جوانی)

صدف کو خوبی قسمت سے تو مل جاتی صدف کے سینہ روشن میں اک گہر ہوتی
ترا نزول جو ہوتا سوادِ گلشن میں نہالِ فصلِ بہاراں کا اک ثمر ہوتی
گر ہواؤں کے آغوش میں جگہ پاتی تو رقصِ شعلہ و بیبا کی کی شرر ہوتی

(نظم: عورت)

اوراس اندھیرے میں / سولیو کے سائے میں / انقلاب پلتا ہے / تیرگی کے کانٹوں پر / آفتاب چلتا ہے۔ (نظم: بغاوت)

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر سردار جعفری نے مستقل عنوانات پر مختصر اور طویل نظمیں کہیں اور اس طرح اردو شاعری میں مقصدی اور موضوعاتی نظموں کو اہمیت حاصل ہوگئی۔جن موضوعات کو علی سردار جعفری نے اپنی تخلیقات میں برتا ان میں فاشزم کی مخالفت، اشتراکی نظام کی حمایت، انقلاب کا خیر مقدم، امن پسندی، آزادی، انقلاب، بغاوت، سرمایہ داری کی مخالفت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ترقی پسند تحریک کا مقصد ایک غیر طبقاتی نظام اور معاشرے کی تشکیل تھا چنانچہ اس مقصد کے تحت اردو شاعری میں انقلاب پسندی اور حقیقت نگاری کو مقبولیت حاصل ہوئی۔انقلاب پسندی کے زیر اثر شاعری میں ایسی بہت سی نظمیں لکھی گئیں جس میں بغاوت کا پیغام دیا گیا، مجاز کی نظم ''انقلاب'' جاں نثار کی نظم ''ساقی''، جذبی کی نظم ''دعوت انقلاب'' وغیرہ اس کی

بہترین مثالیں ہیں۔ سردار جعفری کی کئی نظموں میں انقلاب اور حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ غربت، افلاس، بھوک، ظلم وستم،، بغاوت، غلامی، آزادی خواب امن وغیرہ جیسے موضوعات کی عکاسی ملتی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی چند نظموں کے مطالعہ سے ان کے شعری مزاج کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے :

گردشِ چرغ و دورِ جام بھی ہے — تیز رو بھی سبک خرام بھی ہے
ارتقاء میں ہے انقلاب کا راز — زندگی رقص بھی ہے گام بھی ہے

(نظم: زندگی)

آج ٹکراتے ہیں ایوان حکومت سے عوام — آج شاعر کی زبان پر ہے بغاوت کا پیام
آج ہر گام پہ سو سرخ علم لہراؤ — گاؤ استالن ولینن کے ترانے گاؤ

(نظم: جشن بغاوت)

اٹھو اور اٹھ کے انھیں قافلہ میں مل جاؤ — جو منزلوں کو ہیں گردِ سفر بنائے ہوئے
قدم بڑھائے ہوئے اے مجاہدین وطن — مجاہدین وطن ہاں قدم بڑھائے ہوئے

(نئی دنیا کو سلام)

سردار جعفری بنیادی طور پر شاعر ہیں ان کی دیگر خدمات بھی ناقابل فراموش رہی ہیں۔ وہ بحیثیت شاعر زندگی کی اعلیٰ اقدار، انسانیت، روشن خیالی، امن ومحبت، رواداری اور حقیقی زندگی کی خوبصورت نقاشی کرتے ہیں اور وہ اپنی شاعری کو ترقی پسند نظریات کی اشاعت کے لئے ایک موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ ان کے یہاں اردو کی شعری روایت کا سرمایہ موجود تھا جس سے انہوں نے کماحقہ فیض پایا۔ غالب، اقبال اور جوش سے استفادہ کیا وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر رہے اور غزل کی مخالفت بھی کی مگر غزل کی روایت سے اپنا دامن نہیں بچاسکے۔ انہوں نے نظموں کے ساتھ ساتھ غزل میں بھی حیات کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا۔ ان کی غزل گوئی کے ضمن میں رحمت یوسف زئی اپنے مضمون ''غزل اور سردار جعفری'' میں رقم طراز ہیں:

''سردار جعفری کا شعری مزاج بنیادی طور پر غزل سے متاثر ہے اور اگر انہوں نے اپنے مخصوص انقلابی نظریات کے زیر اثر نظمیں نہ کہہ کر صرف غزلیں ہی کہی ہوتیں تب بھی ان کا مقام اتنا ہی بلند ہوتا جتنا آج ہے''۔

(محیط علی سردار جعفری نمبر، ص ۴۱)

ستم کی تیغ خود دست ستم کاٹ دیتی ہے — ستم رانوں تم اب اپنے عزاخانوں میں آ جاؤ

نگاہیں منتظر ہیں ایک خورشید تمنا کی — ابھی تک جتنے مہر و ماہ آئے ، ناتمام آئے

کتنی فرسودہ ہے یہ جرم وسزا کی دنیا — سرکشی دل کو نیا ذوق گنہگاری دے

نئے زماں ومکاں انقلاب زندہ باد — نئی ہے عمرِ رواں انقلاب زندہ باد

دامن جھٹک کے منزلِ غم سے گزر گیا — اٹھ اٹھ کے دیکھتی رہی گردِ سفر مجھے

سردار جعفری کی غزلوں میں بھی جوش وجنوں کی کارفرمائی نمایاں ہے وہ سیدھی بات کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ پیغام پہنچانے کی تڑپ اور دنیا کو بدلنے کی کوشش ان کی شاعری میں صاف نظر آتی ہے۔ نظموں کی طرف ان کا رجحان زیادہ معلوم ہوتا ہے تاکہ نظم کے فارم میں اپنے انقلابی نظریات کی ترجمانی بہتر طور پر کی جاسکے۔ ان کی اصل پونجی ترقی پسند افکار ونظریات ہیں وہ اس تحریک سے جذباتی وابستگی، عملی مظاہرہ، اور فکری تعلق قائم کرتے ہیں۔ علی سردار جعفری کی شاعری انسان دوستی، روشن خیالی، امن ومحبت، رواداری اور زندگی کے مثبت تصورات کی عکاسی کرتی ہے۔ جنہیں ان کی ترقی پسندی اور روشن خیالی کی عمدہ مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ غرض علی سردار جعفری کے فکر وفن کے مطالعہ سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ خالص ترقی پسندی کی عمدہ مثال کہلائے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر منظور احمد دکنی کا تعلق درس وتدریس سے ہے۔ انھوں نے گلبرگہ میں اردو شاعری کے موضوع پر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ قلم بند کیا ہے جو 2008ء میں شائع ہوکر منظر عام پر آچکا ہے۔ دیگر تصانیف میں 'جزیرے' 'تجربے' شامل ہیں اور 'گیسوئے اردو' کو مرتب کیا ہے۔ قریب 50 مضامین علاقائی، قومی اور بین الاقوامی سطح کے رسائل وجرائد میں شائع ہوچکے ہیں۔ ان کی تصنیف جزیرے کو راجو سو (پراسارانگا) گلبرگہ یونیورسٹی نے انعام سے نوازا ہے اور اسی تصنیف پر بہار اردو اکیڈیمی نے بھی ایوارڈ عطا کیا ہے۔ بزم امان اردو گلبرگہ اور انجمن ترقی اردو (ہند) گلبرگہ شاخ کے رکن ہیں۔ انسٹرکشنل میڈیا سنٹر اردو یونیورسٹی کے لیے تعلیمی ڈاکیومنٹری کی تیاری میں بحیثیت اسوسی ایٹ ڈائرکٹر خدمات انجام دی ہیں۔

علی سردار جعفری اور ترقی پسند تحریک

ظفر عبداللہ دوانی

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی اردو کے ادبی اُفق پر نئے رجحانات اور تحریکات کی جھلمل شروع ہوگئی۔ اردو زبان و ادب کی ترقی میں ان رُجحانات اور تحریکات کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ مختلف النوع، سماجی، اصلاحی اور ادبی تحریکات ہر دور میں سرگرم عمل رہی ہیں۔ اردو ادب میں رونما ہونے والی ان تحریکات نے نہ صرف اردو ادب کے دامن کو مالا مال کیا بلکہ ادب پر طاری ہوئے جمود کو توڑنے میں بھی ایک اہم رول ادا کیا ہے۔

تحریک رُجحان سے زیادہ موثر اور منضبط صورتِ حال کا نام ہے۔ تحریک واضح خدو خال میں خود کو منکشف کرتی ہے اور تیز رفتار دریا کی طرح کسی خاص سمت میں رواں ہوتی ہے۔ پس رجحان جس تغیر کے لئے زمین ہموار کرتا ہے تحریک اُس کی تکمیل کے لئے جنگ لڑتی ہے۔ ہر تحریک اپنا دائرہ عمل خود وضع کرتی ہے۔ تحریک چونکہ انفرادی عمل کم اور اجتماعی زیادہ ہے اسی لیے تحریک کے وسیع اثرات کو معاشرے میں مقبول بنانے کے لیے اجتماعی کوشش بے حد ضروری ہے۔

جب ہم اردو ادب کی کامیاب اور فعال تحریکات کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے سامنے دو بڑی تحریکیں آتی ہے۔ ایک علی گڑھ تحریک جسے سرسید تحریک کے نام سے بھی جانا جاتا ہے اور دوسری ترقی پسند تحریک ۔ یہ دونوں تحریکیں اپنے مقاصد اور دائرے کے لحاظ سے خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان دونوں تحریکوں نے اپنے اپنے عہد میں اردو ادب میں نشاۃ الثانیہ لانے کی کوشش کا فریضہ انجام دیا۔ اردو ادب میں علی گڑھ تحریک کے بعد ترقی پسند تحریک سب سے بڑی اور سب سے منظم تحریک ہے جس کے پاس اپنا ایک منشور اور ادب تخلیق کرنے کے لیے ایک واضح مقصد اور لائحہ عمل تھا۔

۱۹۱۷ میں روس میں انقلاب کا واقعہ تاریخ کا ایک بہت ہی اہم واقعہ ثابت ہوا، اس واقعے نے پوری دُنیا پر اپنے اثرات چھوڑے، لوگ حاکم اور محکوم کا مطلب سمجھنے لگے، انقلاب اور بغاوتیں سر اُٹھانے لگیں دیگر

ممالک کی طرح ہندوستان پر بھی اس واقعے کے اثرات پڑے اور ہندوستان کی آزادی کے لیے جدو جہد میں تیزی آئی۔ آزادی کے حصول کی کوشش اور اس کا جذبہ روز بہ روز بڑھتا گیا۔ اس جذبے کو ترقی پسند تحریک نے مزید قوت اور جلا بخشی۔ ترقی پسند تحریک وہ تحریک تھی جس نے جنگ آزادی میں اہم ترین رول ادا کرنے کے علاوہ اردو زبان و ادب کو بین الاقوامی شہرت، عظمت اور اعتبار بخشا۔ زبان اردو کو نہایت قابل مخلص ذہین قد اور ایماندار ادباء و شعرا اور نقاد دیے۔ جن میں قابل ذکر جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، حیات اللہ انصاری، کرشن چندر، اور احتشام حسین کے ساتھ ساتھ علی سردار جعفری کا نام قابلِ ذکر ہیں۔

علی سردار جعفری ایک متنوع اور ہم گیر شخصیت کے مالک تھے، وہ بیک وقت ایک شاعر، مصنف مرتب، مترجم، خطیب، محقق، ناقد، مفکر، دانشور، صحافی، مجاہدِ آزادی اور ترقی پسند تحریک کے قافلہ سالار تھے۔ انھوں نے اعلیٰ درجہ کی شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں افسانے اور ڈرامے بھی لکھے، ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۳۸ میں ''منزل'' کے نام سے شایع ہوا جب کہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''پرواز'' ۱۹۴۳ میں منظر عام پر آیا۔ علی سردار جعفری نے اپنی شاعری کے ذریعے سے امن کا پیغام دیا، انسانیت کو محبت کا درس دیا، مزدوروں اور مظلوموں کو ہمت و حوصلہ دیا، جبر و استبداد کے خلاف قلم اٹھایا، ان کی زندگی کا مقصد پیار و محبت اور انسان دوستی تھا۔ غلامی کی زنجیروں کو توڑنا، نفرت کی دیواروں کو گرانا، دلوں کو جوڑنا، وطن کو آزاد کرانا اور حقیقی آزادی کو پالینا تھا۔ اس کے لیے قید و بند کی صعوبتیں بھی انہیں اٹھانی پڑیں جس نے ان کی تخلیق اور تحریک کو مزید قوت بخشی۔ جیل کی صعوبتوں نے ان سے ایسا ادب پیش کروایا جسے نمائندہ ادب کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں ان کی نظم 'ایشیا جاگ اٹھا' قابل ذکر ہے، اس نظم کے چند اشعار یوں نمونے کے طور پر پیش ہیں۔

ہم نے دیکھے ہیں بہت ظلم و ستم قہر و عتاب
نوچ لیں گے ہم تمہاری سلطنت کا آفتاب
ہم بھی دیں گے تم کو اب جوتے سے جوتے کا جواب
ہاں بڑے آئے کہیں کے لاٹ صاحب جاؤ جاؤ

ایشیا سے بھاگ جاؤ

لد گئے وہ دن کہ جب آقا تھے تم اور ہم غلام
ہم وہ بے حس تھے کہ تم کو جھک کر کرتے تھے سلام

آج ہم ہیں بد دماغ و بد زبان و بد لگام
سیر کا بدلہ ہے سیر اور پاؤ کا بدلہ ہے پاؤ

ایشیا سے بھاگ جاؤ (۱)

یہ ظلم وستم کے خلاف ان کا شدید ردِعمل تھا، سچ بات یہ کہ سردار جعفری کی شاعری وہیں سے جنم لیتی ہے جہاں وہ جوش وخطابت اور انقلابی آہنگ میں ڈوب جاتے ہیں۔ اس نظم کے بارے میں محمد حسین پر کار لکھتے ہیں۔

''ایشیا جاگ اٹھا اُس ٹھوس سچائی کا شعری پیکر ہے جس میں ایشیا کے ممالک نے طوق غلامی سے نجات پانے اور اپنی دُنیا آپ بسانے کے خواب دیکھے تھے۔ یہ نظم خواب نہیں خواب کی تعبیر لیے ہوئے ہے۔ یہ مظلوم انسانوں کی دبائی ہوئی آواز ہے۔'' (۲)

سردار جعفری نے جس غلامی کے دور میں آنکھیں کھولیں، انقلاب کو بے حد قریب سے دیکھا آہوں اور آنسوؤں کے ساتھ ساتھ زنجیروں اور قید خانوں کو معشوق کی طرح گلے لگایا، وہ جس طرح کا رومانی باغیانہ مزاج رکھتے تھے ایسے میں ان سے اسی طرح کی شاعری کی اُمید کی جاسکتی تھی۔ ایسا نہیں کہ سردار کے یہاں دھیمے لہجے کی شاعری، عشقیہ شاعری نہیں ہے، انھوں نے غزلیں کہیں، خواب دیکھے، رومانی حسرتوں میں ڈوبے طرح طرح کے تجربے بھی کیے، لیکن انسان اور زندگی سے اُوپر اُٹھ کر انھوں نے کبھی نہیں سوچا۔ تخیل وتصور کی دنیا میں وہ کم ہی رہے۔ انھوں نے زندگی کے کھردُرے حقائق، تپش اور تشنہ لبی کو بھی ایک نام اور وقار دیا۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں۔

ہمارے دل کی تپش سے چراغ جلتے ہیں
ہماری تشنہ لبی مے کدے بناتی ہیں

سردار جعفری کی شاعری کا اہم وصف اس کا مقصدی ہونا ہے۔ جو چیز ان کو ہمعصروں میں ممیز کرتی ہے وہ یہ کہ انھوں نے ترقی پسند تحریک کے امیج کو بھرپور اور صحیح طریقے سے پیش کیا۔ ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دوری میں جوش ملیح آبادی اردو شاعری کے سربراہ تھے اور علامہ اقبال اردو شاعری کے بدلتے ہوئے ماحول میں ایک اہم چونکا دینے والی آواز کی حیثیت رکھتے تھے۔ چنانچہ سردار جعفری نے ان دونوں بزرگوں کے اثرات بڑی حد تک قبول کیے ہیں اور ان کی شاعری میں انہیں شعراء کی بلند آہنگی اور ذخیرہ الفاظ کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود سردار جعفری کے یہاں ان کا اپنا لہجہ، غنایت، دل سوزی اور دردمندی بھی نماں طور پر

نظر آتی ہے۔انھوں نے اپنے سامنے بکھری ہوئی اس وسیع و عریض دنیا کے ہر لحظہ بدلتے ہوئے حالات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

سردار جعفری کی شاعری بقول پروفیسر احتشام حسین ''رومان سے انقلاب'' کی شاعری ہے۔انھوں عام طور پر اردو میں مروجہ روایت کے مطابق اپنی شاعری کی ابتداء رومانی شاعری سے کی مگر اپنے انقلابی مزاج اور عصری حالات کے ساتھ اقبال اور جوش کے زیر اثر اردو کے مقبول ترین شعرا میں شامل ہیں،اور پھر مارکس اور لینن کی تعلیمات اور اشتراکی فلسفہ سے متاثر ہوئے جوان کی زندگی کا مقصد اور مشن تھا۔اس سلسلے میں ڈاکٹر علی احمد فاطمی لکھتے ہیں۔

> ''گھر کے مذہبی ماحول نے انھیں تصوف کی سرحدوں تک پہنچا دیا لیکن گاندھی جی کی کتاب ''تلاش حق'' کے مطالعہ نے زندگی کی بعض دیگر جہتوں سے رشتے جوڑنے شروع کر دیے اور سردار کی ترقی پسند فکر اور ایک مخصوص نفسیات میں ڈھلنے لگی۔درمیان میں ادھر اُدھر بہکے لیکن جلد ہی وہ ایک لفظ ''بورژوا'' کی تلاش میں لائبریری پہنچے تو وہ لفظ تو بعد میں ملا لیکن لینن اور مارکس کی کتابیں ہاتھ لگیں ان کا بھر پور مطالعہ کیا اور پھر بقول سردار ہی جو دروازے گاندھی جی کی کتاب پڑھ کر نہرو کی تقریریں کر ذرا ذرا کھلے تھے اور پھر بند ہو گئے تھے اس بار پورے کھل گئے۔'' (۳)

اسی ماحول کے زیر اثر ان کی شاعری کا خمیر تیار ہوا ہے جو آگے چل کر ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی کا سبب بنتا ہے۔شاعری کی اُڑان بھرتے ہی سردار جعفری مکمل طور پر مارکسیت اور اشتراکیت کے زیر سایہ آ چکے تھے،انھوں نے 'سرمایہ دار لڑکیاں اور مزدور لڑکیاں' قسم کی نظمیں بھی لکھیں۔عمر کے تقاضے کے سبب اس وقت ان کی شاعری میں رومانی رنگ موجود تھا مگر اس رنگ میں بھی انقلاب کی ہلکی ہلکی آمیزش تھی،پھر اسی دور میں انھوں نے جوانی،بغاوت،سماج اور بنگال جیسی نظمیں بھی کہیں جن میں اشتراکی و مارکسی نظریات کی تبلیغ و تشہیر ملتی ہے۔عمر اور فکر کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں انقلاب آ چکا تھا اور سردار انقلاب روس کے بھی ترانے گانے لگے مثلاً۔

رُخِ حیات کو بخشیں تجلیاں تو نے بکھیر دی ہیں فضاؤں میں سرخیاں تو نے
شگاف ڈال دیا تاجِ شہریاری میں گرائیں ظلم کے خرمن پہ بجلیاں تو نے (۴)

اشتراکیت کے پرچم تلے رواں دواں شاعر کا انقلابی ذہن جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا احتساب کرتے ہوئے عوام تک جا پہنچا۔ محنت کش اور باعمل عوام کی طرف سردار جعفری نے یہ محسوس کیا۔

زمانے کے انداز بدلے گئے　　　　نئے راگ ہیں ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے　　　　زمین میر و سلطان سے بیزار
گیا دورِ سرمایہ داری گیا　　　　تماشا دِکھا کر مداری گیا (۵)

علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں وہ ترقی پسندانہ، باغیانہ اور احتجاجی نظمیں لکھنے لگے اور تقریریں کرنے لگے تھے۔ اپنی ایک احتجاجی تقریر کے باعث وہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۳۶ میں نکال دیے گئے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی بی اے کی تعلیم اینگلو عربک کالج دہلی میں مکمل کی اور آگے کی تعلیم کے لئے لکھنو یونیورسٹی آ گئے۔ یہ ان کی محنت و مشقت کا نتیجہ تھا کہ پھر پچاس سال کے عرصے کے بعد مسلم یونیورسٹی نے ہی انھیں ڈی۔ لٹ کی ڈگری سے نوازا۔ اس سلسلے میں یوسف ناظم یوں رقم طراز ہیں۔

> ''۱۹۳۶ میں سردار جعفری علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ اپنی کلاس سے زیادہ اسٹوڈنٹس کے جلسوں میں حاضر رہتے تھے اور یہ فیڈریشن کچھ ایسے کاموں میں مشغول و مبتلا رہا کرتی تھی جو ہمارے اس وقت کے حکمرانوں کو ناگوار تھے۔ اس شجر ممنوعہ سے جعفری صاحب کے غیر معمولی شفقت بلکہ تعشق کو دیکھ کر یونیورسٹی کے اربابِ اقتدار اس بات پر مجبور ہو گئے کہ بہشت علم و دانش سے انھیں سفر پر روانہ ہونے کا حکم نہ دیں تو کم سے کم ایسے حالات پیدا کر دیں کہ متعلقہ شخص خود رختِ سفر باندھ لے''۔ (۶)

سردار بحث و مباحثے میں بھی بڑھ چڑھ حصہ لیتے تھے اور طالبِ علمی کے زمانے میں ہی انھوں نے اس فن میں مہارت حاصل کر لی تھی، کئی معرکے سر کیے تھے اور انعامات پائے۔ سردار کی تقریروں میں خطابت اور بحث و تمحیص دونوں طرح کی خصوصیت موجود تھی۔ خطابت کے لطف کے ساتھ ساتھ ان کی گفتگو نہایت مدلل ہوتی تھی۔ انھوں نے اپنے خطیبانا انداز سے لوگوں کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کیا۔ خطابت اور احتجاج کا روپ ان کی شاعری میں بھی واضح طور پر دکھائی دیتا ہے اور پھر یہ احتجاج ان کے ہاں بغاوت کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ اپنی ان تحریری اور تقریری صلاحیتوں کی بنا پر انھوں نے ترقی پسند مصنفین کی انجمن میں اپنی بالادستی قائم کر لی

تھی۔ تقسیم وطن کے بعد جب کمیونسٹ پارٹی کے استحکام کے لیے سجاد ظہیر کو پاکستان بھیجا گیا اور انھیں راولپنڈی سازش کیس میں فیض کے ساتھ گرفتار کیا گیا تو یہاں (ہندوستان) میں ترقی پسند ادبی تحریک کی قیادت سردار جعفری نے ہی سنبھالی۔ الغرض اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک اور سردار جعفری لازم وملزم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سردار جعفری نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ان کی نگاہ ان تلخ حقائق پر بھی تھی جو ایک انسان کو دوسرے انسان کا محکوم اور حاکم بنا دیتے ہیں۔ وہ سماجی عوامل ان پر واضح ہو گئے تھے جن کے سبب ظالم و مظلوم کا المیہ جنم لیتا ہے، جبر و استبداد کے افسانے پرورش پاتے ہیں، آزادی اور غلامی کی کشاکش جوان ہوتی ہے۔ ان سماجی ناانصافیوں سے لڑنے کے لیے حوصلے کی ضرورت اور ہمت درکار تھی تب سردار جعفری یہ سوچ کر کہ حق وصداقت کے لیے جان کی بازی لگادینا انسانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے' انھوں نے جیلوں کی سختیاں سہیں اور ظلم وستم کے خلاف احتجاج کیا۔ ان کی تحریروں میں انقلاب کی خواہش' بغاوت کی ترغیب، انسانی ہاتھوں کا قصیدہ، اشتراکیت، مارکسیت اور سوشلزم کے نظریات جیسے عناصر درآئے جوان کی شخصیت اور فکر وفن کی پہچان بن گئے۔ یہ تمام عناصر ترقی پسندی کی پہچان ہیں جو ان کے سبھی شعری مجموعوں میں کم وبیش موجود ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ اردو دنیا، ستمبر ۲۰۰۰۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ص ۱۹

۲۔ علی سردار جعفری (شخص شاعر اور ادیب)، پروفیسر عبدالستار دہلوی، ص ۱۳۳

۳۔ علی سردار جعفری (شخص شاعر اور ادیب)، پروفیسر عبدالستار دہلوی، ص ۲۹۷

۴۔ علی سردار جعفری (شخص شاعر اور ادیب)، پروفیسر عبدالستار دہلوی، ص ۳۵۴

۵۔ علی سردار جعفری (شخص شاعر اور ادیب)، پروفیسر عبدالستار دہلوی ۳۵۵

۶۔ علی سردار جعفری (شخصیت اور ادبی کارنامے) ڈاکٹر رفعیہ شبنم عابدی، ص ۹۳

ظفر عبداللہ وانی، شعبہ اُردو، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے پی۔ ایچ ڈی اسکالر ہیں۔ انہوں نے ''سہ ماہی رسالہ فکر وتحقیق کی اشاریہ سازی'' کے موضوع پر ایم فل مکمل کیا ہے اور کشمیر میں اُردو افسانے سے متعلق موضوع پر پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے تحقیقی کام کر رہے ہیں۔

مشترکہ کلچر اور سردار جعفری

نورالزماں مظہری

علی سردار جعفری اپنے دور کے عظیم شاعر اور ترقی پسند تحریک کے فعال اور متحرک علمبردار تھے۔ان کی پرورش وپرداخت ایک علمی وادبی گھرانے میں ہوئی۔سردار جعفری کی ۸۷ رسالہ زندگی کا مطالعہ کرنے سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ سردار جعفری جس شخصیت کا نام ہے وہ بہت سی خوبیوں اور خصوصیتوں کی حامل تھی۔وہ خوبیاں اور خصوصیتیں سیاسی، سماجی، تہذیبی وثقافتی، علمی وادبی مختلف جہتوں کو احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

جب ہم سردار جعفری کی شعری خدمات کو ایک نظر میں دیکھتے ہیں تو وہ کچھ اس طرح سے دکھائی دیتی ہیں: پرواز، خون کی لکیر، نئی دنیا کو سلام، امن کا ستارہ، ایشیاء جاگ اٹھا، پتھر کی دیوار، ایک خواب اور، پیراہن شرر، لہو پکارتا ہے۔جبکہ ان کے شعری خدمات ان ناموں سے متعارف ہیں: ترقی پسند ادب، لکھنؤ کی پانچ راتیں، پیغمبران سخن، اقبال شناسی، غالب اور ان کی شاعری (انگریزی)۔اور ان کے تدوین وترتیب کے کارناموں کو: دیوان غالب، دیوان میر، کبیر وانی، پریم وانی جیسے ناموں سے شہرت حاصل ہوئی پر انھوں نے مختلف ایوارڈ اور اعزازات بھی حاصل کیے جیسے: سیویت لینڈ نہرو ایوارڈ ۱۹۶۰ء پدم شری ایوارڈ ۱۹۶۷ء، جواہر لال نہرو فیلوشپ ۱۹۶۹ء، سجاد ظہیر ایوارڈ ۱۹۷۴ء، اترپردیش اکیڈمی ایوارڈ ۱۹۷۹ء، ۱۹۷۷ء، اقبال میڈل (پاکستان) ۱۹۷۸ء، مخدوم ایوارڈ ۱۹۸۰ء، میر تقی میر ایوارڈ ۱۹۸۲ء، کمار آسن ایوارڈ ۱۹۸۳ء، ہندروس دوستی میڈل ۱۹۸۴ء، وغیرہ یہ ایوارڈ اور اعزازات آج بھی سردار جعفری کی کامیاب زندگی پر نغمہ سنج ہیں۔سردار جعفری کی تہذیبی اور ادبی سرگرمیوں پر طائرانہ نظر ڈالی جائے اور ان کی بنائی ہوئی ڈاکیومنٹری فلموں کا جائزہ لیا جائے تو وہ مشترکہ کلچر کے عمل برداری کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ان کی فلموں کے نام اس طرح سے ہیں: پھر بولوا ے سنت کبیر، ڈاکٹر اقبال، ہندوستان ہمارا ہے، جدوجہد آزادی کے سولہ سال، جدوجہد آزادی، جھن بولت ہے زنجیر۔انھیں مختلف اداروں کی رکنیت بھی حاصل تھی جیسے بمبئی یونیورسٹی، ممبئی جموں یونیورسیٹی، جموں اور آل انڈیا

اقبال تقریبات کے جنرل سکریٹری، ترقی پسند مصنفین کے صدر، آل انڈیا ریڈیو اور ٹی وی کے اعزازی پرڈیوسر بھی تھے۔ان تمام عہدوں سے ان کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا۔

سردار جعفری اردو زبان وادب کے سچے خادم تھے اور انھیں اس زبان سے دلی لگاؤ اور ہمدردی بھی تھی اس کی تصدیق اس واقعہ سے کی جاسکتی ہے کہ جب سابق وزیر اعظم انھیں ان کی علمی اور ادبی خدمات کے سلسلے میں گیان پیٹھ جیسے عظیم ایوارڈ سے سرفراز کر رہے تھے تو سردار جعفری نے عین موقعہ پر اس وقت کے وزیر اعظم کو مخاطب کرتے ہوئے انتہائی ہمدردانہ لب ولہجہ میں کہا تھا کہ جس زبان کے شاعر کو آپ یہ انعام دے رہے ہیں خود وہ زبان آج آپ سے انصاف اور اپنا جائز مقام پانے کی منتظر ہے۔ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ غالب کے قدیم مکان کو قومی اثاثہ قرار دیا جائے۔

سردار جعفری انشاء پرداز، ڈرامہ نگار، عمدہ صحافی اور تنقید نگار بھی تھے۔ پروفیسر شارب ردولوی سردار جعفری کی تنقید نگاری کے تعلق سے تحریر کرتے ہیں:

''سردار جعفری کو ایک بلند پایہ شاعر اور ترقی پسند تحریک کے علم بردار کی حیثیت سے جو شہرت اور مقبولیت ملی وہ ایک ناقد کی حیثیت سے نہیں ملی۔ایک ناقد کی حیثیت سے اگر کبھی کوئی حوالہ آیا بھی تو وہ ان کی کتاب 'ترقی پسند ادب' کے مباحث میں کھو کر رہ گیا۔وہ بنیادی طور پر شاعر تھے انھوں نے خود بھی اصطلاحی معنوں میں نقاد کی حیثیت سے کبھی خود کو ظاہر (project) نہیں کیا۔حالانکہ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ بہت سے سکہ بند ناقدوں کی تحریروں سے زیادہ وقیع ہے۔دراصل سردار جعفری کو بہ حیثیت ناقد سمجھنے میں اسی لیے دشواری ہوئی کہ وہ اپنی نثری تحریروں میں اپنی شاعرانہ شخصیت سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔اسی لیے اردو کے ناقدوں نے بھی ان کی طرف توجہ نہیں دی جو تنقید سے زیادہ نظریہ سازی کے شکار تھے۔'' (ماہنامہ آجکل نئی دہلی، اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص:۱۳)

سردار جعفری اردو اور ہندی کو دو بہنوں کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور وہ قطعی اس کے قائل نہیں ہیں ان دو بہنوں کے درمیان تفریق ہو، وہ ان دونوں زبانوں کے تہذیب اور ثقافتی ورثہ کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔اس سلسلے میں سید شاہد مہدی رقمطراز ہیں:

''وہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کے خواہش مند تھے اور عملی طور پر اس سلسلے میں بے حد فعال تھے۔'' (سرمایۂ سخن ص:۹، مکتبہ جامعہ، دہلی)

سردار جعفری کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ مشترکہ تہذیب کی پرزور وکالت کرتے ہیں اور مشترکہ تہذیبوں کے سلسلے میں کسی بھی قسم کی تنگ نظری اور تعصب پسند نہیں کرتے ہیں اور اس کی پرزور مخالفت کرتے ہیں۔ چنانچہ سردار جعفری کبیر کے تعلق سے رقمطراز ہیں:

''ایران کے صوفی شعرا عطار، رومی اور حافظ کی فکر نے ہندوستان کی فکر کو جس حد تک متاثر کیا ہے، ان کے درمیان کتنی مشترک قدریں ہیں اور اثرات کی بہتی ہوئی گنگا جمنا کبیر کی شاعری میں کتنا حسین سنگم حاصل کرتی ہے۔ صرف اس طرح تفریق اور نفرت کی وہ دیواریں گرائی جاسکتی ہیں جنھیں کبیر نے ڈھادیا تھا، لیکن ان کے بعد کی نسلوں نے پھر اونچا اٹھادیا۔ اس پر لڑنے مرنے والے کہ کبیر لنگی پہنتے تھے یا دھوتی باندھتے تھے، یہ بھول جاتے ہیں کہ اصلیت میں کبیر برہنگی میں ہے۔ جس نے معنی کے جسم سے لفظوں کے پردے اٹھادیے ہو اور رام اور رحیم کو ایک کر دکھایا ہو اس کو سوت اور کپاس کا لباس پہنانے کی کوشش اور اس لباس پر منافقت اور نفرت انگیزی کتنی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے''۔ (پیغمبران سخن، ص: ۲۰۔۱۹)

دراصل سردار جعفری روایتوں اور تہذیبوں کے پاسدار ہی نہیں بلکہ وہ تہذیبوں اور روایتوں کے امین بھی ہیں یہی وجہ ہے کہ جب وہ کبیر داس کا شاعر کی بحیثیت سے جائزہ لیتے ہیں تو ان کا زاویہ نظر دوسروں سے منفرد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

''اردو میں کبیر کا ذکر تو بہت ہوا ہے مگر کبیر کی روایت کو اردو والوں نے کبھی اپنایا نہیں۔ یہ کوئی انوکھی بات بھی نہیں۔ اردو نے کھڑی بولی سے ایسا جنم مرن کا رشتہ جوڑا کہ دوسری سبھی بولیوں سے بے نیاز ہوگئی۔ پھر بعد کو بھارتیندو کے زیر اثر ہندی بقول ان کے ''جب نئے سانچے میں ڈھلی'' تو کبیر اور میرا ہی کا ذکر کیا ہے! عبدالقدوس گنگوہی ہوں یا خود سید محمد جائسی یا خان خاناں ہوں جو رحیم کی کے تخلص سے شاعری کرتے تھے یا انشاء اللہ خاں انشاء کی رانی کیتکی کی کہانی ہو یا پھر امیر خسرو کا ہندی کلام۔ ان سب کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی اور بول بالا صرف کرشن بھگتی اور رام بھگتی کا ہی رہا۔ اس میں بھی میرا بائی کے جیسی بھگتی کی شاعری کا درجہ بھی دوسرے کرشن بھگتوں سے نیچے ہی رہا۔ سردار جعفری نے البتہ ان دونوں کو چنا تو دوسرے نقطہ نظر سے انتخاب کیا۔''

(ماہنامہ آجکل نئی دہلی، اکتوبر ۲۰۰۰، ص: ۱۰)

سردار جعفری نے اپنی ساری زندگی روایتوں، تہذیبوں اور اقدار انسانی کی تحفظ و بقا کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے کسی بھی ناانصافی سے سمجھوتہ نہیں کیا اور ظلم و زیادتیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔

سردار جعفری کبیر، میر اور غالب کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے اردو اور ہندی والوں کو ان کے تعصب ذہنی اور تنگ نظری پر اپنے سخت تیور میں نصیحت کر کے انھیں اصل آئینہ دکھاتے ہیں اور ان الفاظ میں گویا ہوتے ہیں:

''کبیر، میر اور غالب تینوں شاعر میرے نزدیک ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ یہ اردو والوں کی کوتاہ نظری تھی کہ انھوں نے قطب شاہی اور اس سے پہلے کی دکنی شاعری کو تو اردو ادب کی میراث کی حیثیت سے قبول کیا۔ لیکن کبیر سے پہلوتہی کی اور ہندی والوں کی تنگ نظری نے کھڑی بولی کی نکھری ہوئی شکل کے دو سب سے بڑے شاعر میر اور غالب کو ہندی کا رتن ماننے سے انکار کر دیا۔ اور اردو کی حق تلفی کے لیے کبھی کبھی انھیں ہندی کا شاعر مانا جاتا ہے۔ لیکن اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہونے کا جب سوال اٹھتا ہے تو بڑی شدت سے اس کی مخالفت کی جاتی ہے۔ حالانکہ اب اردو اور ہندی دونوں مستقل زبانیں بن چکی ہیں۔ لیکن میراث میں کچھ مشترکہ قدریں شامل ہیں۔'' (پیغمبران سخن، ص:۸)

سردار جعفری مشترکہ تہذیب کے اتنے پاسدار ہیں کہ وہ مغربی تہذیب سے بھی استفادہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور کچھ صوفیوں اور بھگتوں کی روایتوں کے ساتھ کبیر، میر اور غالب کو بڑی حد تک اہمیت دیتے ہیں۔ جیسا کہ آگے وہ تحریر کرتے ہیں:

''آج جبکہ ہندوستان کے بعض حلقے تنگ نظری کا ثبوت دے رہے ہیں اور ایک محدود تہذیبی تصور کو فروغ دینے کی فکر میں تو قومیت کے ایک صالح تصور پر اصرار کرنے کے لیے جس کے اندر ہندوستان کے مزاج کو وسعت ہو، یہ ضروری ہے کہ ایک طرف موجودہ مغربی سائنس سے استفادہ کیا جائے اور دوسری طرف اپنے ملک اور قوم کی وسیع القلبی کی روایتوں کو یاد رکھا جائے۔ جدید عہد کے سیاسی، انقلابی تحریکوں کو مزید تقویت حاصل کرنے کے لیے قرون وسطی کی انقلابی فکر سے رشتہ جوڑنا چاہیے۔ اس منزل میں صوفیوں اور بھگتوں کی روایتوں کے ساتھ ساتھ کبیر، میر اور غالب ہمارے لیے اہم ہیں۔'' (پیغمبران سخن، ص:۸)

سردار جعفری نے اپنی قوم، ملک، سماج کی ترقی، عوام کے فلاح و بہبود، انسانی قدروں کی پاسداری اور سماجی کشمکش کو ختم کرنے کے لیے ہمیں جدو جہد کرنے کی دعوت دی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''اپنے خوابوں کو حقیقت بنانے کے لیے موجودہ حقیقت کا مطالعہ ضروری ہے۔ جسے ہم بدلنا چاہتے ہیں۔ سماجی کشمکش اور اس کی جڑوں تک پہنچنا ضروری ہے۔ اور ان عوام کے ہاتھوں میں ہاتھ دینا ضروری ہے جو ہمارے خوابوں کو اپنے کھردرے ہاتھوں سے تراش کر حقیقت کا حسین اور پر شکوہ تیار کریں گے۔ اور یہ کام بظاہر جتنا آسان معلوم ہوتا ہے اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے سوز و گداز کی ضرورت ہے۔ جو انسانوں سے بے پناہ محبت اور خلوص سے پیدا ہوتا ہے۔ جو عوام کے دلوں کی دھڑکنوں میں کھو جانے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اس کے لیے اپنے کتب خانوں اور شیش محلوں سے باہر نکلنے اور شہرت اور عظمت کے کے بلند میناروں سے نیچے اتر کر وسیع انسانیت کے سمندروں میں تیرنا ضروری ہے۔''

(ترقی پسند ادب، ص: ۴۹، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۵۱ء)

آخر میں علی سردار جعفری کی ہمہ جہت شخصیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اپنی بات ان کے اس شعر پر ختم کرتے ہیں جس کو انھوں نے ۱۹۹۶ء میں لکھنؤ میں اپنے ایک دوست کی اہلیہ کے انتقال پر کہا تھا ؎

ڈھونڈنے والے تجھے ڈھونڈ کے تھک جائیں گے
بزم فطرت کی کسی شے میں نہ پائیں گے سراغ

نورالزماں مظہری کا تعلق بھوپال سے ہے۔ انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے بی۔ اے اور ڈپلومہ اور ایڈوانس ڈپلوما کیا ہے۔ اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے کالج آف ٹیچر ایجوکیشن بھوپال سے بی۔ ایڈ کی ڈگری حاصل کی ہے۔

علی سردار جعفری کے شعری عوامل اور جہتیں

پروفیسر محمد ظفر الدین

علی سردار جعفری (29 نومبر 1913 بلرام پور، یو پی، یکم اگست 2000ء ممبئی) کا تخلیقی سفر اُن کی شعری کائنات سے عبارت ہے۔ گرچہ اُنہوں نے ادبی رخت سفر افسانہ نگاری کے ساتھ باندھا تھا اور اُن کی نثری تحریریں بھی مسلسل حلقہ علم و ادب میں دستک دیتی رہیں لیکن اُن کی بنیادی شناخت ایک شاعر کی حیثیت سے قائم و دائم ہے۔ البتہ ترقی پسندی اُن کے مزاج، تفکر اور شب و روز کا حصہ رہی ہے جس کا احساس اُن کی شاعری، منشور کارناموں اور زندگی کی ہر ایک حرکت و عمل میں واضح اور نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ اُنہوں نے اپنی نظموں کا مواد بھی ترقی پسند تحریک کے اصول اور منشور سے حاصل کیا ہے۔ اُن کی شاعری پر شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کا رنگ گہرا ہے۔ اُن کی شاعری خطابت اور نظریاتی پاسداری کے ساتھ شعری حسن اور فنی بلندیوں سے مزین ہے۔ رومان سے انقلاب تک، آنسوؤں کے چراغ، ہاتھوں کا ترانہ، نئی دنیا کو سلام، پتھر کی دیوار، ایشیا جاگ اُٹھا، میرے خواب اور نوالا اُن کی معروف نظمیں ہیں۔

علی سردار جعفری کی شخصیت اور شاعری کا خمیر اُن کے گاؤں اور خود اپنے خاندان میں تیار ہوا تھا۔ وہ جاگیردارانہ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ بچپن ہی سے اُنہوں نے اپنے اردگرد جو ماحول دیکھا وہ ظلم و جبر اور زیادتیوں کا ماحول تھا۔ ''ہرواہی'' کے نام پر خاندان در خاندان بندھوا مزدوری کا رواج تھا۔ اُن کے والد اور چچا سے تو اُنہیں شکایت نہ تھی اس لیے کہ وہ ملازم پیشہ تھے اور اپنی ملازمت ایمانداری سے انجام دیا کرتے تھے۔ مگر بعض معاملات میں وہ بھی اپنے دیگر رشتہ داروں اور اقربا کے ساتھ مظالم اور ناانصافیوں کو روایت اور رسم و رواج کے طور پر انجام دیا کرتے تھے۔ سردار کے بہنوئی کا معاملہ کچھ زیادہ ہی سخت تھا۔ یہ سبھی معاملات سردار کو بچپن ہی سے ناگوار معلوم ہوتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مجھے اس سوال نے کبھی پریشان نہیں کیا کہ یہ دُنیا کیوں ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ لیکن اس سوال نے ہمیشہ بے چین رکھا کہ یہ دُنیا ایسی کیوں ہے۔ اور اس کی ابتدا میرے بچپن ہی میں ہوگئی تھی۔''

(فن اور شخصیت' آپ بیتی نمبر' مارچ 1980)

سردار جعفری کے بچپن کے بے شمار واقعات ہیں' جنہیں خود انہوں نے بیان کیا ہے' جن کی وجہ سے ان کی شخصیت میں سوالات اور شکوک وشبہات پیدا ہونے لگے تھے۔ اور انہیں امیری و مالداری اور عیش وعشرت کی ہر علامت سے نفرت ہونے لگی تھی۔ سردار کے خاندان کا ایک پس منظر یہ بھی رہا کہ ان کے یہاں مجلسوں اور محفلوں کا بڑا رواج تھا۔ انہیں ابتدائے عمر ہی سے بڑے بڑے ذاکروں اور خطیب حضرات کو سننے کا موقع ملا۔ دوسری طرف اشرافیہ کے یہاں شعروشاعری کی عام فضا ہوتی تھی۔ بچوں کو مراثی پڑھنے کی تربیت دی جاتی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ کلمہ اور تکبیر کے بعد شاید میرے کانوں نے پہلی آواز انیسؔ کی سنی ہے۔ میں شاید پانچ چھ برس کی عمر سے منبر پر بیٹھ کر سلام اور مرثیے پڑھنے لگا تھا۔ سلام اور مرثیوں کے علاوہ ویسے بھی مجھے بے شمار اشعار یاد تھے۔

شاید اسی کا اثر تھا کہ میں نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں خود مرثیے کہنے شروع کر دیے تھے۔ اور مرثیوں کا اثر آج بھی میری شاعری پر باقی ہے۔ ان کی زبان' تشبیہ' استعارے' ترتیب ہر چیز انیسؔ کی تھی۔ میرا اپنا کچھ نہیں تھا۔ میں ساٹھ ساٹھ' ستر ستر بند لکھ جاتا تھا لیکن مرثیہ ختم نہیں کر پاتا تھا۔''

(فن اور شخصیت: آپ بیتی نمبر)

یہی وہ عوامل اور پس منظر تھے جس کے تحت سردار جعفری نے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ اُن پر انیس کے بہت زیادہ اثرات تھے۔ یہ اثرات بعد میں ان کی نثر میں بھی بہت واضح دکھائی دیتے ہیں جہاں منظر نگاری' محاکات نگاری' پیکر تراشی' شکوہ الفاظ اور تشبیہات واستعارات کا خوبصورت استعمال جا بجا ملتا ہے۔ انہیں خصوصیات کی جب توسیع ہوئی تو یہ کہا گیا کہ ان پر حضرت جوش ملیح آبادی کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ سردار کی شاعری میں جوش وولولے اور حقیقت کی عکاسی فطری طور پر ملتی ہے جو ترقی پسند تحریک کے تحت مزید دھار دار ہوگئی۔ اُن کی شاعری کا مرکز ومنبع ترقی پسند تحریک اور اس کا منشور تھا تاہم سردار کی جمالیات پسندی اور تخلیقی وجدان ان کی شاعری کو بلندی عطا کرتا رہا۔ محمد علی صدیقی لکھتے ہیں:

''آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سردار ترقی پسند تحریک کے مقرر کردہ معیارات پر پورے نہ اُترتے رہے ہوں بلکہ سردار جعفری کے شعری سفر کی خاص بات یہ ہے کہ اُنہوں نے نظریاتی بنیاد پر شکایتوں اور وسوسوں کے زمانے میں بہتر شاعری کی اور اپنے اوائلی دور کی براہ راست شاعری کے بجائے استعاراتی زبان کا زیادہ استعمال کیا۔علی سردار جعفری کی شاعری ترقی پسند تحریک کی تاسیس کے وقت کی ذہنی فضا' نازی ازم اور جمہوریت کے مابین مبارزہ آرائی کے حوالے سے جنگ عظیم کی اہمیت' آزادی کی تڑپ' سامراج کے خلاف توانا آواز' اندرونی استحصالی ڈھانچہ میں سامراج کے حلیف طبقے کے خلاف غم وغصہ' آزادی اور آزادی موہوم کے مابین فرق، انسانی اخوت اور بین الاقوامی امن کے عنوانات کے گرد گھومتی رہتی ہے۔'' (افکار کراچی۔سردار جعفری نمبر۔نومبر دسمبر 1991ء)

سردار جعفری غالباً ہندوستان کے ایسے واحد شاعر ہیں جنہوں نے عظیم اکتوبر انقلاب' اُس کے رہنما لینن اور سوویت اشتراکی سماج پر سب سے زیادہ نظمیں کہیں۔اُنہوں نے انقلابیوں کی ستائش' سرخ سپاہیوں کی حوصلہ افزائی اور راہ انقلاب میں جاں بحق ہونے والے سپاہیوں کو خراج عقیدت اور تحسین کے لیے شاہکار نظموں کو زبان دی ہے۔اُنہوں نے اپنے کم بیش ستر سالہ شعری سفر میں موضوعات' ہیئت اور محرکات کی سطح پر کئی تجربے کیے اور شاعری کی زبان اور تخیلی فضا بھی بدلتے رہے۔اُنہوں نے جہاں چار چھ مصرعوں کی نظمیں لکھی ہیں وہیں ان کی نظموں کی فہرست میں کئی طویل نظمیں بھی شامل ہیں جو تمثیل اور ڈرامائی اظہار کی قوت سے مملو ہیں۔اُن کی نظم نوالا کے اشعار دیکھئے:

ماں ہے ریشم کے کارخانے میں　　　باپ مصروف سوتی مل میں ہے
کوکھ سے ماں کی جب سے نکلا ہے　　　بچہ کھولی کے کالے دل میں ہے
جب یہاں سے نکل کے جائے گا　　　کارخانوں کے کام آئے گا
اپنے مجبور پیٹ کی خاطر　　　بھوک سرمائے کی بڑھائے گا

''انقلاب روس'' میں کہتے ہیں:

جہانِ پیر کی طرح کہن بدل ڈالی　　　مٹائے فرقہ وطبقات کے نشاں تو نے
عنانِ وقت ہے محنت کشوں کے ہاتھوں میں　　　یہ راز وہ ہے جسے کردیا عیاں تو نے
بجھے بجھے سے پڑے تھے جو رہ گزاروں میں　　　بنا دیا انہیں ذروں کو کہکشاں تو نے

یا پھر 'سُرخ سپاہی کا خط اپنی بیوی کے نام' کا یہ شعر:

عالمِ ہستی کا دل دادہ ہوں میں　　پھر یہ کیوں مرنے پہ آمادہ ہوں میں

سردار جعفری کے یہاں ہاتھوں اور انگلیوں کا ایک خاص تصور ہے جسے وہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں جگہ جگہ پیش کرتے ہیں۔ اُن کا ماننا ہے کہ مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھوں کی بدولت ہی کائنات میں رنگ ہے۔ یہ کام گار ہاتھ نہ ہوتے تو جہانِ رنگ و بو میں کوئی رونق نہ ہوتی۔ ہاتھ ہی تعمیر و تخلیق کا کام کرتے ہیں مگر افسوس کہ ان ہاتھوں کو وہ عزت حاصل نہیں جس کے یہ حقدار ہیں۔ ''ہاتھوں کا ترانہ'' کے اشعار تو زبان زد ہو کر رہ گئے ہیں:

ان ہاتھوں کی تعظیم کرو　　ان ہاتھوں کی تکریم کرو

دُنیا کے چلانے والے ہیں　　ان ہاتھوں کو تسلیم کرو

لیکن ہاتھوں کا ذکر ایک رومانی کیفیت کے ساتھ اُن کی نثر میں بھی ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مجھے انسانی ہاتھ بڑے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی جنبش میں ترنم ہے اور خاموشی میں شاعری۔ ان کی انگلیوں سے تخلیق کی گنگا بہتی ہے۔ یہ وہ فرشتے ہیں جو دل و دماغ کے عرش بریں سے وحی و الہام لے کر کاغذ کی حقیر سطح پر نازل ہوتے ہیں اور اس پر اپنے لافانی نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کاغذوں کو دنیا نظم اور افسانہ، مقالہ اور کتاب کہہ کر آنکھوں سے لگاتی ہے اور ان سے روحانی تسکین حاصل کرتی ہے۔ انسان کے تسلسل میں حیاتیاتی عمل کارفرما ہے جو باپ سے بیٹے کی شکل اختیار کرتا ہے لیکن انسانیت کا تسلسل ہاتھوں کی تخلیق کا رہین منت ہے۔ یہ تخلیق بظاہر بے جان ہوتی ہے لیکن جانداروں سے زیادہ جاندار ہوتی ہے۔ ہاتھوں کے بغیر نہ جنگ ممکن ہے نہ امن۔ محبت ممکن ہے نہ نفرت ....''

(فن اور شخصیت آپ بیتی نمبر)

اُنہوں نے اس طرح کی اور کئی تحریریں پیش کی ہیں جن سے ہاتھوں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

سردار جعفری کے یہاں فن اور موضوعات دونوں ہی کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ موضوعات کا تعلق تو اُن کے مخصوص نظریے سے ہوتا تھا تاہم وہ ہر گام پر شاعری کو فنی بلندیوں تک لے جاتے رہے۔ اُن کی شاعری کی ایک اہم جہت امیجری یا پیکر تراشی ہے۔ بقول رفعیہ شبنم عابدی:

''اگر سردار جعفری کے کلام کا بغور مطالعہ کریں تو پتہ چلے گا کہ ان کی شاعری میں جو سب سے نمایاں خصوصیت نظر آتی ہے۔ وہ امیجری یا پیکر تراشی کا استعمال ہے۔''

(افکار کراچی۔ سردار جعفری نمبر۔ نومبر دسمبر 1991ء)

چند مثالیں ملاحظہ کیجیے کہ کس طرح سردار نے غیر مرئی یا مرئی اشیا کے پیکر تراشے ہیں:

اودھ کی خاکِ حسیں کے ذرے بگولے بن کر مچل رہے ہیں
اب آنسوؤں کی پرانی جھیلوں سے سرخ شعلے ابل رہے ہیں (اودھ کی خاکِ حسیں)

نئی دُنیا کو سلام' سردار جعفری کی طویل نظم ہے جس میں ہیئت کے تجربے کیے گئے ہیں۔ یہ نظم بھی پیکر تراشی کے بے شمار نمونوں سے بھری پڑی ہے:

دن آہستہ آہستہ ڈھلنے لگا تھا فضاؤں میں سونا پگھلنے لگا تھا
اُفق پر کرن خواب سا بن رہی تھی دوپٹے کو اپنے شفق چن رہی تھی

ایک غزل کے اشعار جن میں پیکر تراشی کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں:

کتنی آشاؤں کی لاشیں سوکھیں دل کے آنگن میں
کتنے سورج ڈوب گئے ہیں چہروں کے پیلے پن میں
بچوں کے میٹھے ہونٹوں پر پیاس کی سوکھی ریت جمی
دودھ کی دھاریں گائے کے تھن سے گر گئیں ناگوں کے پھن میں

اسی طرح سردار جعفری کے یہاں مختلف شعری جہات دیکھنے کو ملتی ہیں جن میں موضوع' ہیئت اور فن ہر سطح پر انہوں نے کامیاب تجربے کیے ہیں۔ گرچہ اُن کی پوری شاعری ترقی پسند تحریک کے مقاصد سے عبارت ہے لیکن شعری لب ولہجہ کی شیرینیت' صنعتوں کا خوبصورت استعمال' اشاریت وایمائیت اور دیگر فنی امتیازات اُنہیں کئی ترقی پسند شعرا سے ممیز وممتاز کرتی ہیں۔

پروفیسر محمد ظفر الدین: پروفیسر و ڈائرکٹر، مرکز برائے اردو زبان، ادب و ثقافت۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کالج (قدیم دلّی کالج) کے گریجویٹ اور کروڑی مل کالج کے پوسٹ گریجویٹ ہیں۔ وہیں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے معروف ترقی پسند ناقد پروفیسر قمر رئیس کی نگرانی میں بالترتیب بابا نیاز حیدر اور ناول کے فن اور تکنیک کے موضوع پر ایم فل (1992) اور پی۔ ایچ ڈی (1996) مکمل کی۔ انھوں نے پبلک ریلیشنز، اور صحافت و ابلاغ عامہ میں بھی ڈگریاں حاصل کی ہیں اور صحافت کے موضوع پر یوجی سی کا میجر ریسرچ پراجکٹ مکمل کر چکے ہیں۔ اردو ادب کے ساتھ صحافت اور ترجمہ اُن کے مطالعہ کے خصوصی میدان ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں مختلف اہم عہدوں پر خدمات انجام دے چکے ہیں۔

ترقی پسند غزل اور سردار جعفری

ڈاکٹر امام اعظم

اردو غزل ہماری تہذیب کا اٹوٹ حصہ ہے۔ غزل کی تاریخ کے حوالے سے ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ غزل ہماری تہذیب میں اور ہماری تہذیب غزل میں مضمر ہے۔ غزل کی اسی خوبی کی بنا پر رشید احمد صدیقی نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ دراصل فنونِ لطیفہ میں شاعری کی جو اہمیت ہے، وہی اہمیت و افادیت صنفِ شاعری میں غزل کو حاصل ہے۔ اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے غزل کو اردو شاعری میں وہ مقام حاصل ہے جہاں دوسری اصنافِ سخن کی رسائی ممکن نہیں۔ اس کی غنائیت و موسیقیت نے دیگر زبانوں کے اربابِ ادب واہلِ ذوق کو اپنا گرویدہ بنایا ہے۔ آج دیگر زبانوں میں بھی غزلیں لکھی جارہی ہیں۔ عبادت بریلوی ''غزل اور مطالعۂ غزل'' میں اس کی مقبولیت پر رقم طراز ہیں :

> ''غزل کو ہماری زندگی کے ہر دور میں قبولِ عام کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس نے خواص کی محفلوں میں جگہ بنائی ہے۔ عوام کے دلوں میں گھر کیا ہے۔ حال وقال کی دنیا کے لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے ہیں۔ اسی لئے وہ زندگی کے ہر شعبے کا ایک جز معلوم ہوتا ہے۔ جس کو اس سے جدا کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھا جاسکتا۔''

غزل میں زندگی کے تمام ترکیف وکم کو نچوڑ کر اس کا عطر، اپنے الفاظ واشارات میں سمیٹ لینے کا فن موجود ہے۔ فنی وفکری اعتبار سے دنیا کی کوئی شاعری غزل کو پسِ پشت نہ ڈال سکی۔ ایمائیت اور تہہ داری کے ساتھ موضوعاتی رنگارنگی کے سبب جو محویت، محبوبیت اور عمومیت غزل کی فضا میں ابھرتی ہے، وہ کسی اور صنفِ سخن میں نہیں، خواہ حسن وعشق کے معاملات ہوں یا وارداتِ قلبی کے مشاہدات یا دل لگی کے تجربات ہوں یا تصوف کے رموز ونکات، حکیمانہ خیالات ہوں یا سیاسی اور عصری حسیت کے تجربات، غزل کے گداز لب ولہجے میں ظہور پا کر ہمیشہ عوام پسند رہے ہیں۔ یوں تو تمام شاعری انسانوں کے مختلف تجربات ومشاہدات کا نچوڑ ہی ہے،

مگر غزل میں یہ تجربے و مشاہدے نسبتاً زیادہ مرتکز اور حاملِ محویت ہوتے ہیں، جو اس میں غضب کی Quotability پیدا کرتے ہیں۔ اسی لیے ہر دور میں غزل کو تمام اصناف سے زیادہ مقبولیت حاصل رہی۔

اسی Quotability کی بنا پر غزل تحریکِ آزادی کے دور میں صدائے احتجاج کی لو کو بھی شعلہ بداماں کرتی رہی۔ حریت پسند شعرا مثلاً اقبال، چکبست، محمد علی جوہر، جوش، حسرت موہانی اور اقبال سہیل وغیرہ نے غزل کو کوچۂ حسن و عشق اور حلقۂ تصوف سے نکال کر عام زندگی سے ہم آہنگ کیا اور سماجی اور سیاسی رنگ و آہنگ اس طور دیا کہ بعض اشعار اس دور میں نعرۂ مستانہ بن گئے۔ بالخصوص اقبال نے جو شعر و ادب کا افادی تصور رکھتے تھے، کامیاب تجربے کیے اور غزل کو بلند آہنگ اور خطابیہ لہجہ دے کر کلاسیکی تغزل کے زیرِ اثر تربیت پائے ہوئے اہلِ ذوق کو بھی اپنے لہجے کا عادی بنا دیا تھا۔ اس روایت سے ترقی پسندوں نے استفادے کی سعی کی کیوں کہ ترقی پسند بھی ادب اور زندگی کا نظریہ رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہاں کے سیاق و سباق میں غزل کی ساری اشاریت کو بروئے کار لا کر اپنے مخصوص نظریۂ زندگی کی ترجمانی کریں لیکن حصولِ آزادی سے قبل تک محض چند ترقی پسند شعرا ہی غزل کے ایسے تجربے میں کسی قدر کامیاب ہو پائے۔ بقیہ شعراء غزل کا میدان چھوڑ کر چلے گئے کیوں کہ اس وقت ملک میں سیاسی و سماجی انقلاب کی جو لہریں موجزن تھیں، ان سے متعلق موضوعات کے بیان میں یا حالات کے پیشِ نظر احساسات و تجربات کے اظہار میں بے باکی اور جوش و ولولے کے ساتھ بلند آہنگی لازم و ملزوم تھی جب کہ غزل کی ایمائیت اور اس کی صنفی پابندیاں ایک ٹھہراؤ اور ضبط کا تقاضا کرتی تھیں اور صدائے انقلاب خود کو ان بندشوں میں اسیر نہیں کر سکتی تھی۔ تاہم جن ترقی پسندوں نے غزل کو وسیلۂ اظہار بنائے رکھا، ان کی کاوشوں سے غزل اور نظم کا یہ سنجوگ ہوا اور پرانے شعری پیمانوں میں تازہ مشروب پیش کرنے کا انداز ابھر کر سامنے آیا لیکن ان کے تجربے اپنے تمام تر خلوص کے باوجود نہ تو اپنے اندر کسی طرح کی تہہ داری رکھ پائے اور نہ ہی حقیقی شعری تجربے کا جمال بلکہ سطحیت در آئی اور ایک طویل عرصے تک غزل غنائی اظہار کی منزل سے دور رہی۔ اس دور کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں :

جو محوِ جشنِ نظامِ نو ہیں، پکار کر ان سے کہہ رہا ہوں
نچوڑتا ہے لہو غریبوں کا دستِ سرمایہ دار اب بھی (جگر)

منزلیں گرد کے مانند اڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا (فراق)

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے (مجروح)

آخرِ شب کے ہم سفر فیضؔ نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا صبح کدھر نکل گئی (فیض)

کوہِ غم اور گراں اور گراں اور گراں
غم زدو تیشے کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے (مخدوم)

چونکیں نہ آندھیاں نہ بگولے اٹھیں کہیں
اپنا جنوں محیطِ بیاباں ہوا تو کیا (جذبی)

راستے کی گرد نے دھندلا دیے منظر تمام
ورنہ ہم آوارہ گردوں کی نظر میں کیا نہ تھے (تاباں)

خونِ سر بہہ گیا موت آگئی دیوانوں کو
بارشِ سنگ سے، طوفان سے، شرر سے پہلے (سردار جعفری)

سرمائے کے سمٹے ہوئے ہونٹوں کا تبسم
مزدور کے چہرے کی تھکن ہے کہ نہیں ہے (سردار جعفری)

گویا زندگی اس دور کی غزل میں ایک لمحاتی اضطراری کیفیت بن کر رہ گئی۔ ترقی پسند شعراء کے اس رویے سے غزل کو نقصان بھی پہنچا لیکن دوسری طرف آزادی کی جدوجہد میں ایسے اشعار عوام میں مقبول ہوئے اور انھیں آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی فراہم ہوا۔ حصولِ آزادی کے بعد جیسے ہی سیاسی اور تاریخی تناظر بدلا، اسی کے ساتھ شعروادب کے موضوعات اور لب و لہجے میں بھی تبدیلی واقع ہوئی۔ غیر ملکی حکمرانوں کے جانے اور قومی حکومتوں کے قیام کے باعث نئے حالات اور نئے مسائل پیدا ہو گئے۔ تقسیم ملک اور ہجرت کے کرب، فرقہ وارانہ فسادات اور منافرت کے درد، سابق اقتصادی و طبقاتی استحصال کے ضرب اور سیاسی و سماجی استبداد کے زخم نے عوام کو نڈھال کر دیا تھا۔ حالات غلامی کے دور سے بھی زیادہ گمبھیر ہو کر ابھرے۔ ایسی صورت حال میں

ترقی پسندوں کو غیر متوقع طور پر بالکل نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ شکستِ خواب سے دوچار تھے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ دونوں آزاد ملکوں میں ترقی پسند قابلِ دار و گیر قرار پائے۔ بایں صورت حالات موضوعات کے بدل جانے اور پیرایۂ اظہار کا سنجیدہ ہونا لازمی تھا۔ سو ہوا، اور ترقی پسند شعرا غزل کی طرف سنجیدگی سے راغب ہوئے اور نیا لب و لہجہ اور متوازن خیال ابھر کر سامنے آئے جن میں ایک گہرے طنز کی سبک اور دور تک پھیل جانے والی لہر تھی مگر لہجے میں بڑا ضبط تھا۔ اگر ایک طرف نظریاتی انتشار تھا تو دوسری طرف اس صورت حال سے لڑنے کا جوش بھی کروٹیں لے رہا تھا۔ اب اظہار کی سطح پر اشاریت اور ایمائیت ہی سہارا دے سکتی تھی۔ فضا علامتوں اور استعاروں میں بات کہنے اور سننے کے لیے سازگار تھی۔ چنانچہ ترقی پسند شعرا نے خلوص کے ساتھ غزل کو اظہار کا وسیلہ بنایا، اور غزل سے شور و غوغا کی کثافت رخصت ہوئی۔ غزل کی فضا گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کے الفاظ اور استعارے تہہ داری اور نئی سمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کا نغمہ کرب و اضطراب کی آنچ میں تپا ہوا نظر آنے لگا۔ اس نوع کی غزل کی عمدہ نمائندگی فراق، مجاز، فیض، جذبی، مخدوم، مجروح، تاباں، سردار جعفری اور جاں نثار اختر نے کی۔ ترقی پسندوں نے اپنی آواز کی شناخت قائم کی، گرد و پیش کے واقعات کے ساتھ ان کے رشتوں کی دریافت اور ان کی شخصیت کے سچے اظہار کی خواہش بھی غزل میں شامل ہوئی تو غزل نئے لب و لہجے کے ساتھ نئے تخیل آفریں تجربات کے سہارے آگے بڑھی۔ بقول مجروح سلطان پوری :

> ''ترقی پسندانہ تغزل، ترقی پسند شاعری بلکہ ادب کے دائرے سے باہر کی چیز تو نہیں ہے بلکہ جو ذمہ داریاں ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے دوسری اصناف ادب کے سلسلے میں لے رکھی تھیں، تقریباً وہی ذمہ داری اس شاعر کی بھی ہے جو ترقی پسند غزل لکھ رہا ہے۔ اس وقت ہمارے ذہنوں میں یہی بات تھی کہ وہ شعر جو ظلم کے خلاف احتجاج بلکہ کسی حد تک آویزش اور مظلوم کی طرف داری کے احساس اور شعور کے نتیجے میں لکھا جائے، ترقی پسند شعری روایت کا حصہ ہوگا۔ یہ شعر نظم کا بھی ہو سکتا ہے اور غزل کا بھی۔ اگر نظم میں آرہا ہے تو نظم کے صنفی لوازمات کے ساتھ آنا چاہیے اور اگر غزل میں ہے تو غزل کی ایمائیت اور استعاراتی دروبست کے ساتھ۔ ترقی پسند تغزل اس کے سوا کچھ نہیں کہ عصری احساس کا غزل کی روایت میں سمو کر اظہار کیا جائے۔ کوئی ایسا موضوع، کوئی ایسا جذبہ یا احساس نہیں ہے جو ترقی پسند غزل میں نہ آیا ہو۔''

سردار جعفری کے کچھ مجموعہ ہائے کلام میری نظروں سے گذرے ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے کلیاتِ علی سردار جعفری (۲۰۰۵ء) مرتبہ پروفیسر علی احمد فاطمی میں مجموعہ وار سبھی کلام کو شامل کیا ہے، جن میں غزلوں کی تعداد نسبتاً بہت کم ہے۔ شروع کی غزلوں میں نظریاتی اثرات زیادہ ہیں، جس کی وجہ سے غزلوں میں بھی نظموں کا سا انداز پیدا ہو گیا ہے:

نئے زمان و مکاں ، انقلاب زندہ باد	نئی ہے عمرِ رواں ، انقلاب زندہ باد
دمک رہی ہیں فضائیں، چمک رہے ہیں افق	بلند شعلۂ جاں ، انقلاب زندہ باد
قدم ہے نغمہ گر و نغمہ ریز و نغمہ فشاں	زمیں ہے رقص کناں ، انقلاب زندہ باد

یہ اقبال کی غزل ''خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ'' کی یاد دلاتی ہے۔ وہی خطیبانہ انداز، وہی جوشِ بیان، وہی فارسی آمیز اسلوب اس غزل میں بھی موجود ہے جو اقبال کا طرۂ امتیاز ہے۔ لیکن موضوعاتی اعتبار سے سردار نے عوامی شاعری کو ہی معیار بنا کر اپنی اس غزل کی تخلیق کی جن میں مارکسی نظریۂ حیات کی بھرپور تقلید ہوئی ہے جو ان کے خلوص و مشاہدے پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین اپنی کتاب ''مختصر تاریخ ادب اردو'' میں جعفری کے کلام کی اسی خصوصیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''مارکسی نظریۂ حیات کو جس خوبی سے جعفری نے اپنے کلام میں پیش کیا ہے، اس طرح ہمارے نزدیک ابھی تک اردو کے کسی اور شاعر نے نہیں کیا۔ وجہ یہ ہے کہ ان کا سیاسی شعور اور ان کی زندگی ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ جس طرح وہ سوچتے ہیں، اسی طرح زندگی بسر کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ اسی رویے نے احساس اور صداقت دونوں کو ابھار دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ خلوص و مشاہدہ ان کی شاعری کے دو خاص جوہر بن گئے ہیں۔ چونکہ شعریت مزاج میں پہلے ہی سے موجود تھی، اس لیے کلام میں تاثیر کی بھی کمی نہ رہ گئی۔'' (ص-۱۸۰)

جعفری کے ہم عصروں میں فیض، مجاز، جذبی، فراق اور مجروح ایسے شاعر تھے جن کی غزلوں کے آہنگ میں آہستہ روی، نرمیت اور سرگوشی کا سا انداز ہے لیکن اس کے برخلاف سردار کی غزلوں کے آہنگ میں تیزی، تندی اور کرختگی ہے جو ان کے نظریات کی پابندی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ غزل کی روایت کی پابندی کے باوجود جعفری کی غزلوں کا والہانہ اور خطیبانہ انداز ایک نئی اشاریت سے آشنا بھی کرتی ہے جو اردو غزل میں اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی۔ سردار نے اردو غزل کو پہلی بار زندگی اور زندگی کے بنیادی مسائل سے ہم کنار کیا۔

سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے سالاروں میں سے تھے اور ترقی پسندی کے بندھے ٹکے اصولوں کے پابند تھے۔ وہ بیک وقت شاعر، محقق، نقاد اور مترجم تھے لیکن ان کو مقبولیت کے بام پر ان کی شاعری نے چڑھایا جب کہ ان کی شاعری بلکہ ہر تخلیقی کاوشیں، فکر وفن اور طرزِ عمل ہدفِ تنقید بنتے رہے۔ باوجود ایسی تنقیدوں کی باڑھیں ان کی مقبولیت کو گہنا نہ سکیں۔ ان کی نظموں نے اردو شاعری کو اپنا ایک تیور اور لب ولہجہ دیا۔ ان کی انفرادیت کا اعتراف ناقدینِ وقت کو بھی کرنا پڑا۔ شروع کی غزلوں کو چھوڑ کر ان کی بیشتر غزلوں میں جوش، بلند آہنگ اور تیز وتند لہجہ ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سردار جعفری غالب و اقبال سے زیادہ متاثر رہے ہیں۔ انھوں نے خود اپنے شعری مجموعہ ''پتھر کی دیوار'' کے دیباچہ میں رقم کیا ہے کہ :

''میں اپنی شاعری کو 'نالۂ نیم شبی' اور 'آہِ سحر گاہی' نہیں بنا سکا ہوں۔ میں اسے بیک وقت ستار کا نغمہ اور تلوار کی جھنکار بنانا چاہتا ہوں اور میرے سامنے اقبال کا پیش کیا ہوا یہ آدرش ہے:

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

دل جس سے پہاڑوں کے دہل جائیں وہ طوفان''

سردار کی غزلیں اس آدرش کی غمازی کرتی نظر آتی ہیں۔ ویسے غزل کی شعری حسیت کے بارے میں سردار کا تجربہ و رجحان ان بعض ترقی پسندوں سے الگ تھا جو غزل کو ایک عرصے تک ہزل گوئی تصور کرتے رہے۔ اپنی مرتبہ ''دیوانِ غالب'' کے دیباچے میں لکھا ہے :

''غزل، رعنائی اور شاعری کی معراج ہے۔ اس لیے اس کے اشعار میں ذاتی جذبے اور سماجی اضطراب کے درمیان حد کھینچنا مشکل ہے۔''

ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ سردار جعفری نے غزل کے روایتی رجحان سے تنفر کی بنا پر غزل گوئی سے اجتناب نہیں کیا ہے بلکہ انھوں نے غزلیں کہیں اور گیسوئے غزل کو سنوارنے کی اپنے طور پر کوشش کی۔ ان کی غزلوں میں موضوعات اپنے عہد کی زندگی اور اس کے وسائل سے ماخوذ ہیں، جو ان کی مندرجہ ذیل غزل سے واضح ہو جاتے ہیں :

آئے ہم غالب و اقبال کے نغمات کے بعد
مصحفِ عشق وجنوں، حسن کی آیات کے بعد

اے وطن، خاکِ وطن وہ بھی تجھے دے دیں گے
بچ گیا ہے جو لہو، اب کے فسادات کے بعد

نارِ نمرود یہی اور یہی گلزارِ خلیل	کوئی آتش نہیں آتش کدۂ ذات کے بعد
رام و گوتم کی زمیں حرمتِ انسان کی امیں	بانجھ ہوجائے گی کیا خون کی برسات کے بعد
تشنگی ہے کہ بجھائے نہیں بجھتی سردارؔ	بڑھ گئی کوثر و تسنیم کی سوغات کے بعد

یہاں ترقی پسند خیالات، غزل کی ایمائیت اور استعاراتی در و بست کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ مقطع کا شعر غزل کے بدلتے تیور کی غمازی کرتا ہے تو بقیہ اشعار میں عصری حسیت پر گہرے طنز کی سبک اور پھیل جانے والی لہر موجود ہے۔

وہ فیض کی طرح اپنی غزلوں میں صناعی اور مینا کاری کے بجائے اپنی نظموں کی طرح غزلوں میں بھی صاف لفظوں میں مظلوم اور محنت کش عوام کی حمایت میں ظالمانِ وقت کے خلاف یلغار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جہاں ان کی آواز بے باک، بلند اور سخت ہوجاتی ہے :

عصرِ حاضر کو مبارک ہو نیا دور، عوام	اپنی ٹھوکر میں سرِ شوکتِ شاہانہ رہے
زخمی سرحد، زخمی قومیں، زخمی انساں، زخمی ملک	حرفِ حق کی صلیب اٹھائے، کوئی مسیح تو آئے اب

سردار جعفری نے ایک کٹر پسند نقاد کی حیثیت سے فیض احمد فیض کو ترقی پسندی سے خارج کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ عرصۂ دراز تک فیض کی شاعری کو ترقی پسند شاعری کے زمرے میں شامل کرنے سے انکار کرتے رہے، لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ ان کی شاعری کے قائل ہوگئے۔ صرف یہی نہیں ان کی شاعری کا براہِ راست اثر بھی قبول کیا۔ یہاں ان کی غزلوں کے مندرجہ ذیل اشعار ہمارے اس دعوے کی دلیل میں پیش کیے جاسکتے ہیں :

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا	راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا
باعثِ رشک ہے تنہا رویِ رہروِ شوق	ہم سفر کوئی نہیں دوریِ منزل کے سوا
ہم نے دنیا کی ہر اک شے سے اٹھایا دل کو	لیکن اک شوخ کے ہنگامۂ محفل کے سوا
تیغ منصف ہو جہاں، دار و رسن ہوں شاہد	بے گنہ کون ہے اُس شہر میں قاتل کے سوا
جانے کس رنگ سے آئی ہے گلستاں میں بہار	کوئی نغمہ ہی نہیں شورِ سلاسل کے سوا

عشق عمل کا محرک جذبہ ہوتا ہے لیکن عشق کے لیے ضروری نہیں کہ معشوق گوشت پوست والا ہی ہو۔ وہ کوئی آئیڈیل، کوئی آدرش بھی ہوسکتا ہے اور اس آئیڈیل و آدرش کو رومان کے وسیلے سے ظاہر کیا جاسکتا ہے، جو

ترقی پسندوں کا شعار رہا ہے۔ انقلابی فکر کا سرچشمہ بھی یہی ہے۔ اکثر ترقی پسندوں کی احتجاجی اور انقلابی شاعری رومان انگیزی سے مملو رہی ہے اور غزل کے لیے تو رومان انگیزی لازمی شے رہی ہے۔ سردار کے یہاں بھی یہ وصف نمایاں رہا ہے۔ اس طرح سردار نے نغماتِ غزل میں دل کش صدا کا خیال رکھا ہے تا کہ یہ آواز اصل مقصد کے حصول میں معاون ہو سکے اور غزل کا غنائی آہنگ بھی برقرار رہے۔ متذکرہ غزل ہماری اس بات کی دلیل ہے۔ اپنے مجموعہ ''خون کی لکیر'' (۱۹۴۹ء) تک آتے آتے ان کی غزل اور جملہ شاعری ایک واضح سمت اختیار کر لیتی ہے۔ عشق، رومان اور غزل کے دیگر لوازم کی ایک مثال اسی مجموعے کی ایک غزل کے چند اشعار سے دیکھیے :

حسن کی رنگیں ادائیں کارگر ہوتی گئیں	عشق کی بیباکیاں بیباک تر ہوتی گئیں
یاں مری بہکی ہوئی نظریں بہکتی ہی رہیں	واں نگاہیں اور بھی کچھ معتبر ہوتی گئیں
لب پہ ہلکے سے تبسم کی مٹھاس آتی گئی	زندگی کی تلخیاں شیر و شکر ہوتی گئیں
آرزوئیں نارسائی کا گلہ کرتی رہیں	اور وہ زلفیں زینتِ دوش و کمر ہوتی گئیں

یہاں حسن کی رنگیں ادائیں، عشق کی بہکی ہوئی نظریں، آرزوؤں کی نارسائی اور زلفِ محبوب کا زینتِ دوش و کمر ہونا، سب روایتی الفاظ واشارات ہیں۔ اس کے باوجود اس غزل کا عمومی آہنگ اردو کی غزل سے ملتا جلتا ہے، جس سے سردار جعفری کے قوتِ بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔ ترقی پسندی کا واضح اثر اس غزل پر نہیں ہے لیکن دوسری غزلوں میں یہ تاثر ختم ہو جاتا ہے، اس لیے کہ انقلابی افکار کی حامل غزلیں ہی ملتی ہیں، جن میں آزادی کے بعد محنت کش طبقے کی اقتصادی حالت اور ظلم و استحصال کی بنیاد کو انھوں نے موضوع بنایا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ جمہوریت، مساوات اور اقتصادی خوش حالی سے عوام فیضیاب ہوں لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش قائم رہی۔ سردار جعفری کے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں :

تیغ منصف ہو جہاں دار و رسن ہوں شاہد	بے گناہ کون ہے اس شہر میں قاتل کے سوا
جانے کس رنگ میں آئی ہے گلستاں میں بہار	کوئی نغمہ ہی نہیں شورِ سلاسل کے سوا
حرفِ باطل زیبِ منبر حرفِ حق بالائے دار	مقتلِ شوق کے انداز نرالے ہیں بہت
زبانِ تیغ سے کرتے ہیں پرسشِ احوال	اور اس کے بعد یہ کہتے ہیں آرزو کہیے

سردار جعفری کے بدلے ہوئے اس لب و لہجے اور تیور میں مانوسیت ہے کیوں کہ اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات ہی ایسے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نئے شعور اور انقلابی افکار کے نقیب وسفیر بن جاتے ہیں اور اپنی غزلوں سے جذبات واظہار کو بروئے کار لاتے ہیں۔ شعر دیکھیں:

ہر درندے کو پہنا دیجئے انساں کا لباس — اور جی کھول کے انساں کو حیواں کہیے

کھینچ لیجئے رگِ الفاظ سے خونِ معنی — رقصِ بسمل کی جگہ رقصِ غزالاں کہیے

سردار کے یہاں بھی فن جمالیاتی تسکین کا وسیلہ نہیں بلکہ انسانیت کے فروغ کا محرک ہے کیوں کہ ان کے یہاں جمالیات کا تصور انسانی اقدار پر مبنی ہے۔ لہٰذا جب مقصد کے حصول کے لیے کوئی فن وسیلۂ اظہار بنتا ہے تو برہنہ گفتاری در آتی ہی ہے۔ اقبال نے بھی دانستہ ایسا کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

رمز و ایما اس زمانے کے لیے موزوں نہیں — اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن

سردار جعفری سے بھی اسی موقف کا صدور ہوا ہے۔ گرچہ غزل کو برہنہ گفتاری راس نہیں آتی مگر سردار نے عموماً اقبال کا تتبع کیا ہے۔ سردار کا ایک شعر ہے:

خبر نہیں ہے بموں کے بنانے والوں کو — تمیز ہو تو مہ و مہر و کہکشاں ہیں شکار

یہ اُسی غزل کا شعر ہے جس کا مطلع ہے:

کھلے ہیں مشرق و مغرب کی گود میں گلزار — مگر خزاں کو میسر نہیں یقینِ بہار

اس غزل میں سات اشعار ہیں۔ اگر متذکرہ بالا شعر اس میں سے ہٹا دیں تو یہ غزل روایتی اسلوب میں جدتِ افکار کا معنوی تناظر پیش کرنے والی ارفع غزل ٹھہرتی ہے۔ سردار کی غزلوں کے چند اور رنگ دیکھیں:

سینے میں حرارت ہے افسونِ تمنا سے — امروز مرا روشن رنگِ رخِ فردا سے

ترا حسن بادۂ ناب ہے جو کھنچا ہے رنگِ بہار سے — مری جرعہ نوشیِ شوق ہے ترے لعل لب کے فشار سے

اسی دنیا میں دکھادیں تمھیں جنت کی بہار — شیخ جی تم بھی کبھی کوئے بتاں تک آؤ

مذکورہ اشعار شاعر کی فنی پختہ کاری کے غماز ہیں۔ سردار کی غزلیں ہر رنگ ہر روپ میں جلوہ گر ہیں۔ ان کی غزل نغمۂ عشق سے مخصوص ہے نہ غمِ روزگار تک محدود ہے۔ یہ درست ہے کہ ترقی پسند افکار کے رموز وعلائم، شعری تلازمات ولفظیات سردار کی غزلوں میں در آئی ہیں۔ باوجود اس کے اکثر غزلوں کے اشعار متغزلانہ کیف

وآہنگ سے معمور ہیں۔ان سے سردار کے ڈکشن اور آدرش کا بھی پتہ چلتا ہے لہٰذا ان کی غزلیں بہ اعتبارِ مقدار کم ضرور ہیں مگر اقدار و معانی کے لحاظ سے انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔کیوں کہ بہر طور انھوں نے معتزلانہ شعری روایات کے ساتھ جدت و ندرت کے عوامل اور حسین شعری تلازمات کے امتزاج سے غزل کو ایک منفرد رنگ و آہنگ عطا کیا ہے، جو بحیثیت غزل گو ان کی شناخت کا موجب ہے۔

غرض کہ سردار جعفری کی غزل کا مطالعہ ہمیں شاعری کی اس فضا کی طرف لے جاتا ہے جہاں دن کے شور شرابے بھی ہیں، رات کا سکوت بھی، زندگی کی بلند آہنگی بھی ہے اور محبت کی سرگوشی بھی، فکری ترقی پسندی بھی ہے اور نئی روایت کی پاسداری بھی جو ترقی پسند شاعروں کی بھیڑ میں بھی انھیں منفرد اور معتبر بناتی ہے۔سردار جعفری کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے فکر و فن کی گہرائی و گیرائی سے پوری نسل کو متاثر کیا۔دراصل وہ ناانصافی اور ظلم کے تمام نظام کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔اپنی نظموں کو غزلوں کے ذریعہ اپنے افکار اور احساسات سے مطلع کرنے کے ساتھ ساتھ، ان کے جذبات میں ہیجان و ہلچل پیدا کرنا اور ان کی فکر کو متاثر کرنا چاہتے ہیں۔

سردار کی غزلیہ شاعری کبھی بے سمت رومانیت اور بے جہت افلاطونیت کا شکار نہیں ہوئی بلکہ ان کی غزلوں میں واضح مفہوم، متعین خیالات اور بیباک اظہار کے نقوش ملتے ہیں جو روایتی آہنگ سے بہت حد تک مختلف ہیں اور ترقی پسند فکر اور اظہار کی شناخت رکھتے ہیں۔میں اس مقالے کا اختتام پروفیسر گوپی چند نارنگ کی اس بات سے کروں گا جو انھوں نے سردار کی شاعری کی عظمت کے اعتراف میں کہا ہے:

> ''علی سردار جعفری کی شاعری میں زندگی کا ثبات اور زندگی کے تسلسل پر ایقان اور اعلیٰ انسانی قدروں پر ان کا ایمان ایسی میراث ہے جس کی وجہ سے تاریخ کے صفحات پر ان کا نام روشن رہے گا''۔ (ایوانِ اردو، دہلی، سردار جعفری نمبر ستمبر ۲۰۰۰، ص ۱۴)

ڈاکٹر امام اعظم مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے کولکاتہ ریجنل سنٹر کے ڈائرکٹر ہیں۔

علی سردار جعفری کی غزلیں

ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی

علی سردار جعفری کی شخصیت اتنی پہلودار اور اتنی جاندار ہے کہ اس کے کسی بھی پہلو سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ وحید اختر صاحب نے بالکل درست لکھا ہے کہ:

''سردار جعفری نے ایک عمر میں کئی عمریں ہی نہیں گزاریں، بلکہ ہر عمر میں مختلف سطحوں پر اپنے زندہ ہونے کا ثبوت بھی دیا ہے، وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ادب کے اچھے ناقد بھی ہیں۔ بے مثال مقرر بھی ہیں۔ کلاسکی ادب کے شارح بھی، سیاسی رہنما بھی اور ادبی نظریہ ساز بھی۔''

(علی سردار جعفری شخص شاعر اور ادیب مرتب عبدالستار دلوی ۲۰۰۲ ص ۱۸۴)

ایسی جامع کمالات شخصیت کسی بھی زبان وادب میں خال خال ہی دیکھنے کوملتی ہے۔ علی سردار جعفری کی کئی حیثیتیں ہیں، اور کہنا چاہئے کہ ان کی ہر حیثیت مستحکم ہے، مگر وہ عام طور پر نظم کے شاعر کی حیثیت سے ہی یاد کئے جاتے ہیں۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ وہ ادب میں غزل کے راستے سے داخل ہوئے۔ یہ اور بات کہ وہ غزل کو زیادہ وقت نہ دے سکے۔ رفعت سروش کہتے ہیں کہ ''سردار جعفری عنفوان شباب میں اپنے اس شعر کے ساتھ مطلع شاعری پر طلوع ہوئے''۔

دامن جھٹک کے منزل غم سے گزر گیا   اٹھ اٹھ کے دیکھتی رہی گرد سفر مجھے

(درد کا ساحل بہ یاد علی سردار جعفری ایوان اردو، ستمبر ۲۰۰۰ء، صفحہ ۳۶)

توجہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس شعر میں بھی غزل کا روایتی لہجہ نہیں بلکہ ایک باغیانہ تیور پایا جاتا ہے، جسے ہم ترقی پسندی کے حقیقی لحن کی دریافت کی آہٹ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ مزے کی بات تو یہ بھی ہے کہ سردار جعفری جنہوں نے نظم کو ہی اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا انہوں نے کہا تھا کہ ''غزل سب سے زیادہ نیچرل فارم ہے شاعری کا'' جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سردار جعفری کو غزل اور غزلیہ شاعری سے فطری مناسبت تھی مگر حالات کے تقاضا کے پیش نظر انہوں نے غزل کہنے کی عیاشی نہیں کی۔

پروفیسر رحمت یوسف زئی نے کہا ہے کہ سردار جعفری کی کئی نظمیں ایسی ہیں جنہیں جبراً نظم کہا جاتا ہے، نہیں تو فی الواقع غزلیں ہیں، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ:

''ایوان اردو، ستمبر ۲۰۰۰ء کے صفحہ ۶ پر سردار جعفری کے تحریر میں ۲۴ فروری کا کلام شامل کیا گیا ہے، جس کو انہوں نے ''ایک سوال'' کا عنوان دے کر گویا ایک نظم ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اور ایوان اردو کے مدیران نے اسے فہرست میں عنوان کے باوجود غزل قرار دیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مذکورہ تخلیق میں صرف پانچ اشعار ہیں، نہ مطلع ہے اور نہ مقطع اور یوں لگتا ہے کہ ایک زیریں لہران اشعار کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے، وہ پانچ اشعار یہ ہیں۔''

معلوم نہیں عقل کی پرواز کی زد میں
سرسبز امیدوں کا چمن ہے کہ نہیں ہے
لیکن یہ بتا وقت کا بہتا ہوا دھارا
طوفان گرد کوہ شکن ہے کہ نہیں ہے
سرمائے کے سمٹے ہوئے ہونٹوں کا تبسم
مزدور کے چہرے کی تھکن ہے کہ نہیں ہے
وہ زیر افق صبح کی ہلکی سی سپیدی
ڈھلتے ہوئے تاروں کا کفن ہے کہ نہیں ہے
پیشانی افلاس سے جو پھوٹ رہی ہے
اٹھتے ہوئے سورج کی کرن ہے کہ نہیں ہے

(علی سردار جعفری شخص شاعر اور ادیب، مرتب عبدالستار دلوی، ۲۰۰۲ء، صفحہ ۸۷ ۔ ۲۷)

ظاہر ہے کہ اس طرح کی مثالیں سردار کے یہاں بکثرت مل جائیں گی مگر اس سے قطع نظر ان کے یہاں غزلیں بھی اتنی تعداد میں بہرحال مل جاتی ہیں کہ جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ ان غزلوں کے دیکھنے اور پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سردار نے غزلوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں غزلیہ شاعری کے امکانات کو اجالنے کی صفت سے متصف نہیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو

یہ ہے کہ غزل دھیمے سروں اور اندر ہی اندر سلگتے جذبوں کی شاعری ہے جب کہ ترقی پسند تحریک کا سارا زور خطابت پر صرف ہو رہا تھا، اس لیے غزل سردار کے جذبات کے اظہار کا ذریعہ نہیں بن پائی۔

ہم جانتے ہیں کہ غزل کا اپنا مخصوص مزاج و آہنگ ہے۔ حسن و عشق اور اس سے متعلق عوامل اس کے بنیادی اور روایتی موضوعات ہیں۔ ادب چونکہ زندگی کا عکاس ہوتا ہے اس لئے اصناف ادب کو بھی زندگی کی تبدیلیوں کا ساتھ دینا ہی پڑتا ہے۔ چنانچہ جو اصناف ادب زندگی کی ہمرکابی میں دم ہار دیتا ہے وہ اپنی موت آپ مرجاتا ہے۔ غزل ادب کی وہ صنف ہے جس نے ہر حالت میں زندگی کے حقائق کی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے۔ یہی وہ خوبی ہے جو غزل کو ہر دل عزیز بنائے ہوئی ہے۔ چنانچہ ترقی پسند عہد میں داخل ہونے کے بعد غزل نے اپنی داخلی سطح سے زیادہ اپنی خارجی سطح کو موثر و معتبر بنانے کی سعی کی اور رمز و کنایہ کی جگہ بیانیہ اسلوب اور حزنیہ لہجہ کی بجائے خطیبانہ لہجے کو اپنا کر اپنے تشخص اور تحفظ کا جواز پیدا کرلیا۔ (یہاں اس بات سے کوئی بحث نہیں ہے کہ خارجیت کے اثرات نے غزل کو دل پذیر بنایا یا انتقاص تاثیر سے ہمکنار کیا)

ترقی پسندوں نے اپنے تحریکی مقاصد کے حصول کے لئے بیشتر نظم و نثر کو ہی اظہار کا وسیلہ بنایا۔ کیونکہ موضوعاتی وضاحت و شدّت کیلئے نظم و نثر کا فارم ہی سب سے زیادہ موثر ہوتا ہے۔ اس لئے ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں سب سے زیادہ توجہ نظم و نثر پر ہی دی گئی۔ لیکن اس کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ غزل بے اماں ہوگئی۔ خود فیض کی ''دست صبا'' اور ''زنداں نامہ'' نظموں سے زیادہ غزلوں کیلئے مقبول ہے۔

ترقی پسند ادب تنوع کے اعتبار سے بہت زیادہ زرخیز نہیں ہے۔ اس کے بنیادی اور عمومی موضوعات، بھوک، افلاس، غلامی کے خلاف بغاوت، آزادی کی خواہش، استحصالی نظام کی نفی، جمہوریت اور اشتراکیت کی بحالی اور امن و مساوات تک ہی محدود ہیں۔ سردار جعفری کی شاعری کا خمیر بھی انہیں اجزا سے مرکب ہے۔

اس سے ہر طرح تذلیل بشر ہوتی ہے
باعث فخر نہیں مفلسی و ناداری

انقلابی ہو تو ہے فقر بھی توقیر حیات
ورنہ ہے عاجزی و بے کسی و عیاری

تیغ و خنجر کو عطا کرتے ہیں لفظوں کی نیام
ظلم کی کرتے ہیں جب اہل ستم تیاری

ان اشعار کے درو بست میں جذبات کی جو شدت ہے اسے ہر کوئی محسوس کر سکتا ہے۔ ان اشعار کی خوبی بس یہ ہے کہ جذبات کو برانگیختہ کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ اور یہ تو ظاہر ہی ہے کہ سردار جعفری کا مقصد بھی یہی ہے۔ ان کی غزلیں ہوں کہ نظمیں اس سے وہ سماجی بیداری، ظلم و جبر اور افلاس و بھوک مری کے خلاف انقلاب کی تیاری، اور تمام تر استحصالی رویوں کو رد کر کے مساوات کے راہوں کی ہمواری کا کام لینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ اور مجھے کہنے دیجئے کہ یہ کامیابی کوئی معمولی بات نہیں ہے کیونکہ اسی کامیابی کی بنیاد پر ہندوستان کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ کامیابی اور حب الوطنی کا یہی وہ احساس ہے جو سردار جعفری کو غزلیہ شاعری کی روایت کی طرف متوجہ کرنے کے بجائے مقاصد کے حصول کیلئے اور زیادہ مخلص اور پر جوش بنا دیتا ہے۔ اور اس طرح ان کی غزلوں کے اشعار تحریکی مقاصد کی آگ سے سلگ اٹھتے ہیں۔

ہوا ہے سخت اب اشکوں کے پرچم اڑ نہیں سکتے
لہو کے سرخ پرچم لے کے میدانوں میں آجاؤ

قافلے شوق کے رکتے نہیں دیواروں سے
سینکڑوں محبس و زنداں کے دیار آتے ہیں

بس اسی کو توڑنا ہے، یہ جنون نفع خوری
یہی ایک سرد خنجر دل روز گار میں ہے

فروخت ہوتی ہے انسانیت سی جنس گراں
جہاں کو پھونک نہ دے گی یہ گرمی بازار

اس طرح کے جذبات سے بھڑکتے رہنا، اور تمام تر تخلیقی قوتوں کو ظلم و جبر اور ناانصافی کے خلاف سینہ سپر ہونے میں صرف کر دینا اپنے آپ میں ایک بے نظیر تخلیقی قربانی ہے۔ مگر طریقہ کار دور رس نتائج کا حامل نہ ہو۔ فکر

میں عمق کم اور تندی زیادہ ہو۔ اس پر سے ستم یہ کہ حالات اتنے سنگین ہوں کہ آہ و بکا تو کجا چیخ و پکار کا بھی کسی پر کوئی اثر نہ ہوتا ہو تو آدمی حالات کا شکار ہو ہی جاتا ہے۔ اور ایک طرح کی شکستگی کا احساس کچوکے لگانے لگتا ہے۔

ہم نے مانا کہ شکستہ حال ہیں ہم ــــ رونق کاروبار ہستی میں

لیکن یہ احساس دیر تک غالب نہیں رہتا ہے۔ حوصلہ زندہ رہنے کا بہانہ تلاش لیتا ہے۔

جو تشنگی ہو تو پیمانہ و سبو کہیے ــــ شکست شوق کو تکمیل آرزو کہیے

بہر حال اس احساس شکستگی سے صرف ملک کی سیاسی و سماجی صورتحال کا ہی پتہ نہیں چلتا ہے بلکہ یہ شکستگی شاعر کے اندرون کی ناتمام خود اظہاریت کا بھی پتہ دیتی ہے۔ شاعر جانتا ہے کہ اس کے اندر بہت اندر جو تڑپ ہے اس کی تکمیل نہیں ہو پا رہی ہے۔ ایسی صورت میں شاعر کو اپنی جبلیاتی اور جمالیاتی کائنات کی سیر پر نکل جانا چاہیے۔ لیکن سردار جعفری نے تو گویا قسم کھا رکھی تھی کہ مقصد کے حصول کے بغیر وہ کچھ بھی نہیں کریں گے۔ حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ وہ جمالیاتی حسیت کی پرورش کر کے نہ صرف یہ کہ اپنی شکستگی کو شگفتگی سے ہم آہنگ کر سکتے ہیں بلکہ اپنے شوریدہ سر وجود کے سوختہ گوشوں کو بھی سیراب کر سکتے ہیں۔ نیز اپنے دوسرے ہمعصروں کی طرح غزل کہنے کی عیش کوشی سے بھی محظوظ ہو سکتے ہیں۔ لیکن انہوں نے ایسا کرنا مقصد سے فرار ہونے کے مترادف جانا۔ حالات کی یہی وہ ستم ظریفی تھی جس نے شاعر کے جذبات کو ٹھنڈا کر دیا یوں بھی آدمی ایک ہی سُر میں بھلا کتنی دیر تک چیخ سکتا ہے۔

عشق کیوں ہے سرگرداں حسن بے نشاں کیوں ہے ــــ قافلے بھٹکتے ہیں منزل تمنا پر

عشق اس ستم گر کا شوق کا زیاں کیوں ہے ــــ کچھ کمی نہیں لیکن کوئی کچھ بتلاؤ

عشق جو روحانی فرحت و تازگی کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ وہ عشق جو بشریاتی فطرت کی نسوں سے رستا ہے اور انسانی وجود کو سرسبز و شاداب کر کے زندگی میں نئی امنگوں کی تخلیق نو کا سبب بنتا ہے وہ اس عہد پر آشوب میں شوق کا زیاں بن کر رہ گیا تھا۔ وہ کیسا ستم ظریفانہ اور جابرانہ عہد تھا اس کا صحیح اندازہ کم سے کم وہ لوگ تو قطعی نہیں لگا سکتے جنہوں نے آنکھ کھولتے ہی ہندوستان کو آزاد فضا میں سانس لیتے دیکھا ہے۔ اگر علی سردار جعفری چاہتے تو وہ بھی اپنے بعض رفقاء کار کی طرح تحریکی مقاصد کو پس پشت ڈال کر ایسی شاعری کر سکتے تھے جو انہیں اپنے عہد کے ممتاز غزل گو شعرا کی صف میں کھڑا کر دیتی۔ مگر انہیں ان باتوں کی کوئی پرواہ ہی نہیں تھی۔ یہ کم بڑی بات

نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے جمالیاتی احساسات کو نظر انداز کر کے عوامی مسائل کے حل کیلئے خود کو وقف کر دیا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اس وقت اپنے عہد کے تقاضوں سے دامن کش ہو کر اپنی جبلی یا جمالیاتی احساسات کی ترجمانی کیلئے اپنے اندرون میں سفر کرنا حقائق سے چشم پوشی برتنے کے مترادف ہوگا۔ اس عہد کے تقاضوں کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جگر مرادآبادی جیسا شاعر جس کی کل کائنات حسن و عشق ہی تھی وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ

شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آجکل

اس لئے اگر سردار جعفری کی غزلیں مقصدیت کی گونج سے پر شور ہو گئی ہیں تو اس میں جعفری صاحب کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس عہد کا تقاضا ہی یہی تھا کہ غزل کہنے کی عیاشی کو بالائے طاق رکھ دیا جائے اور عوامی دھارے سے جڑ کر قومی سالمیت اشتراکیت اور آزادی کیلئے کوشش کی جائے۔ ان تمام باتوں کے باوجود جعفری صاحب کے یہاں ایسے اشعار بہرحال مل جاتے ہیں جو غزلیہ شاعری کے انتخاب میں جگہ پا سکتے ہیں۔ شاید اسی لئے 'ظ انصاری' نے کہا تھا کہ:

''اپنی نثر اور تقریروں میں غزل پر آنکھیں نکالتے تھے اب خود غزل لکھنے بیٹھ گئے ہیں۔ تو سارے غمزے ساتھ لائے ہیں۔

ان کے آنے کو چھپاؤں تو چھپاؤں کیسے
بدلا بدلا سا ہے میرے درودیوار کا رنگ

اور ہے عشق کی نظروں کا نکھارا ہوا روپ
یوں تو شائستہ تھا پہلے بھی رخ یار کا رنگ

یوں تو کہنے کیلئے آتی ہیں صبحیں روز روز
جانے کیوں کٹتی نہیں ہے پھر بھی شامِ انتظار

چوم لینا لب لعلیں کا ہے رندوں کو روا
رسم یہ بادۂ گلگوں سے چلی ہے یارو

شاخ گل کب سے ہے سینے میں چھپائے ہوئے
دیکھیں کب باد صبا حکم چمن کاری دے

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ سردار جعفری کے لاکھ گریز کرنے کے باوجود کلاسیکی شعری روایت اور غزل کی فطری روح ان کی تخلیقیت خیزی کا جزو بن ہی گئی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسندی کی تمام تر شوریدگی کو نکال کر بھی جعفری صاحب کی غزلوں کا تجزیہ کیا جائے تو ہم ان کی غزلوں کو نظرانداز کرنے میں کسی بھی طرح حق بجانب نہیں ہوں گے۔ کیونکہ کلاسیکی غزل کی جو روایت رہی ہے وہ کم وبیش سردار جعفری کی غزلوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ ان کی غزلوں کا انتخاب کر کے اس کے حسّی پیکر کو ٹٹولا جائے تو ہم پائیں گے کہ انقلاب وبغاوت، جنگ وجدال، آتش وبم، تلوار وخنجر، اور تیر وتفنگ کی باتیں کرنے والے شعلہ فشوں شاعر کے پہلو میں ایک ایسا معصوم اور نرم دل ہے جو محبت کا لمس پاتے ہی کسی بچے کی طرح چہک اٹھتا ہے۔ اور شوریدہ سری کی فضاؤں سے باہر نکل کر نغمہ سرا ہو جاتا ہے۔

مہک رہی ہے غزل ذکر زلف خوباں سے
نسیم صبح کی مانند کو بہ کو کہیے

پھول کے گرد پھرو باغ میں مانند نسیم
مثل پروانہ کسی شمع تپاں تک آؤ

ساز سے کوئی نغمہ نکلے دل میں کوئی پھول کھلے
ایک بار تو اپنی زباں سے پوچھ ہمارے دل کا حال

کہیں رہ گئی ہو شاید ترے دل کی دھڑکنوں میں
کبھی سن سکے تو سن لے مری خوں شدہ نوا کو

دیکھنا پھول سے کھلتے ہوئے ہونٹوں میں مرے
غنچۂ دل کے چٹکنے کی صدا ہے کہ نہیں

انسان فطرتاً نرم خو، معصوم، حسن وعشق اور سچائی و ہمدردی کے جذبات کا خوگر ہوتا ہے۔ پھر انسان کی اپنی جبلی، جمالیاتی اور جدلیاتی قدریں ہوتی ہیں۔ ان قدروں یا یوں کہیں ان خواہشوں اور آرزوؤں پر کسی قدر قابو تو پایا جاسکتا ہے مگر اس کو پوری طرح دبا دینا یا رد کر دینا نہ تو انسان کے بس کی بات ہے اور نہ بشری فطرت کی صداقت و سچائی۔ چنانچہ خاص قسم کے مقصدی دائروں کو توڑ کر اس قسم کے جذبات کا چھلک جانا، یا بشریاتی فطرت کا انسانی ذہنوں سے رس کر صفحہ قرطاس پر پھیل جانا نہ تو آئیڈیالوجی سے منہ موڑنے کے مترادف ہے اور نہ حقائق کے منافی، یہ بات ذہن میں پوری طرح واضح رہنی چاہیے کہ اُلوہی جذبات ہی کے فیضان سے انسانی روح بالیدہ ہوتی ہے۔ اور زندگی حقیقی مسرت و بصیرت سے ہمکنار ہو کر کائناتی صداقت کا اثبات کرتی ہے، اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ایک سچے اور ایماندار فنکار کی عملی اور تخلیقی دونوں ہی زندگی اپنے عہد کی عکاس ہوتی ہے۔

یہ ترقی پسند تحریک کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے ہمارے ادب اور ہمارے تخلیقی دھارے کو زندگی کا ہم رکاب بنایا۔ اور ہماری زبان اور ہمارے ادب کے ساتھ ساتھ ہم تمام اردو والوں کو وہ سرمایہ فراہم کر دیا جو رہتی دنیا تک ہمارے ادبی سرمائے کو بامقصد بنائے رکھے گا۔ اگر ترقی پسند تحریک اردو زبان و ادب میں اس زور و شور سے پروان نہیں چڑھتی تو شاید آج بعض متعصب لوگوں کی طرف سے اٹھائے گئے سوالات کا جواب دینے میں اردو زبان اتنی سنجیدہ اور بولڈ قطعی نہیں ہوتی۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ حب الوطنی، قومی سالمیت، اور عوامی جذبات کی ترجمانی کا جو کردار اردو نے ادا کیا ہے وہ اب تک ہندوستان کی کوئی زبان نہیں کر سکی ہے۔ اور یہ سب کچھ اتنی خوبی اور مضبوطی سے اس لئے ہونا ممکن ہوا کہ اردو والوں نے ترقی پسند تحریک کو فروغ دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ وقت حالات اور عہد آفریں تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے اپنے فن لطیف کے مزاج و منہاج تک و بدلنے کا خطرہ مول لے لیا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک نے اردو زبان وادب کو حقائق کے اظہار کا جو سلیقہ سکھایا ہے اور منفی رویوں کے خلاف حق گوئی کی جو جرأت پیدا کی ہے اس میں بہت کچھ علی سردار جعفری کا بھی حصہ ہے۔ ایسے جیالے جن کی زندگی تحریک کی شکل اختیار کرلے اور عوامی بیداری کا سبب بن جائے کسی بھی زبان کے ادب میں بڑی مشکل سے پیدا ہوتے ہیں۔ جعفری صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ:

ایسے دیوانے پھر نہ آئیں گے　　　دیکھ لو ہم کو کہ بے مثال ہیں ہم

سردار جعفری کی سیاسی نظمیں

پروفیسر مقبول فاروقی

بقول غالب ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی　　　چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

اسی کے مصداق شاعری جو ایک نہایت ترقی یافتہ فنِ لطیف ہے، اپنی لطافتوں کی جلوہ گری کے لیے کسی نہ کسی صورت میں کثافتوں کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ خود ہمارے جذبات و احساسات بھی ہمارے گرد و پیش کے حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ہمارا ماحول اور معاشرہ جن عوامل سے متاثر ہوتا ہے، ان میں مذہب، عقائد اور معاشی صورتحال کے ساتھ ساتھ سیاست کو بھی غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ سیاست کا تعلق اقتدار سے ہوتا ہے اور اقتدار اپنی قوت کی وجہ سے معاشرے پر دیگر عوامل کے مقابلے میں زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ معاشرے پر سیاست کے اثرات زیادہ تر منفی نوعیت ہی کے ہوتے آئے ہیں۔ اس لیے کہ اقتدار کی طمع نے ہمیشہ انسانی قدروں کو پامال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ دانش نے ہمیشہ سیاست کی اس پر خطر کج روی اور ارباب اختیار کی مردم آزاری کے خلاف نہ صرف آواز بلند کی ہے بلکہ اپنی تحریروں کے ذریعے سیاسی انقلابات کی راہ بھی ہموار کی ہے۔ تاریخِ انسانی کے کچھ مختصر اور سنہرے ادوار سے قطع نظر سیاسی بساط پر ہمیشہ خود غرض، حریص اور بے ضمیر افراد ہی چھائے رہے اور اپنی سیاسی و عسکری برتری کو قائم رکھنے اور کمزور قوموں کو اپنا فرماں بردار بنائے رکھنے کے لیے بڑی مکاری اور سفاکی کے ساتھ ان کے حقوق چھینتے رہے۔ سیاست کا سیدھا سادہ مفہوم وہ نظام اور طریقہ کار ہے جو کسی مملکت اور اس کے عوام کی ترقی اور بہبودی کے لیے اختیار کیا جاتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ اہلِ ہوس نے اس کی مٹی خراب کی ہے۔ ایسے ہی بد عنوان افراد نے سیاست اور سیاست داں جیسے الفاظ کو بدنام کر رکھا ہے۔ آخر سیاست اور سیاست داں انسانی معاشرے کی ترقی اور بہبودی سے زیادہ اس کے لیے ضرر رساں کیوں ہو گئے ہیں؟ اس سوال کا بھرپور جواب ہم کو اقبال کے اس شعر میں مل جاتا ہے کہ ؎

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ہمارا سابقہ ایسی ہی سیاست سے رہا ہے جس کو اقبالؔ نے چنگیزی سے تعبیر کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مشرق ہو کہ مغرب، عوام ہوں کہ خواص، کہیں بھی سیاست اور خاص طور پر برسر اقتدار سیاست دانوں کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں ملتی۔ شاعر اور ادیب ہمارے سماج کا سب سے حساس طبقہ ہوتا ہے۔ اس کا خیال بھی یہی ہے کہ سیاست داں عوام کی توقعات کے مطابق اپنے فرائض انجام نہیں دیتے۔ مثلاً جگرؔ کہتے ہیں:

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

سردار جعفری کی سیاسی نظمیں

علی سردار جعفری کا شمار ترقی پسند تحریک کے سب سے اہم اور نمائندہ شعراء میں ہوتا ہے اور ترقی پسند تحریک کی بنیاد ایک مخصوص سیاسی اور اقتصادی نظریے پر قائم ہے جو اشتراکی نظام یا کمیونزم کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسی کمیونسٹ تحریک کے زیر اثر روس اور چین میں انقلابی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۵ء کے دوران ہندوستان میں بھی کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ برطانوی حکومت نے اس پر پابندیاں عائد کر رکھی تھیں اس لیے کھلے عام اس کا پرچار نہیں ہوتا تھا۔ جو لوگ کمیونزم سے دلچسپی رکھتے تھے وہ رازدارانہ انداز میں اس انقلابی نظام سے متعلق لٹریچر ایک دوسرے کو پہنچایا کرتے تھے۔ ان میں زیادہ تر لوگ شاعر اور ادیب تھے۔ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کے نتائج سبھی پر عیاں تھے تاہم یہ دانشور طبقہ ان خرابیوں کو زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کر رہا تھا اور اس کی نظر میں کمیونزم ہی ایک ایسا متبادل سیاسی نظام تھا جو ہندوستان جیسے کثیر آبادی والے ملک کے لیے موزوں ہو سکتا تھا جہاں غربت و امارت کے درمیان بہت بڑی خلیج تھی۔ عوام کی اکثریت افلاس کا شکار تھی اور ملک کی دولت پر کچھ گنے چنے لوگوں کی اجارہ داری تھی۔ اس کے نتیجے میں عوام کو کئی مسائل کا سامنا تھا۔ وہ ایک ایسی تبدیلی چاہتے تھے جس میں ان کے دکھ درد کا علاج ہو۔ ہندوستانی دانشوروں کے ایک بڑے طبقے نے یہ مان لیا تھا کہ ان عوامی مسائل کا حل صرف کمیونسٹ نظام ہی میں ممکن ہے۔ اسی نظریے کے تحت انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا اور اُردو کے بیش تر ادیب اور شاعر اس تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے۔ یہ حضرات روسی انقلاب سے بہت متاثر تھے اور ہندوستان میں بھی ایسا ہی انقلاب دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان ادیبوں اور شاعروں نے یہ طے کر لیا کہ وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے عوامی شعور کو بیدار

کریں گے اور یہ بتائیں گے کہ سرمایہ دارانہ نظام ایک ایسی لعنت ہے جس سے چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہے اور اشتراکیت ہی اس کا بہترین متبادل ہے جو غریب عوام کو آلام و مصائب سے نجات دلا سکتی ہے اور تمام شہریوں کے لیے مساوات کی ضمانت دے سکتی ہے۔

ترقی پسند تحریک ایک ادبی تحریک ضرور ہے لیکن ساتھ ہی یہ ایک سیاسی نظریے کی علم بردار بھی ہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات میں اس سیاسی نظریے کے ہلکے، گہرے رنگ صاف طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک ترقی پسند تحریک سے وابستہ اُردو شعراء کا سوال ہے، فیضؔ، مخدومؔ، ساحرؔ اور مجروحؔ کے مقابلے میں سردارؔ جعفری کے یہاں یہ سیاسی رنگ زیادہ گہرا نظر آتا ہے۔ خاص طور پر ان کی نظموں میں ان کی سیاسی فکر زیادہ نمایاں ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ سردارؔ جعفری کے مطابق ''انقلاب محض سیاسی اور معاشی نہیں بلکہ اقدار اور نفسیات کا ہوتا ہے جس کی ضرورت زندگی کے تمام شعبوں میں ہوتی ہے اور اس کی عکاسی ادب میں ہوتی ہے''۔

سردارؔ جعفری کے اس جملے کا ایک مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں جس تبدیلی یا انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے اس کا اظہار ادب میں ہوتا ہے۔ یعنی ادب انقلاب کی ضرورت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس جملے کا ایک دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں جو انقلاب آچکا ہے، اس کا عکس ادب میں نظر آتا ہے۔ چوں کہ ہمارے یہاں وہ انقلاب نہیں آیا جس کا خواب ہمارے ترقی پسند شاعروں نے دیکھا تھا، اس لیے سردارؔ جعفری کے اس جملے کا پہلا مفہوم ہی زیادہ درست معلوم ہوتا ہے کہ ادب انقلاب کی ضرورت کا احساس دلاتا ہے اور لوگوں میں اس کا شعور پیدا کرتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد یہاں نافذ ہونے والے سیاسی نظام کے سلسلے میں ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی جو توقعات تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں۔ وہ جس انقلاب کا انتظار کر رہے تھے وہ انقلاب تو نہیں آیا۔ اسی لیے ہم کو فیضؔ کے یہاں ''صبح آزادی'' اور مخدومؔ کے یہاں ''چاند تاروں کا بن'' جیسی نظمیں ملتی ہیں۔ خود سردارؔ جعفری کی نظم ''فریب'' بھی اسی نوعیت کی نظم ہے۔ اس کے چند مصرعے یہ ہیں:

کون آزاد ہوا؟
کس کے ماتھے سے سیاہی چھوٹی؟

میرے سینے میں ابھی درد ہے محکومی کا

مادرِ ہند کے چہرے پہ اداسی ہے وہی

خنجر آزاد ہیں سینوں میں اُترنے کے لیے

موت آزاد ہے لاشوں پہ گزرنے کے لیے

ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ فیضؔ اور مخدومؔ کے مقابلے میں سردار جعفری کے یہاں سیاسی اور انقلابی رنگ زیادہ نمایاں ہے۔

اپنی کتاب ''پیراہن شرر'' (۱۹۶۶ء) میں حرف اول کے تحت سردار جعفری لکھتے ہیں:

''دوسروں کے نفس سے پہلے اپنے نفس سے جہاد ضروری ہے۔ معاشی اور سیاسی نظاموں کی ناانصافیوں کو پہچاننا اور ان کے خاتمے کے لیے لڑنا برحق ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ صدیوں کی نفرت، ہوس، بدی، خودغرضی، غلط احساسِ برتری اور اس قسم کے دوسرے تاریک جالوں سے دل و دماغ کی صفائی بھی برحق ہے۔ اس کے بغیر نہ تو دنیا سے جنگوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے اور نہ ناانصافیاں ختم ہوسکتی ہیں...... میری یہ نئی نظمیں جو پیراہن شرر پہنے کھڑی ہیں سیاسی دستاویزیں نہیں ہیں۔ واقعات ان کی تخلیق میں کارفرما ضرور ہیں لیکن یہ واقعات کا بیان نہیں بلکہ ان سے پیدا ہونے والے کرب کا اظہار ہیں۔''

لیکن سیاست ان نظموں کی محرک ضرور ہے۔ وہ خود کہتے ہیں:

''گذشتہ چند سالوں کے اندر تیسری جنگ عظیم کا محور یورپ سے ایشیا میں منتقل ہوگیا ہے، کیونکہ ایشیا اور افریقہ کے آزاد ہونے والے ملک جو کل تک غلام تھے دنیا کی بڑی طاقتوں کے توازن میں فرق پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اب ویتنام سے کشمیر تک ایک نیم دائرہ ہے جو ہمالے کی چوٹیوں سے گزرتا ہوا جہلم کی وادیوں تک پہنچ جاتا ہے اور اس میں ایشیائی اقوام کی آرزوؤں اور امیدوں کے ساتھ دنیا کی بڑی طاقتوں کے مفادات اور سیاسی مصلحتوں کی بجلیاں چمک رہی ہیں۔'' (پیراہن شرر۔ ص ۲۲)

ہم سردار جعفری کی سیاسی بصیرت اور ان کی دوربینی کا اندازہ پچھلے دو دہوں کے دوران پیش آئے ان ہولناک واقعات سے لگا سکتے ہیں جن میں مغربی طاقتوں نے ایک باقاعدہ سازش کے تحت عراق اور افغانستان

جیسے ایشیائی ممالک کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا ہے اور ساتھ ہی لیبیا، مصر اور سوڈان جیسے افریقی ممالک کو فتنہ و فساد کا شکار بنا کر انہیں پھر سے اپنا غلام اور دست نگر بنانے کی مذموم کوشش میں مصروف ہیں۔ انسانی حقوق اور جمہوریت کی علمبرداری کا دعویٰ کرنے والوں نے خود انسانی حقوق کو جس بربریت کے ساتھ پامال کیا ہے اور جن بہانوں سے جمہوری اصولوں کے پرخچے اُڑائے ہیں، اس کا تماشہ ہم سب نے دیکھا ہے۔ سردار جعفری نے بالکل درست کہا تھا کہ تیسری جنگ عظیم کا محور یورپ سے ایشیا میں منتقل ہو گیا ہے۔ سردار جعفری کا یہ خیال اس طرح بھی درست ثابت ہو رہا ہے کہ ایشیائی اور افریقی ممالک اپنی آزادی کی نصف صدی کے بعد اپنی اپنی حدود میں ایک پرامن نظام حکومت کو بحال کرنے اور اپنی معیشت کو مستحکم کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں اور ان میں سے کچھ ممالک عسکری قوت کے طور پر اُبھر رہے ہیں۔ امریکہ اور اس کے یورپی حلیفوں کو یہ بات کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتی کہ جو قومیں ان کی غلام رہی ہیں وہ ان کو آنکھیں دکھانے لگیں۔ دوسری طرف تیل اور دیگر معدنیات سے مالامال ایشیائی اور افریقی ملکوں کا سوال ہے، یہ مغربی ممالک ان سے خراج وصول کرتے ہیں۔ جب تک وہ خراج دیتے رہیں گے تب تک وہ محفوظ و مامون رہیں گے۔ جب بھی کسی نے اس ظلم و زبردستی کے خلاف آواز اُٹھائی، تو بلا تکلف اس پر بمباری کر کے اُسے تباہ و برباد کر ڈالا۔ کس میں اتنی ہمت ہے کہ ان سے سوال کرے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل کو توان طاقتوں نے ایک طویل عرصے سے اپنا یرغمال بنا رکھا ہے۔ بلکہ یہ بین الاقوامی ادارے تو مظلوم اقوام کے خلاف ان ظالم و جابر قوتوں کے لیے پلیٹ فام اور ان کے ترجمان بنے ہوئے ہیں۔ ایسے اداروں کے بارے میں اقبال نے کیسی سچی بات کہی تھی کہ۔

من ازیں بیش نہ دانم کہ کفن دزدے چند　　　بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

اب اپنی فریاد لے کر کوئی جائے تو کہاں جائے۔ وہ قومیں جن پر ابھی ایسی آفت نہیں آئی ہے وہ مظلوم قوم کے حق میں آواز اُٹھانے سے گریز کرتی ہیں کہ کہیں ان کا بھی وہی حشر نہ ہو جائے۔ سردار جعفری نے سیاست کے ایسے کئی رنگ دیکھے تھے اور وہ کسی بھی صورت میں جنگ کے خلاف تھے کہ اس کا حاصل تباہی و بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ''پیراہن شرر'' میں شامل اپنی ایک نظم ''دعا'' میں کہتے ہیں:

پھر چلا جنگ کا دیوتا / سرخ شعلوں کے خنجر کو تانے ہوئے / خون کی پیاس سے / گوشت کی بھوک سے / چیختا اور چنگھاڑتا / آسمانوں میں عفریت کی طرح اُڑتا ہوا / موت کی طرح دھرتی پہ چلتا ہوا

/ اس کا آغاز سب کچھ ہے / انجام کچھ بھی نہیں / حاصل قتل و غارت ہے کیا / چند اُجڑے ہوئے شہر، جھلسے ہوئے راستے / سرنگوں بیوگی / اشک آلودہ و زخم خوردہ یتیمی / اپنے قبضے میں اک بے بسی کے سوا کچھ نہیں / نالے بیکار فریاد بے سود ہے / آؤمل کر محبت کو آواز دیں / نیکیوں کو پکاریں!

ملک کی تقسیم کے بعد سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سیاسی سطح پر جس دشمنی کو پروان چڑھایا جاتا رہا ہے وہ ایک ایسی مصنوعی دشمنی ہے جس سے سرحد کی دونوں جانب کے فوجیوں اور عوام کے جان و مال کا نقصان ہوا ہے لیکن سیاست داں اس سے ضرور مستفید ہوتے آئے ہیں۔ جہاں تک عوام کا سوال ہے وہ کسی بھی جنگ کو پسند نہیں کرتے۔ اس لیے کہ کتنے ہی ہندوستانی ایسے ہیں جن کی جائے پیدائش پاکستان ہے جہاں ان کے چھوڑے ہوئے گھر ہیں اور جہاں کے گلی کوچوں سے انہیں لگاؤ ہے۔ بالکل اسی طرح کتنے ہی پاکستانی ایسے ہوں گے جن کی آدھی عمر ہندوستان میں گزری اور باقی آدھی پاکستان میں اور پھر جب ہندوستانی اور پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کی بات ہے تو وہ کب چاہیں گے کہ آپس میں جنگ چھیڑ لیں۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ سیاست نے انہیں تقسیم کر رکھا ہے لیکن وہ تو ایک دوسرے سے ملنا چاہیں گے آپس میں کچھ کہنا سننا چاہیں گے۔ سردار جعفری نے اپنی ایک نظم ''کون دشمن ہے؟'' میں اسی کیفیت کو پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ہمارے پاس ہے کیا درد مشترک کے سوا
مزا تو جب تھا کہ مل کر علاج جاں کرتے
خود اپنے ہاتھ سے تعمیر گلستاں کرتے
ہمارے درد میں تم اور تمہارے درد میں ہم
شریک ہوتے تو پھر جشن آشیاں کرتے

تم آؤ گلشن لاہور سے چمن بر دوش
ہم آئیں صبح بنارس کی روشنی لے کر
ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر
اور اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے؟

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہوئی جنگوں اور خوں ریزی کے پس منظر میں کہی گئی ان کی ایک اور نظم ''صبح فردا'' بھی ہے جو ''پیراہن شرر'' میں شامل ہے۔ اس کے دو بند یہ ہیں:

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے
اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبح آزادی
یہ سرحد خون کی اشکوں کی آہوں کی شراروں کی
جہاں بوئی تھی نفرت اور تلواریں اُگائی تھیں

یہ سرحد جو لہو پیتی ہے اور شعلے اگلتی ہے
ہماری خاک کے سینے پہ ناگن بن کے چلتی ہے
سجا کر جنگ کے ہتھیار میداں میں نکلتی ہے
میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبح فردا کا

سردار کی یہ دونوں نظمیں ''کون دشمن ہے'' اور ''صبح فردا'' سرحد کی دونوں جانب بہت پسند کی گئیں۔ ان دونوں نظموں کے آہنگ میں ویسی شدت نہیں جیسی ان کی دوسری کئی سیاسی نظموں میں محسوس ہوتی ہے۔

سردار جعفری کے مزاج میں شروع ہی سے تیزی، طراری اور سرکشی کا عنصر موجود تھا۔ کوئی بھی چیز ان کی مرضی کے خلاف ہو تو وہ اس کو قبول نہیں کرتے تھے۔ ان کو شروع میں ایک دینی مدرسے میں داخل کیا گیا تھا لیکن وہاں کی پابندیاں ان کے لیے نا قابل برداشت تھیں۔ وہ بار بار وہاں سے بھاگ آتے تھے۔ پھر انہوں نے بتا دیا کہ مدرسے میں ان کا دل نہیں لگتا اور یہ کہ وہ انگریزی پڑھنا چاہتے ہیں۔ تب ان کے والد نے سردار کے لیے انگریزی اور حساب جیسے ضروری مضامین پڑھانے کے لیے گھر پر ایک ٹیوٹر مقرر کر دیا تا کہ اس کے بعد ان کا داخلہ کسی انگریزی اسکول میں ہو سکے۔ ۱۹۳۳ء میں انہوں نے اس انگریزی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور گریجویشن کے لیے علی گڑھ کالج میں داخلہ لیا۔ علی گڑھ ہی میں اختر حسین رائے پوری، سبط حسن، حیات اللہ انصاری، منٹو، خواجہ احمد عباس، شکیل بدایونی، جاں نثار اختر، اختر انصاری، آل احمد سرور اور عصمت چغتائی جیسی شخصیتوں سے ان کی ملاقات ہوئی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عبدالعلیم، خواجہ منظور حسین، ڈاکٹر رشید جہاں اور ڈاکٹر محمد اشرف جیسے اساتذہ سے متاثر ہوئے۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ طلباء یونین کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ پھر اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔

سردارؔ پر ترقی پسند تحریک کا اثر ہونا ایک فطری بات تھی۔ اس لیے کہ وہ ایک جوشیلی طبیعت کے مالک تھے اور کسی بھی طرح کی ناانصافی اور ظلم کے خلاف سینہ سپر ہو جاتے تھے۔ کانگریس کی طرف سے کی گئی ایک ہڑتال کے دوران برطانوی حکومت کے خلاف سردارؔ نے ایک پر جوش تقریر کی جس کے نتیجے میں ان کو کالج سے نکال دیا گیا۔ اسی لیے ان کو بی۔ اے۔ کا امتحان اینگلو عربک کالج دہلی سے پاس کرنا پڑا۔ اس کالج میں قیام کے دوران وہ کمیونزم سے متعلق لٹریچر خرید کر پڑھتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ہندوستانی اپنے ملک کی آزادی کے لیے تحریک چلا رہے تھے جس میں دن بہ دن شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ انگریز حکومت آزادی کی اس تحریک کو دبانے کے لیے تمام ناجائز حربے استعمال کر رہی تھی جن میں تحریر و تقریر پر پابندی سے لے کر ''رولٹ ایکٹ'' تک شامل تھا جس کے مطابق کسی بھی شخص کو بغیر مقدمہ چلائے مہینوں جیل میں قید رکھا جا سکتا تھا۔ اس کی سخت مخالفت ہوئی لیکن حکومت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ انگریزوں نے ہر احتجاج کو سختی کے ساتھ کچلنے کی روش اختیار کی یہاں تک کہ جلیان والا باغ جیسا واقعہ پیش آیا جہاں انگریزوں کی بربریت اور سفاکی اپنی انتہا پر نظر آتی ہے۔ ان حالات میں سردارؔ نے بھی بڑی شدت کے ساتھ انگریزی سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کرنا شروع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداء ہی سے سردارؔ جعفری کی نظموں میں سیاسی عنصر نظر آتا ہے۔ ''پرواز'' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۴۴ء میں اشاعت گھر، حیدرآباد سے شائع ہوا تھا۔ اس شعری مجموعے میں ''مزدور لڑکیاں''، ''سرمایہ دار لڑکیاں''، ''اشتراکی''، ''ارتقاء و انقلاب''، ''جنگ اور انقلاب''، ''سامراجی لڑائی''، ''تخریب کے دیوتا''، ''انقلاب روس'' اور ''تعمیرِ نو'' جیسے عنوانات پر نظمیں ملتی ہیں۔ سردارؔ جعفری کی سیاسی نظموں میں اکثر و بیشتر ہم کو ایک انقلابی جوش اور شدت پسندی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فرسودہ نظام کو بدلنے کے لیے اگر تشدد کی ضرورت ہو تو اس کا سہارا لینا چاہیے۔ یہاں سردارؔ جعفری کی کچھ ایسی نظموں کے ایک دو بند پیش ہیں جن میں ان کا سیاسی جوش و جذبہ بہت نمایاں ہیں۔ ان کی نظم ''بغاوت'' کا یہ بند ملاحظہ فرمائیں:

بغاوت عصر حاضر کے سپوتوں کا ترانہ
بغاوت دور حاضر کی حکومت سے ریاست سے
بغاوت سامراجی نظم و قانونِ سیاست سے
بغاوت سخت پتھر کی طرح بے حس خداؤں سے
بغاوت مفلسی کی عاجزانہ بددعاؤں سے
بغاوت درد سہنے سے بغاوت دکھ اُٹھانے سے
بغاوت ایک انساں کے سوا سارے زمانے سے
بغاوت حریت کے دیوتا کا آستانہ ہے

جنوری ۱۹۴۶ء میں گوالیار میں حکومت کے خلاف ایک احتجاجی جلوس نکالا گیا۔ انگریزی سرکار کے حکم پر کچھ دیسی افسروں نے جلوس پر گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ اس میں ایک کمسن لڑکا ہلاک ہو گیا تھا۔ اس واقعے پر سردار جعفری نے ''گوالیار'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ اس کے کچھ شعر یہ ہیں:

یہ دیسی حکمراں جو نسلِ انسانی سے خارج ہیں
وہ کہتے ہیں جنہیں انگریز آقاؤں نے پالا ہے
بھیانک ان کی روحیں ہیں تو مردہ ہے ضمیر ان کا
سفید ان کی رگوں کا خون ہے دل ان کا کالا ہے
کروڑوں مفلسوں کا خون جلتا ہے چراغوں میں
جو ان منحوس رجواڑوں کے محلوں کا اجالا ہے
یہ سب بے آسرا مظلوم بیواؤں کے آنسو ہیں
چمکتے موتیوں کی ان کی گردن میں جو مالا ہے
یہ سب برطانیہ کے تاجِ شاہی کے نگینے ہیں
ہر اک ان میں سے بھارت ورش کے سینے کا چھالا ہے

سردار کی ایک اور نظم ''کشاکش'' کے یہ شعر دیکھیے:

میں نے سرمایہ و افلاس کے ہنگامے میں
سینۂ خاک سے اُٹھتا ہوا دیکھا ہے دھواں
سر پہ تلوار ہے شہ رگ پہ دھرا ہے نشتر
گیت اس ساز پہ وہ کون ہے جو گائے گا
اب تو ممکن نہیں اس تلخ حقیقت سے فرار
قوم کا نام ہے اور راج ہے سرمائے کا
بانجھ ہیں بانجھ غریبوں کی دعائیں جن کی
کوکھ سے امن کی دیوی تو نہ پیدا ہوگی
ہاں بدلتی ہے فقط جوشِ عمل سے تقدیر
حریت جنگ کے میداں میں ہویدا ہوگی
کاٹنا پڑتا ہے تلواروں کو تلواروں سے
اپنی طاقت کو ذرا اور بڑھانا ہوگا
ہے زمانے میں تشدد ہی تشدد کا جواب
جبر سے ظلم کی ہستی کو مٹانا ہوگا

آزادی کے بعد دیسی لیڈروں سے خطاب کرتے ہوئے اپنی نظم ''گرد کارواں'' میں سردار کہتے ہیں:

یہ مانا آج سرافراز مثل آسماں تم ہو یہ مانا حریت کی منزلوں کے رازداں تم ہو

یہ مانا فخر عالم، نازش ہندوستاں تم ہو مگر گزرے ہوئے وقت طرب کی داستاں تم ہو

کسانوں سے پریشاں ہو تو مزدوروں سے نالاں ہو

بغاوت سے ہو خائف اشتراکیت سے لرزاں ہو

عدو کو چھوڑ کر اپنوں سے ہی دست و گریباں ہو

خفا ہو دوستوں سے دشمنوں پر مہرباں تم ہو

غرض سردار جعفری کی ایسی کچھ سیاسی نظمیں بھی ہیں جہاں ان کا لہجہ تیکھا اور تیز و تند ہوتا نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ سیاست دانوں کا وہ مکر و فریب ہے جو عوام کے مسائل حل کرنے کی بجائے ان کے لیے نئے مسائل کھڑے کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ سیاست داں ہمیشہ یہی چاہتے ہیں کہ عوام اس بات سے بے خبر ہی رہیں کہ اقتدار و اختیار کو اپنے بس میں کرنے کے بعد سیاست داں کیسی کیسی گھناونی سازشوں، بدعنوانیوں اور لوٹ میں ملوث ہیں۔ اس کے لیے وہ عوام کو مذہب، ذات پات، علاقہ، زبان اور ایسے ہی کئی مسائل میں الجھائے رکھتے ہیں۔ ایسے ملک دشمنوں اور قوم فروشوں سے نرم و ملائم زبان اور دھیمے لہجے میں بات کیسے کی جا سکتی ہے۔ خود سردار کے الفاظ میں تشدد کا جواب تشدد ہی سے دیا جانا چاہیے اور تلواروں کو تلواروں ہی سے کاٹنا پڑتا ہے۔ اسی لیے سردار کی ان سیاسی نظموں میں ہم کو زبان اور لہجے کی تیزی و تندی کا احساس ہوتا ہے۔

سردار جعفری کی کتاب ''نئی دنیا کو سلام'' ایک طویل تمثیلی نظم پر مشتمل ہے۔ اس نظم کا موضوع بھی انقلاب ہے۔ اس کے پیش لفظ میں سردار جعفری لکھتے ہیں:

''یہ منظوم تمثیل نہیں بلکہ تمثیلی نظم ہے۔ اس کے کردار، کردار نہیں، علامتیں ہیں۔ کہانی پلاٹ نہیں بلکہ ایک مبہم سا خاکہ ہے جس کو میں نے رنگ بھرنے کے لیے بنایا ہے۔ واقعات کی بجائے واقعات سے پیدا ہونے والے جذبات و تاثرات اور احساسات پیش کیے ہیں۔ جاوید اور مریم (میاں بیوی) جد و جہد کی علامت ہیں اور فرنگی ظلم کی علامت ہے۔ نامہ بر ہمارا روایتی کردار ہے جس کے فرائض اس نظم میں بدلے ہوئے نظر آئیں گے۔ سب سے زیادہ اہم کردار وہ بچہ ہے جو ابھی پیدا

نہیں ہوا ہے۔ ابھی اس کے نقش ونگار بن رہے ہیں۔ وہ نئی دنیا کی علامت ہے۔ اس کی حسین اور معصوم روح پوری نظم پر حاوی ہے.........میں انسان کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ اس کا ماضی بڑا شاندار ہے اور حال دلکش امکانات سے معمور ہے۔ حالاں کہ آج ہندوستان خانہ جنگی کے کرب میں مبتلاء ہے اور ایسی بہیمانہ حرکتیں ہورہی ہیں جن سے دور وحشت کی درندگی بھی شرمائے گی۔ لیکن یہ بلا بھی ہیضے اور سرطان کی وباؤں کی طرح گزر جائے گی کیوں کہ اس کے خلاف بھی وہی قوتیں جدوجہد کررہی ہیں جو میری نظم میں کارفرما ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جس میں انسان کو شکست ہوئی ہو۔ افراد اور طبقات کو شکست ہوتی رہی ہے اور ہوگی لیکن انسان ناقابل شکست ہے۔ کیوں کہ اس کی محنت، عمل اور جدوجہد اس کے اپنے شعور ہی کی نہیں بلکہ بڑی حد تک اس کے ماحول کی بھی خالق ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ فتح منداور کامران رہے گا۔ یہ عقیدہ جو اندھا عقیدہ نہیں ہے میرا سب سے بڑا انسپریشن ہے۔ میں اس کو ادب اور فن کا ابدی موضوع سمجھتا ہوں۔ سب سے زیادہ شاندار، سب سے زیادہ عظیم المرتبت، سب سے زیادہ حسین انسان ہے۔''

یہ طویل تمثیلی نظم چھ تصویروں یا چھ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلی تصویر میں ہم دیکھتے ہیں کہ تاریکی ہے اور اس تاریکی سے دو چہرے اُبھرتے ہیں۔ ان میں سے ایک مرد ہے اور ایک عورت۔ یہ جاوؔید اور مرؔیم ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہوتے ہیں اور ان کے درمیان فطری طور پر محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ دوسری تصویر میں جاوؔید اور مرؔیم کے درمیان رشتۂ ازدواج قائم ہوتا ہے اور مرؔیم حاملہ ہوتی ہے۔ تیسری تصویر میں ان کی بے سروسامانی اور افلاس کا منظر ہے۔ مریم پھٹے پرانے کپڑوں کو جوڑ کر اپنے ہونے والے بچے کے لیے لباس تیار کرتی نظر آتی ہے۔ چوتھی تصویر میں انقلاب کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ جاوؔید اور مرؔیم دونوں جبر وظلم کے خلاف اس انقلاب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ دونوں کو گرفتار کرکے عدالت میں پیش کیا جاتا ہے۔ فرنگی عدالت جاوؔید کو باغی قرار دے کر سزائے موت سناتی ہے اور مرؔیم کو اس کی حالت کے پیش نظر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مرؔیم بظاہر عدالت کی طرف سے دی جانے والی سزا سے تو بچ گئی لیکن اس کے دردوغم اور اس کی پریشاں حالی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ پانچویں تصویر میں جاوؔید دکھائی دیتا ہے جسے پھانسی دی جانے والی ہے۔ وہ اس سے خوف زدہ نہیں ہے۔ اس کا کردار بتاتا ہے کہ ظلم کی یہ ٹہنی اب زیادہ دن پھلنے پھولنے والی نہیں ہے۔ جبر و ناانصافی کی یہ سیاہ رات اب ختم ہونے کو ہے اور اب جلد ہی آزادی اور حق وانصاف کا سویرا ایک نئی روشنی لے کر

آئے گا۔ چھٹی تصویر میں مریم جاوید کے فراق میں آہ وزاری کرتی ہے، جاوید کو ''میرے ہندوستاں کے سپاہی، اے محبت کی منزل کے راہی'' کہہ کر پکارتی ہے۔ اپنی محبت کے زمانے کا ذکر کرتی ہے اور کسی طرح قید سے نکل آنے کے لیے کہتی ہے۔ جاوید تو نہیں آتا البتہ اس کا خط لے کر نامہ بر آتا ہے۔ وہ مریم کے آگے جاوید کی بہادری اور اس کی قربانی کی عظمت بیان کرتا ہے۔ پھر وہ خط مریم کے حوالے کرتا ہے جو جاوید نے اپنے ہونے والے بچے کے نام لکھا تھا۔ خط میں وہ اپنے بچے کو یوں مخاطب کرتا ہے:

محبت کے ننھے شرارے سلام	اندھیرے کے روشن ستارے سلام
ابھی بن رہے ہیں وہ نقش ونگار	کہ جن کا زمانے کو ہے انتظار
مبارک تجھے گردش ماہ و سال	اُبھرنے ہی کو ہیں ترے خط وخال
کلی تیری ہستی کی کھل جائے گی	مسرت تری ماں کو مل جائے گی
ترے نقش کو بخش دے گی ثبات	پلائے گی وہ تجھ کو آب حیات

اس کے بعد سردار نے ''حرف آخر'' کے عنوان سے کچھ شعر کہے ہیں۔ ان میں ظلم واستبداد کا ذکر ہے اور پھر اس کے خلاف حریت کی جدوجہد کا بیان ہے کہ وطن کے مجاہد اس ظلم کا خاتمہ کرنے کے لیے قدم بڑھاتے آرہے ہیں۔ اس کتاب کے دوسرے باب یا دوسرے حصے میں ''جمہور'' کے عنوان سے ایک مثنوی ہے جس کا موضوع بھی سیاست ہے۔ اس مثنوی کے پیش لفظ میں سردار جعفری لکھتے ہیں:

''اُردو میں سیاسی مثنوی کا رواج نہیں ہے ''جمہور'' اس قسم کی پہلی چیز ہے عوام سب سے بڑی حقیقت ہیں۔ ان کے خواب سب سے سہانے خواب ہیں۔ ان کا نصب العین سب سے بلند نصب العین ہے۔ وہ سماج اور تاریخ کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہے ہیں۔ زندگی انھی سے حرارت حاصل کرتی ہے اور رنگِ شعر وادب انھی سے حسن وقوت حاصل کرسکیں گے۔ اس درخت کی پتیاں توڑی جاسکتی ہیں، شاخیں کاٹی جاسکتی ہیں لیکن اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ انھی سے نئی کونپلیں پھوٹیں گی نئی پتیاں نکلتی رہیں گی اور نئے پھول کھلتے رہیں گے۔''

سردار جعفری کی یہ مثنوی ''جمہور'' یوں شروع ہوتی ہے:

اُٹھو ہند کے باغبانو اُٹھو	اُٹھو انقلابی جوانو اُٹھو
کسانو اُٹھو کامگارو اُٹھو	نئی زندگی کے شرارو اُٹھو

اُٹھو کھیلتے اپنی زنجیر سے　　　اُٹھو خاکِ بنگال وکشمیر سے
غلامی کی زنجیر کو توڑ دو　　　زمانے کی رفتار کو موڑ دو

اس نظم میں سردار جعفری نے اقبال کی مثنوی ''ساقی نامہ'' کے کئی اشعار سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس نظم کا ایک حصہ ''جمہور کا اعلان نامہ'' اقبال کے اشعار ہی سے شروع ہوتا ہے۔ باقی اشعار سردار کے ہیں۔ مجموعی طور پر اس نظم میں یہ بتایا گیا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کو خوب لوٹا ہے اور جمہور کا حق چھینا ہے۔ لیکن ہندوستانی بھی ہار ماننے والے نہیں۔ وہ ہر قیمت پر اپنا حق لے کر رہیں گے۔ چناں چہ سردار کہتے ہیں۔

نئی دیں گے ماتھوں کو تنویر ہم　　　بدل دیں گے انساں کی تقدیر ہم

''ایک خواب اور'' سردار جعفری کا مشہور شعری مجموعہ ہے۔ اس میں بھی ہم کو کئی سیاسی نظمیں مل جاتی ہیں۔ ایسی بیشتر نظموں میں ہم کو وہی انقلابی گھن گرج سنائی دیتی ہے جو جوش اور سردار جعفری سے مخصوص ہے۔ مثال کے طور پر کچھ نظموں کے بند دیکھیے:

تیرگی کی سازشیں بدبختیوں کا اژدہام　　　کوچۂ احساس میں ہنگامۂ شور نشور
ہر طرف پھیلی ہوئی ہے خنجروں کی روشنی　　　ہر طرف بکھرا ہوا ہے ایک خوں آلودہ نور
مشعلِ جاں شعلہ ساماں دردِ انساں سربلند　　　ظلم کی شامیں مبارک غم کی راتیں ارجمند
کس قدر سفاک ہیں ان قاتلوں کے خط و خال　　　کتنی تابندہ شہیدانِ وفا کی ہے جبیں
(نظم: ''خنجروں کی روشنی'')

اس پہ بھولے ہو کہ ہر دل کو کچل ڈالا ہے　　　اس پہ پھولے ہو کہ ہر گل کو مسل ڈالا ہے
اور ہر گوشۂ گلزار میں سناٹا ہے
کسی سینے میں مگر ایک فغاں تو ہوگی　　　آج وہ کچھ نہ سہی کل کو جواں تو ہوگی
وہ جواں ہو کے اگر شعلۂ جوالہ بنی　　　وہ جواں ہو کے اگر آتش صد سالہ بنی
خود ہی سوچو کہ ستم گاروں پہ کیا گزرے گی　　　(نظم: ''ایک بات'')

''ایک خواب اور'' میں شامِ غم، تن کی چاندی من کا سونا، اہلِ درد، کوچۂ چاک گریباں، مشرق و مغرب، ہاتھوں کا ترانہ اور قتلِ آفتاب بھی اسی رنگ کی نظمیں ہیں۔ البتہ 'قتلِ آفتاب' میں سردار کا لہجہ قدرے نرم ہے۔ نظم کی استعاراتی زبان اور رہم رسُر فیض کی یاد دلاتے ہیں:

شفق کے رنگ میں ہے قتلِ آفتاب کا رنگ
افق کے دل میں ہے خنجر، لہولہان ہے شام
سفید شیشۂ نور اور سیاہ بارشِ سنگ
زمیں سے تابہ فلک ہے بلندرات کا نام

ہزار لب سے زمیں کہہ رہی ہے قصۂ درد
ہزار گوش جنوں سن رہے ہیں افسانہ
جوان خوابوں کے جنگل سے آرہی ہے نسیم
نفس میں نکہت پیغامِ انقلاب لیے
خبر ہے قافلۂ رنگ و نور نکلے گا
سحر کے دوش پہ اک تازہ آفتاب لیے

سرؔدار جعفری کے شعور نے ایک ایسے ہنگامہ خیز دور میں آنکھیں کھولیں جو سیاسی اعتبار سے نہایت اتھل پتھل کا دور تھا۔ سامراجی طاقتیں جو ایک طویل عرصے سے ایشیا اور افریقہ کی کمزور قوموں کا خون چوس رہی تھیں اب ان قوموں کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا کر رہی تھیں۔ اور پھر دوسری جنگ عظیم میں یہی سامراجی طاقتیں جاپان اور جرمنی کے خلاف آپس میں متحد تھیں۔ اس صورت حال میں ان کو اپنی محکوم قوموں کی مدد کی ضرورت تھی تاکہ ہٹلر کو شکست دی جا سکے۔ وہ ان قوموں کی دولت تو لوٹ چکے تھے اب افرادی قوت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ کئی قوموں نے آزادی کی شرط پر ان کی مدد کرنے کے لیے آمادگی ظاہر کی۔ ایسے ملکوں میں ہندوستان بھی شامل تھا۔ ۱۹۴۵ء میں دوسری جنگ عظیم ختم ہوگئی لیکن ہندوستانیوں کو اپنی آزادی کے لیے مزید دو سال تک انگریزوں کے ظلم سہنے پڑے۔ سرؔدار جعفری ان حالات کے صرف تماشائی نہیں تھے بلکہ انہوں نے عملی طور پر سیاست میں حصہ لیا تھا اور قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلی تھیں تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے ان سیاسی تجربات و مشاہدات اور اپنے سیاسی نظریے کو اپنی شاعری کا موضوع نہ بناتے۔ سرؔدار ہی کے قول کے مطابق ان کی نظمیں ان کے عہد کی تصویریں ہیں۔ اس طرح ان کی سیاسی نظمیں ادبی فن پاروں کے ساتھ ساتھ تاریخی دستاویز کی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔

پروفیسر مقبول فاروقی آندھرا یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو رہ چکے ہیں۔

سردار جعفری اور امن کی شاعری

ڈاکٹر بی بی رضا خاتون

سردار جعفری کی شاعری کے متعلق ایک عام خیال یہ ہے کہ انھوں نے صرف انقلابی شاعری کی ہے۔ ان کے تمام مجموعہ ہائے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو یہ مفروضہ غلط ثابت ہوتا ہے۔ جہاں ان کی شاعری میں سامراجیت کے خلاف بغاوت اور غیر متوازن معاشی و سماجی نظام کے خلاف انقلابی رجائیت ہے وہیں رومان' امن و امان کا پیغام اور انسانیت کے لیے دردمندی بھی ہے۔ دراصل ان کی شاعری کا موضوع بنیادی طور پر انسانیت ہے۔ جو شاعر کے مطابق دورِ حاضر میں عنقا ہوتی جارہی ہے۔

آہ یہ جنسِ فراواں کس قدر نایاب ہے
ڈھونڈتے پھرتے ہیں انسانوں کو انسانوں میں ہم

آج کل ایک اصطلاح pacifism یا امن پسندی پر بہت گفتگو ہورہی ہے۔ Pacifism کسی بھی مناقشت' تنازعہ یا فائدے کے لیے کسی بھی قسم کی جنگ اور تشدد کی قطعی طور پر مخالفت کرنا ہے۔ سردار جعفری کی شاعری کا خاصا بڑا حصہ اسی نظریہ کی ترجمانی کرتا ہے۔ انقلابیت' اشتراکیت اور ترقی پسندی کی طرح امن پسندی بھی ان کی شاعری کا ایک اہم عنصر ہے۔ وہ جنگ کے تمام نظریات (theories) کو مسترد کردیتے ہیں۔ سردار جعفری کے تصورِ امن کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ صرف سرحدوں پر لڑی جانے والی خارجی جنگوں کو ختم کر کے امن کی بحالی نہیں چاہتے بلکہ کرۂ ارض پر جتنی داخلی جنگیں جیسے رنگ و نسل' علاقائیت' مذہب' زبان کے نام پر لڑی جارہی ہیں۔ انھیں ختم کر کے زندگی کو پُرسکون اور خوشحال بنانا چاہتے ہیں اس جانب توجہ مبذول کرانے کے لیے سردار جعفری اردو کی کلاسیکل شاعری کے استعارات بت' کعبہ' شیخ و برہمن کے استعمال سے کتنی گہری معنویت پیدا کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

کعبۂ دل میں بیٹھے ہیں اب بھی صدیوں کے فرسودہ بت
رنگ و نسل وشیخ و برہمن، مذہب و ملت ملک و وطن
لے کر پھر قندیل محبت اترو دل کے اندھیرے میں
روح کی تاریکی کو روشن کرتی نہیں سورج کی کرن

قندیل محبت ہی روح کو روشن کرسکتی ہے۔ وہ انسان کو ایک کامل انسان کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔اور کامل انسان کا ان کا تصور بہت فلسفیانہ یا مافوق الفطری (Supernatural) نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسا انسان ہے جو محبت اور انسانی دردمندی کا حامل ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ یہی وہ جذبات ہیں جو انسان کو انسان بناتے ہیں۔انسان میں فطرتاً مثبت اور منفی رویے موجود ہوتے ہیں لیکن محبت اور دردمندی منفی رویوں کو ختم کر کے انسان میں ایک دوسرے کے لیے احترام، ہمدردی، انصاف پسندی، امن پسندی اور ہم آہنگی کے جذبات کو ابھارتی ہے۔

سردار جعفری کے تصور انسانیت میں کامل انسان وہ ہے جس کے دل میں دوسرے انسانوں کے لیے دردمندی ہو احترام و محبت ہو۔اسی لیے استالن ان کا ideal ہے۔ جب انسان میں وہ یہ خوبیاں تلاش کرتے ہیں تو ان کی نظر استالن پر جا کر رک جاتی ہے۔ جس نے سوویت یونین کو خوابوں سا حسین بنا دیا۔ جہاں مساوات ہے خوشحالی ہے امن و امان ہے۔ سردار جعفری امن کا ستارہ کے پیش لفظ میں استالن کے لیے لکھتے ہیں۔

''استالن اسی انسان کا معمار ہے، وہ دیوتا، پیغمبر اور اوتار نہیں ہے بلکہ اس انسان کی سب سے مکمل تصویر ہے۔اس لیے ہمارے دل استالن کی محبت اور عقیدت میں سرشار ہیں''

(کلیات علی سردار جعفری جلد اول)

استالین کتھا (ڈھولک پر گانے کے لیے)
آزادی کے لڑنے والوسنو کتھا استالن کی
سارے جگ میں جس کے دم سے اجیاری ہے لینن کی
پونجی کی پاپی دنیا میں جنگوں کی تیاری ہے
استالن کے باغ میں لیکن امن کا چشمہ جاری ہے
امن کی روٹی، امن کا پانی، امن کے نغمے امن کے بار

امن کی کلیاں، امن کی خوشبو، امن کے بلبل اور گلزار
امن کی فصلیں اور بہاریں امن کا گیہوں، امن کا دھان
امن کا قانون، امن کی شکتی، امن کا دستور اور ودھان
امن کا جادو پریم کے دل میں، امن کا شہد نگاہوں میں
امن کی رچنا ہاتھوں میں اور امن کی قوت باتوں میں
شہر اور قصبے امن و امان کی ہنستی ہوئی تصویریں ہیں
آنکھوں میں اب خواب نہیں ہیں خوابوں کی تعبیریں ہیں

سویت یونین میں جو انقلابی تبدیلیاں آئیں انھیں سردار جعفری مثالی قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ وہاں سرمایہ داری، سامراج، ظلم اور استحصال ختم ہو چکا ہے۔ وہاں کے سائنس داں تعمیری کاموں میں اپنے علم اور اپنی صلاحیتوں کا استعمال کر رہے ہیں۔ ایٹم بم بنانے کے بجائے زمین کو زرخیز بنانے اور فصلوں میں اناج کی مقدار کو بڑھانے پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ اور وہاں وہ تمام امتیازات ختم کر دیئے گئے ہیں۔ جس سے سماج میں ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں اور یہی تبدیلیاں وہ ہندوستان میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ جعفری کے نزدیک سماجی و معاشی مساوات کسی بھی ملک میں امن کے ضامن ہیں۔

امن کا ستارہ (ایک شاعرانہ تقریر)

ساری دنیا نے دیکھا کہ انساں کی تخلیق تکمیل کی منزلوں کے قریب آ گئی
اس نے طبقات کی بندشیں توڑ دیں
وہم کی انگلیاں موڑ دیں
اک نئی راہ پر گامزن ہو گیا
اب غلام اور آقا کی تقسیم باقی نہ تھی
کاشتکار اور زمیندار
سرمایہ دار اور مزدور کا فرق باقی نہ تھا
اور انسان انسان تھا

صرف انساں تھا

اپنی تخلیق پر مطمئن

اپنی محنت پہ نازاں

مشترک دردوغم، مشترک ہر خوشی

مشترک نعمتیں، مشترک زندگی

انسان کا انسان بننے کی طرف پہلا قدم ہی امن کی ضمانت ہے۔ اس ضمن میں پیراہن شرر کی نظمیں اور غزلیں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ جنگ بازوں کا فرمان، کون دشمن ہے، صبح فردا اور دستِ فریاد وغیرہ میں جعفری نے امن کا پیغام دیا ہے۔ یہ شعری مجموعہ ان کے شعری وفکری سفر کے ارتقاء کی ایک بہت اہم منزل ہے۔ جہاں ان کی فکر اور فن میں نمایاں تبدیلیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ایک زبردست انقلابی گرجدار لہجے کی جگہ ملائمت اور ٹھہراو پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی آواز ایک امن کے پیمبر کی آواز بن جاتی ہے۔ انسانیت کے لیے دردمندی اور جذبات کی صداقت ان کی نظموں کو جغرافیائی حد بندیوں سے نکال کر آفاقیت کا درجہ عطا کرتی ہے۔ چلی کے شہیدوں کے نام، خون کا اجالا، افغان کے لیے، تہنیت، افریقی لڑکی اور حبشی میرا بھائی اور لِدی تسے جیسی، نظمیں جس کی روشن مثالیں ہیں۔ ان تمام نظموں میں مشترک درد کا رشتہ ہے۔ جعفری کی انسانی دردمندی الفاظ کے پیکر میں ڈھل کر دلوں میں اتر جاتی ہے۔

درد دریا ہے ایک بہتا ہوا

جس کے ساحل بدلتے رہتے ہیں

وہی تلوار، وہی مقتل

صرف قاتل بدلتے رہتے ہیں

سردار جعفری اس درد مشترک کے حوالے سے محبتوں کے ذریعہ جنگوں کو روکنا چاہتے ہیں وہ ان نظموں میں عالمگیر انسانی برداری (Universal brotherhood) کے تصور کو تقویت پہنچانے اور اس کو حقیقت بنانے کی جانب پہل کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہاتھ میں ہاتھ لیے سارا جہاں ساتھ لیے　　　تحفہ درد لیے پیار کی سوغات لیے

سردار جعفری استعاراتی زبان میں کہتے ہیں ہماری محبت میں اتنا تقدس اور ہمارے خلوص میں اتنی صداقت ہو کہ جب ہم کتاب دل کھولیں تو اس میں جنگ و جدل کا کوئی افسانہ نہ ہو۔ اس میں صرف فصل گل ہو، موسم جنگ کا ویرانہ نہ ہو۔

مصحف حق کی طرح کھولیں کتاب دل کو
جس میں جنگ اور جدل کا کوئی افسانہ نہیں
فصل گل، فصل خزاں، فصل زمستاں ہے مگر
موسم جنگ نہیں، موسم ویرانہ نہیں

سردار جعفری جنگ کی تیز و تند آندھی میں بھی امن کا چراغ جلائے رکھتے ہیں۔ تیر و تلوار سے صرف جنگ جیتی جا سکتی ہے دل نہیں، دل تو صرف محبت سے جیتے جا سکتے ہیں۔ وہ استفہامیہ انداز میں کہتے ہیں:

تم تو گھر سے نکلے تھے جیتنے کو دل سب کا
تیغ ہاتھ میں کیوں ہے دوش میں کماں کیوں ہے

یہ تجاہل عارفانہ دوہری معنویت پیدا کرتا ہے۔ سردار اپنے مخاطب کو کہتے ہیں کہ یہ تمہاری سادہ لوحی ہے یا منافقت؟ کیا تم دلوں کو جیتنے کے ہنر سے واقف نہیں؟ اسی لیے ہتھیار لے کر چل دیئے یا تمہاری نیت میں کھوٹ ہے، اس لیے تلوار ساتھ ہے۔

آج دنیا میں انسانیت کی بقا اور امن کے قیام کے لیے جنگیں لڑی جا رہی ہیں۔ سردار جعفری کہتے ہیں کہ جنگ تباہ کاریوں کے سوا کچھ نہیں لا سکتی، نئی کونپلوں کی مہک سے معطر فضائیں بارود کی بو سے سرشار ہو جاتی ہیں، شبنم کی بوندوں کی جگہ خون کے چھینٹے نظر آنے لگتے ہیں۔ جنگ کا حاصل صرف قتل و غارت گری، اجڑے اور جھلسے ہوئے شہر، سرنگوں بیوگی اور اشک آلودہ و زخم خوردہ یتیمی کے سوا کچھ نہیں۔ جنگ میں کسی کو فتح ملتی ہے اور کسی کی شکست ہوتی ہے لیکن نعشوں کے ڈھیر پر زندگی سوگوار ہوتی ہے اور انسانیت کی ہار ہوتی ہے۔ امن کا ستارہ میں جنگ بازوں کے تئیں اپنے غم و غصے کا اظہار سرداریوں کرتے ہیں۔

جنگ باز و خونخوار و/ ہم تمہیں سزا دیں گے/ یہ غرور زرداری/ خاک میں ملا دیں گے/ خون کے پیاسے ہو/ ہم مزا چکھا دیں گے/ وہ نظام وہ دنیا/ جس میں جنگ پلتی ہے/ ایک دن مٹا دیں گے

آخری تین مصرعوں میں سردار جعفری اپنے اس خواب کا اظہار کرتے ہیں جو مجاہدین آزادی نے دیکھا تھا، پورے نظام کو بدلنے کا۔ وہ ایسے سماج کو تشکیل دینا چاہتے ہیں جہاں تمام انسان مساوی ہوں، قوم وملت، مذہب وعلاقائیت اور رنگ ونسل کی تفریق کے بغیر انسان ایک خوشگوار زندگی گزار سکے۔ سماج میں موجود ناہموار یوں بے اعتدالیوں اور ناانصافیوں کو جڑ سے ختم کرنے کے بعد ہی یہ ممکن ہے۔ یہ ہمارا نظام ہی ہے جو مظلوم کو ظالم میں تبدیل کر دیتا ہے۔ پورے نظام میں تبدیلی کے بغیر اس قلب ماہیئت کو نہیں روکا جاسکتا۔

جعفری ملک میں امن کے قیام کے لیے قومی یکجہتی، ہم آہنگی، رواداری، اتحاد واتفاق کو عام کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ وہ یاد دلاتے ہیں کہ ہندوستان میں صدیوں سے مختلف قومیں مل جل کر خوش حال زندگی گزارتی آئی ہیں۔ اس میل ملاپ نے ایک مشترکہ تہذیب کو جنم دیا۔ لیکن انگریزوں کی آمد اور ان کی (Divide and rule policy) نے اس ہم آہنگی میں دراڑیں ڈالیں اور جذبہ منافرت پیدا کیا۔ یہ دراڑیں اتنی گہری ہیں کہ وقت بھی انھیں بھر نہ سکا۔ جس کے نتیجے میں آئے دن فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ تقسیم ہند کے ساتھ ہی رونما ہونے والے فسادات پر وہ شاعر جس نے جدوجہد آزادی میں عملی طور پر حصہ لیا، جیل کی صعوبتیں برداشت کیں آنکھوں میں ان امیدوں کو لیے ؎

لو وہ صدیوں کے جہنّم کی حدیں ختم ہوئیں
اب ہے فردوس ہی فردوس جہاں تک آؤ

لیکن آزادی کے ساتھ ہی تقسیم ہند اور فسادات کے المیے نے ان تمام خوابوں کو چکنا چور کر دیا۔

چکنا چور ہوا خوابوں کا دل کش، دلچسپ آئینہ
ٹیڑھی ترچھی تصویریں ہیں ٹوٹے پھوٹے درپن میں
جانے کس رنگ سے آئی ہے گلستاں میں بہار
کوئی نغمہ ہی نہیں شورِ سلاسل کے سوا

اس رنج وغم میں بھی وہ ناامید نہیں ہیں کہتے ہیں ؎

یہ صبح ہے سورج کی سیاہی سے اندھیری   آئے گی ابھی ایک سحر مہر بچکاں اور

بیسویں صدی کی آخری دہائی میں فرقہ وارانہ فسادات میں جو خون کی ندیاں بہادیں گئیں ان مناظر کو دیکھ کر شاعر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ صدیوں کی رفاقت' ہم آہنگی کو کیا ہو گیا۔ گوتم بدھ جو امن وسلامتی کی علامت ہے۔ ان کی سرزمین پر یہ خون کی برسات دیکھ کر سردار فکرمند ہو جاتے ہیں۔

رام و گوتم کی زمیں حرمتِ انساں کی امیں   بانجھ ہو جائے گی کیا خون کی برسات کے بعد

سردار جعفری ملک میں امن وامان اور ترقی کے لیے آپسی اتحاد کو بے حد ضروری قرار دیتے ہیں۔ وہ خوبصورت و نادر تشبیہات سے ایسے متحرک شعری پیکر تراشتے ہیں۔ جو ایک خاص کیفیت کو ابھارنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

متحد ہو کر اٹھو جس طرح دریا میں ابال   متحد ہو کر بڑھو جس طرح صحرا میں غزال

متحد ہو کر اُڑو جس طرح شاعر کا خیال   متحد ہو کر چلو مانندِ بادِ برشگال

پھر بہار آجائے شاخِ آرزو پھلنے لگے

کھیتیاں شاداب ہو جائیں ہوا چلنے لگے

سردار جعفری اپنی شاعری کے ذریعہ دو ملکوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی مخلصانہ کوشش کرتے ہیں۔ 1965ء کی ہندو پاک جنگ نے انھیں اندر سے جھنجھوڑ دیا۔ بھائی ہی بھائی کے خلاف بندوقیں تان کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آزادی جس کی خاطر جانیں قربان کر دیں تھیں، اتنی قربانیوں کے بعد آزادی کا سورج طلوع ہوا۔ سردار جعفری نادر تشبیہات واستعارات کے ذریعے بتاتے ہیں کہ آزادی کی روشنی پوری طرح سے پھیل بھی نہیں پائی تھی کہ پھر ایک جنگ کا گہن دونوں ملکوں کی اجتماعی زندگیوں پر رنج والم کی تاریکی لے کر آگیا۔

سردار جعفری دو پڑوسیوں کے درمیان امن ومحبت کی بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم آپس میں لڑنے کے بجائے مل کر ایک دوسرے کے درد کا علاج کرتے۔ درد میں کسی اپنے کا شریک ہونا بھی درد کی شدت کو کم کر دیتا ہے۔ ایک دوسرے سے تعلقات بہتر بناتے ایک دوسرے کی ترقی کے ضامن بن جاتے ہیں۔ وہ ہندوستان کی آواز بن کر کہتے ہیں۔

ہمارے دل میں رفاقت بھی اور پیار بھی ہے   تمہارے واسطے یہ روح بے قرار بھی ہے

یہ سرزمین جو غالب، میر، نظام و کا کی وچشتی و نانک اور کبیر کی سرزمین ہے، جنھوں نے محبت، اخوت اور رواداری کا پیغام دیا ہے۔ لیکن زمین پر کھینچی ایک لکیر نے صدیوں کی رواداری کو فراموش کر کے آگ کے دریا اور لہو کا ساگر دو ملکوں کے درمیان حائل کر دیا۔ سردار کہتے ہیں کہ نفرتوں کی دیواریں لاکھ بلند سہی محبت بھری ایک نظر انھیں گرا سکتی ہے۔ ہمیں سوچنا ہوگا کہ کیا واقعی ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں یا دشمن بنا دیئے گئے ہیں۔ گلشن، چمن، صبح، روشنی اور تازگی جیسے استعاروں کے ذریعے وہ امن کا پیغام دیتے ہوئے اپنے پڑوسی ملک سے کہتے ہیں۔

تم آ ؤ گلشنِ لاہور سے چمن بردوش　　　ہم آئیں صبح بنارس کی روشنی لے کر

ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر　　　اور اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے؟

نظم کے اس آخری مصرعے میں جو سوال قائم کیا گیا ہے وہ صرف ایک سوال نہیں ہے بلکہ اس ایک سوال میں کئی سوال پوشیدہ ہیں۔ ''دست فریاد'' میں سردار کہتے ہیں۔

وہ جو ہتھیار لیے آتے ہیں، سب دشمن ہیں　　　جس نے ہتھیار دیئے وہ بھی تو دشمن ہوگا

یہاں سردار کا اشارہ ان طاقتوں کی طرف ہے جو دنیا میں امن قائم کرنے کا سوانگ (ڈھونگ) رچا کر زرخیز زمینوں کو بنجر اور معطر فضاؤں کو بارود کی بدبو سے بدل دیتی ہیں۔ جن کے کارخانوں میں بنائے ہوئے ہتھیار کے لیے خریدار وہ خود تیار کرتے ہیں۔ دنیا میں امن وامان قائم ہو جائے گا تو وہ اپنے جدید سے جدید ترٹکنالوجی کے استعمال سے تیار کیے گئے ہتھیار کسے بیچیں گے۔ واقعتاً ہندوستان اور پاکستان اپنے بجٹ کا ایک بڑا حصہ دفاع کے نام پر خرچ کرتے ہیں اور ہتھیاروں کے ذخائر بڑھاتے جا رہے ہیں۔ اگر اس کا آدھا حصہ بھی ملک کے دوسرے ترقیاتی پروگراموں مثلاً صحت، تعلیم یا کاشتکاری میں لگایا جائے تو ملک کے کئی مسائل حل ہو جائیں۔

سردار جعفری کے ہاتھ سے کبھی رجائیت کا دامن نہیں چھوٹتا سرحد پر وہ صبح فردا کے منتظر نظر آتے ہیں۔ دو متضاد کیفیتوں، نفرت اور محبت، دشمنی اور دوستی جنگ اور امن اور شعلہ اور پھول سے فنی اور معنوی حسن کے ذریعے رجائی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ آنے والی صبح ایک نئی روشنی اور امن کا پیغام لے کر آئے گی۔ سرحد کا تصور آتے ہی ہمارے ذہن کے پردے پر جو تصویریں ابھرتی ہیں وہ کانٹے دار دیوار، فوج، بندوقیں، میزائیل اور مشین گن وغیرہ وغیرہ کی ہیں۔ لیکن سردار جعفری کے تخیل کی بلندی جو تصویریں پیش کرتی ہیں وہ امن وسلامتی اور محبت کے استعاروں سے مزین ہیں۔

یہ سرحد من چلوں کی، دل جلوں کی، جاں نثاروں کی

یہ سرحد سرزمین دل کے بانکے شہہ سواروں کی

یہ سرحد کج کلاہوں کی، یہ سرحد کج اداؤں کی

یہ سرحد گلشنِ لاہور و دلی کی ہواؤں کی

یہ سرحد امن و آزادی کے دل افروز خوابوں کی

یہ سرحد ڈوبتے تاروں، ابھرتے آفتابوں کی

یہ سرحد خوں میں لتھڑے پیار کے زخمی گلابوں کی

میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبح فردا کا

وہ مزید کہتے ہیں کہ دو ملکوں کے درمیان رشتوں کی برقراری کے لیے ہو کہ تنازعات کے حل کے لیے گفتگو ضروری ہے۔ اس نظم میں خوش آہنگی، پیکر تراشی اور تمثیلی انداز نے ایک دلکشی پیدا کی ہے۔ وہ امن و دوستی کے جانب اقدام اٹھانے پر زور دیتے ہیں۔ چونکہ دشمنی بھی جم کے نبھائی ہے اس لیے ابتداء میں اذیتیں بھی اٹھانی پڑسکتی ہیں، طنز کے تیر اور تیکھی نظروں کے وار کو بھی سہنا پڑے گا۔ لیکن سینوں میں دل بیدار رہیں اور بے بسی حرف کو زنجیر بہ پا کر نہ سکے، کوئی صورت حال ہو گفتگو جاری رہے۔ ایک کے شکوے شکایتوں کو دوسرا دور کرنے کی کوشش کرے۔ ورنہ غلط فہمیاں بڑھتے بڑھتے نفرتوں اور کدورتوں میں بدلتی جائیں گی۔ دونوں ملکوں میں دوستی اور امن کے قیام کے لیے ایماندارانہ سعی پیہم کی ضرورت ہے جس سے جنگ اور دشمنی کی یہ تاریک رات ڈھل کر دوستی کے اجالوں میں بدل جائے گی شاعر کا دل کہتا ہے کہ بندوق کی گولیوں کی جگہ صرف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آئے گی۔

ہاتھ میں ہاتھ لیے سارا جہاں ساتھ لیے

تحفۂ درد لیے پیار کی سوغات لیے

ریگزاروں سے عداوت کے گزر جائیں گے

خوں کے دریاؤں سے ہم پار اتر جائیں گے

گفتگو بند نہ ہو

بات سے بات چلے

صبح تک شامِ ملاقات چلے

ہم پر ہنستی ہوئی تاروں بھری یہ رات چلے

اس نظم میں خیال آگے بڑھتے بڑھتے ایک خوبصورت امیج کے طور پر ابھر آتا ہے۔ سردار جعفری اپنے پڑوسی ملک کو دعوت ملاقات دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم آؤ تو تیغوں کو توڑ کر لہو بھرے دامن کو نچوڑ کر آؤ تو پھر اس کے بعد نہ تم غیر ہو نہ غیر ہیں ہم۔ ہم ایک دوسرے کے مقابل نہیں ایک دوسرے کے ساتھ چلیں تو ترقی کے منازل طئے کر سکتے ہیں۔ یہ ساتھ ہمیں ایک ایسے روشن مستقبل کی طرف لے جائے گا۔ جہاں خوشحالی ہوگی امن کا دور دورہ ہوگا۔ سردار جعفری نے تو یہ نظمیں 1965ء میں لکھیں امن کے قیام کی اہمیت کو سمجھنے میں دونوں ملکوں کے سیاست دانوں کو قریب تین دہے لگے۔ 1999ء میں وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی نے اس جانب قدم بڑھاتے ہوئے پاکستان کا (سمجھوتا بس کے ذریعے) تاریخی سفر کیا۔ اور سردار جعفری کی امن پر لکھی ہوئی نظموں کے کیسٹ کو بطور تحفہ پاکستان کے اپنے ہم منصب، وزیر اعظم نواز شریف کو پیش کیا جسے سیما انل سہگل نے اپنی آواز دی ہے۔ یہ سردار جعفری کے امن پسندی کے پیغام اور شعری بصیرت کو ایک بہترین خراجِ عقیدت ہے۔ آج بھی امن کی آواز کی معنویت اور اہمیت برقرار ہے۔ ضرورت اس پیغام کو سمجھنے کی ہے۔

بقول خویش ؎

حاصلِ فصل ماہ وسال ہیں ہم ہم کو یوں رائیگاں نہ کر دینا

سردار جعفری نے اپنے فن کے ذریعے اپنے عہد کی زندگی کو رنگ و نور عطا کرنے کی کوشش کی اور مستقبل کے لیے کچھ خواب دیکھے جہاں بھوک، مفلسی، نفرت، ظلم و تشدد اور فسادات نہ ہوں۔ صرف محبت ہی محبت، مساوات، رواداری، انصاف، دردمندی اور امن امان ہو۔ اس ضمن میں سردار جعفری نے بڑی خوبصورت بات کہی ہے جس پر میں اپنی بات ختم کروں گی۔

''خواب اور شکست خواب اس دور کا مقدر ہے۔ اور نئے خواب دیکھنا انسان کا ایسا حق ہے۔ جس سے کوئی طاقت، کوئی اقتدار اسے محروم نہیں کر سکتا۔ اور شاید یہی انسان اور انسانیت کے مستقبل کی ضمانت ہے۔''

ڈاکٹر بی بی رضا خاتون شعبۂ اُردو مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر خدمات انجام دے رہی ہیں۔ انھوں نے گلبرگہ یونیورسٹی سے بعنوان ''بیسویں صدی میں مکتوب نگاری کا سماجی وتہذیبی مطالعہ'' پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔

رجائیت اور امن و آشتی کا شاعر۔ علی سردار جعفری

ڈاکٹر اسلم پرویز

بیسویں صدی میں اردو شعر و ادب کے افق پر طلوع ہونے والے درخشندہ ستاروں میں علی سردار جعفری کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ترقی پسند فن کاروں کی جھرمٹ میں بھی اپنی آب و تاب کے سبب انفرادیت کے حامل ہیں۔ ان کی پہلودار شخصیت کی مختلف ادبی' سماجی و سیاسی جہتیں ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک کے بانیوں اور بنیاد گزاروں میں خصوصی طور سے قابلِ ذکر ہیں کہ انہوں نے تحریک کے مقاصد کے حصول کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دی اور آخری وقت تک اس نظریاتی لڑائی کے مردِ میدان بنے رہے۔ اس ضمن میں ان کی عملی اور تخلیقی کاوشیں ان کی دیانت داری کی بین ثبوت ہیں۔ سردار جعفری شاعر بھی ہیں' افسانہ نگار' ڈرامہ نگار اور تنقید نگار بھی۔ انہوں نے رپورتاژ اور یاداشتیں بھی لکھیں، تحویلِ حرفی اور تراجم بھی کئے۔ وہ دانشور اور مفکر بھی ہیں اور خطیب بھی، ہدایت کار بھی ہیں اور نغمہ نگار بھی۔

لیکن سردار جعفری بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں' نظم کے شاعر' حالانکہ انہوں نے وافر تعداد میں غزلیں بھی کہیں ہیں۔ ان کی شاعری میں وہ تمام رنگ بدرجۂ اتم موجود ہیں جو ترقی پسند ادیبوں اور فنکاروں کا خاصہ ہے۔ سامراجی اور استحصالی قوتوں کے خلاف بغاوت' حریت اور آزادی کے لئے جدوجہد' دبے کچلے انسانوں' عورتوں' مزدوروں' کسانوں اور کمزور و مظلوم طبقات کے لئے جذبۂ ہمدردی سردار جعفری کی شاعری میں بلند و بانگ آہنگ کے ساتھ موجود ہے۔ ان کے یہاں خواب دیکھنے کا حوصلہ ہے' مستقبل کے خواب کا مکمل نقشہ ہے اور خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کا لائحہ عمل بھی:

پھینک پھر جذبۂ بیتاب کی عالم پہ کمند
ایک خواب اور بھی اے ہمتِ دشوار پسند

علی سردار جعفری کی زندگی اور شاعری کے وسیع منظر نامے پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ذات میں رجائیت کا اعلیٰ جوہر موجود ہے جو انہیں نامساعد اور مشکل ترین حالات کے باوجود بھی مستقبل کے حسین خواب دیکھنے کی طرف آمادہ کرتا ہے اور ان خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے جدوجہدِ پیہم کی سخت اور دشوار گزار راہوں پر گامزن رکھتا ہے اور قنوطیت وکلبیت کو ان کے گرد ونواح بھی پھٹکنے نہیں دیتا۔ وہ زندگی سے کبھی بے زار نہیں ہوتے' زندگی کی صعوبتوں کا بے جا گلہ نہیں کرتے' تقدیر کو موردِ الزام ٹھہرا کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ نہیں جاتے بلکہ یقین محکم کے ساتھ عمل پیہم کے وسیلے سے زندگی کو ساز گار اور خوبصورت بنانے کی حکمت وہمت رکھتے ہیں۔ لہذا 'نئی دنیا کو سلام' میں پیغام دیتے ہیں:

نہ ہو زندگی سے کبھی دل فگار

عمل سے بنالے اسے سازگار

دراصل سردار جعفری اس عہد کے پروردہ ہیں جب احساسِ غلامی ومحکومی کی شدت اپنے عروج پر تھی۔ زمیندار گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود بھی اس حقیقت سے مفر نہ تھا کہ وہ بھی فرنگی آقاؤں کے بُنے سازشی جال کے اسی طرح اسیر تھے جس طرح کوئی عام آدمی۔ بلکہ یہ امر مزید تکلیف دہ تھا کہ جاگیردار گھرانوں کے افراد خود غلام بھی تھے اور اپنے ہی برادرانِ وطن کے استحصال میں خونی درندوں کا آلۂ کار بھی۔ سردار جعفری نے جب ایسے ماحول میں ہوش سنبھالا اور زمینی حقیقت سے روبرو ہوئے تو محکومی کی فضا میں سانس گھٹتی ہوئی محسوس کی۔ وہ غلامی کے طوق کو اتار پھینکنے' وطنِ عزیز کو فرنگی بیڑیوں سے رہا کرانے اور سماج میں مساوات' انصاف اور امن کی حکمرانی کو یقینی بنانے کے لئے سعئ مسلسل میں مصروف ہوگئے۔ روحِ احساس کی خلش نے ہاتھوں میں قلم پکڑا دیا جو تلوارِ بے نیام کی طرح استحصالی قوتوں کے خلاف تاعمر نبرد آزما رہا۔

وہ اپنی تحریروں' تقریروں اور تحریکوں کے ذریعے حق وصداقت' امن وانصاف اور انسانی حرمت کی بحالی وسرفرازی کے اعلیٰ وارفع نصب العین کی حصولیابی کے لئے کوشاں وسرگرداں رہے جس کے سبب انہیں عیش وعشرت کی زندگی ترک کرنی پڑی' کئی بار حکومت کے معاتب اور غیظ وغضب کا سامنا کرنا پڑا اور قیدِ فرنگ کی زندگی جھیلنی پڑی تاہم ان کی رجائیت پسند طبیعت نے کبھی بھی انہیں مایوسی ومحرومی کا شکار نہیں ہونے دیا۔

یہ صبح ہے سورج کی سیاہی سے اندھیری

آئے گی ابھی ایک سحر مہر چکاں اور

سردار جعفری کی جدو جہد کا مقصد مساوات پر مبنی ایک آئیڈیل سماج کا قیام عمل میں لانا تھا جہاں اخوت وآشتی اور امن وآمان کا دور دورا ہو ہر فرد کو سکون وچین اور عیش ومسرت کی زندگی نصیب ہو اور عالم بے رنگ ونور رشک جناں ہو جائے اور کہا جا سکے کہ:

لو وہ صدیوں کے جہنم کی حدیں ختم ہوئیں

اب ہے فردوس ہی فردوس جہاں تک جاؤ

سردار جعفری کا شعری مجموعہ ''امن کا ستارا'' 1950 میں منظر عام پر آیا جس میں ان کی تین نظمیں سویت یونین اور جنگ باز' استالن کتھا اور امن کا ستارا شامل ہیں۔ سردار جعفری نے اس مجموعے کا انتساب ہی ''امن عالم کے مجاہدوں کے نام' کیا ہے جس سے ابتدا میں ہی واضح ہو جاتا ہے کہ ان نظموں کا مقصد سماج سے ظلم و بربریت اور استحصال واستبداد کو ختم کرنا اور امن وامان کی راہیں کو داستوار کرنا ہے۔ اس مجموعہ میں سردار جعفری نے پیش لفظ سے پہلے ایک مختصر نظم بھی شامل کی ہے جو یوں ہے:

جنگ باز خوں خواروں

ہم تمہیں سزا دیں گے

یہ غرورِ زر داری

خاک میں ملا دیں گے

خون کے پیاسے ہو

ہم مزا چکھا دیں گے

وہ نظام وہ دنیا

جس میں جنگ پلتی ہے

ایک دن مٹا دیں گے

اس نظم میں سامراجی استحصالی قوتوں سے لوہا لینے اور ان پر شاندار فتح پانے کا عزم مصمم اور امید قولی دکھائی دیتی ہے۔ ایسی فتح یابی کے حصول سے شاعر کا مقصد ظالم وجابر نظام حکومت کا سدِ باب اور جنگ وجدل کا خاتمہ ہے تا کہ امن وآشتی کے نئے دور کا آغاز ہو سکے۔

مجموعے میں شامل تینوں نظموں میں رجائیت کا گہرا رنگ دکھائی دیتا ہے جو عوامی بیداری کے غرض سے لکھی گئی ہیں۔ یہ نظمیں ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا سے ظلم و جبر' خون ریزی و بدامنی اور غربت و افلاس مٹا دینے کے گراں قدر پیغامات کی حامل ہیں۔ یہ سوویت یونین کو آئیڈیل مان کر دیگر ممالک بشمول ہندوستان میں ایسی خوشگوار صورتِ حالات پیدا کرنے کی امنگیں اور آرزوئیں پیش کرتی ہیں جہاں عوامی حکومت کے زیر سایہ آزادی' ترقی اور امن و آشتی کا ماحول پروان چڑھے اور پھولے پھلے۔ لہٰذا ''سوویت یونین اور جنگ باز'' کا خاتمہ اس بند پر کرتے ہیں:

ہے ایک سوویت کا دیس خاک پر بسا ہوا
مگر اک اور ہے ہمارے خون میں رچا ہوا
ہماری آرزو ہمارے خواب میں سجا ہوا
یہ خواب وہ ہے جس کا کُل زمیں کو انتظار ہے

استالن کتھا سردار جعفری کی ایک بہت ہی طویل نظم ہے جس کو انہوں نے عوام کے لئے ڈھولک کی تھاپ پر گانے کے لئے تحریر کیا تھا تاکہ ان کے اندر استالن کی جدوجہد کی داستان سن کر آزادی کی شدید خواہش اور حرکت و عمل کا جذبہ پیدا ہو: وہ بھی جدوجہد کی راہ پر نکل پڑیں اور ظالم و جابر حکومت سے اپنی آزادی اور پر امن اور عزت و آبرو سے زندگی جینے کا حق چھین لیں۔

آزادی کے لڑنے والو، سنو کتھا استالن کی
سارے جگ میں جس کے دم سے اجیاری ہے لینن کی
جس نے نربل نردھن جن کو مکتی مارگ دکھایا ہے
جس نے جنتا کی شکتی سے جنتا راج بنایا ہے
جس نے پونجی واد کے ہتھیارے ہاتھوں کو کاٹ دیا
جس کے لوہ نے انیائے کے بھاڑ سے منہ کو پاٹ دیا

یہ نظم محکوم قوموں کی دبی کچلی آرزوؤں کے احیا اور روشن مستقبل کے خواب سے عبارت ہے' ویسا ہی خواب جو سوویت روس میں شرمندۂ تعبیر ہو چکا تھا اور سوویت روس خطۂ ارض ہونے کے باوجود رشک فردوس بریں بن چکا تھا۔ اس نظم میں موجزن رجائیت کے متعلق علی سردار جعفری خود فرماتے ہیں:

''اس نظم میں رومانیت کی آمیزش ضرور ہے لیکن مبالغہ کہیں نہیں ہے۔ لیکن یہ رومانیت تاریک اندیش نہیں بلکہ روشن نظر ہے۔ مبالغے کی ضرورت مجھے اس لئے پیش نہیں آئی کہ اشترا کی حقیقت خود مبالغے اور تخئیل سے بھی زیادہ حسین اور شاعرانہ ہے۔ انسانی تخئیل اور جذبات نے صدیوں جس حسین وجمیل دنیا کی تعمیر کے خواب دیکھے ہیں اور جنہیں گیتوں داستانوں اور کہانیوں میں بند کر دیا ہے' سوویت یونین کی تعمیر اس سے بھی کہیں زیادہ حسین ہے۔ خوابوں، افسانوں اور گیتوں پر حقیقت کی یہ فتح استالن کے خلاق اور معمار ہاتھوں کی مرہونِ منت ہے''۔

سردار جعفری کے لئے حصولِ مقصد اولین حیثیت رکھتا ہے نہ کہ روایتی معیار شاعری جہاں حسنِ الفاظ اور تراکیب و بندش سے کوئی سمجھوتا نہیں ہوسکتا اور جمالیات کے نام اہم موضوعات و پیغامات کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ سردار جعفری اپنی شاعری کے ذریعہ بڑی تعداد میں محروم ومظلوم انسانوں تک پہنچنا چاہتے ہیں اور انہیں مایوسی اور ناامیدی کے دور سے باہر نکالنا چاہتے ہیں' انہیں آزادی اور مساوات کے بلند عزم وافکار سے روشناس کرانا چاہتے ہیں تا کہ ایک خوشحال اور پرامن معاشرے کی تشکیل عمل میں لائی جاسکے۔

اس نظم سے متعلق سردار جعفری خاص طور سے پیش لفظ میں فرماتے ہیں ''میری شاعری خواص کے لئے نہیں ہے بلکہ عوام کے لئے ہے اور میری خواہش اور کوشش ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کو سمجھ سکیں' کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور اور کھیتوں میں ہل جوتنے والے کسان۔ اس لئے میں نے بول چال کی زبان کو بنیاد بنایا ہے جو بہت سے ''سخن شناسوں'' کو ناگوار گزرے گی۔

اپنی طویل نظم ''امن کا ستارا'' جس کو سردار جعفری ایک شاعرانہ تقریر سے عبارت کرتے ہیں' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس میں انسان اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی توصیف نگاری ہے۔ وہ سادگی اور ایمانداری سے دن رات محنت ومشقت میں مصروف رہنے والے عام انسان کو آدرش قرار دیتے ہیں جس کے سبب عارضِ ہستی پر نکھار ہے۔ سردار جعفری ایسے ہی محروم و بے کس اور ستائے ہوئے انسانوں کا سپنا ساکار کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

میں اسی سیدھے سادھے غریب اور مجبور انسان کا دردمند
اس کی آشاؤں' اس کی تمناؤں کا ترجماں
اس کے خوابوں کی تعبیر کا رازداں

اپنے جوشِ عقیدت خراجِ محبت کو لیکر چلا ہوں

سردار جعفری انقلاب اور بغاوت کو اپنا آلۂ کار تو بناتے ہیں لیکن ان مقصد کبھی بھی بے جا جنگ وجدل اور سفا کی وخون ریزی نہیں بلکہ اقتصادی، سماجی اور سیاسی نظام کی تشکیل نو ہے تا کہ محکوم ومجبور عوام کو آزادی، انصاف، حق مساوات مل سکے اور پر امن معاشرے کا قیام عمل میں آسکے۔ لہذا نظم کا اختتام یوں ہوتا ہے۔

امن اور شانتی کے لئے لڑنے والوں کی جے
مسکراتے ہوئے ہونٹ ہنستے ہوئے سرخ گالوں کی جے
حریت کے چمکتے شرارے کی جے
امن کے جگمگاتے ستارے کی جے

ہندوستان کو جب آزادی حاصل ہوئی تو دیگر لاکھوں ہندوستانیوں کی طرح سردار جعفری کے لئے بھی یہ نہایت ہی مسرت وانبساط کا دن تھا۔ وہ آزاد ہندوستان کو اپنے سپنوں کے آئینوں سے دیکھنا چاہتے تھے جو ایک مکمل اور آئیڈیل ملک بن کر دنیا کے نقشے پر ابھرے۔ انہوں نے ''جمہوریہ کا اعلان'' نامہ لکھا اور اس عزم کا اظہار کیا کہ:

نہ پھر خوف ہو گا نہ پھر احتیاج
نئے سر سے تعمیر ہو گا سماج
یہ افلاس کی رات ڈھل جائے گی
کسانوں کی دنیا بدل جائے گی
رہے گا نہ کوئی بھی بے روز گار
مصیبت سے چھٹ جائیں گے کامگار.
نئی دیں گے ماتھے کو تنویر ہم
بدل دیں گے انساں کی تقدیر ہم

مگر وہ آزادی کے بعد ہندوستان کی عمومی صورتِ حال سے کبھی مطمئن نہیں رہے کیوں کہ یہ ہندوستان ان کی خواہشوں پر پورا اترتا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ مزید برآں آزادی کے ساتھ تقسیم کی ہولناکی بھی آئی تھی جس نے نہ صرف لاشوں کے انبار پر ملک کے دو ٹکڑے کر دئے بلکہ مذہب کے نام پر ملک میں فرقہ وارانہ منافرت کی

آگ کو اور بھی بھڑکا دیا۔ دو الگ ہوئے بھائی دو دشمن کی طرح سینہ سپر رو برو کھڑے ہو گئے۔ اس صورتِ حال میں بھی سردار جعفری نے امید کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ وہ ملک کے اندرونی ماحول کو بہتر بنانے اور امن و اخوت کو فروغ دینے میں مصروفِ عمل رہے۔ سردار جعفری نے اپنی عملی اور قلمی کوششوں کے ذریعہ ہندوستان کے اندر دو قوموں کے درمیان اخوت و بھائی چارگی کے ماحول کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔ انہوں نے دو تہذیبوں اور دو اہم زبانوں کے قریب لانے کی بھی کامیاب کوششیں کیں۔ انہوں نے دیوان میرؔ اور دیوان غالبؔ کی تدوین دیوناگری رسم الخط میں کی۔ انہوں نے سات جلدوں میں اور اردو کی غزلوں کا انتخاب ''غزل نامہ'' ڈاکٹر راج نگم کے اشتراک سے ہندی میں شائع کیا۔

سردار جعفری کی شاعری کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کی شاعری میں انسان اور اعلیٰ انسان اور اعلیٰ انسانی قدروں کی عظمت پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ انسان دوستی و انسان پرستی، اخوت و رواداری، خلوص و محبت، ایثار و قربانی، کوشش امن و امان اور جذبۂ خدمت خلق ان کی شاعری کی روح سے عبارت ہیں۔ دراصل وہ اس فلسفے کے قائل ہیں کہ انسان کی سرشت میں بنیادی طور پر خیر کا مادہ موجود ہوتا ہے، لہٰذا انسان کے صحیح معنوں میں انسان بننے کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اس لئے وہ انسان کے روشن مستقبل سے کبھی بے زار نہیں ہوئے۔ نئی دنیا کو سلام کے پیش لفظ میں فرماتے ہیں:

> ''میں انسان کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ اس کا ماضی بڑا شاندار ہے اور حال دلکش امکانات سے معمور ہے۔ حالانکہ آج ہندوستان خانہ جنگی کے کرب میں مبتلا ہے اور ایسی بہیمانہ حرکتیں ہو رہی ہیں جن سے دورِ وحشت کی درندگی بھی شرمائے گی۔ لیکن یہ بلا بھی ہیضے اور طاعون کی وباؤں کی طرح گزر جائے گی۔ کیونکہ اس کے خلاف بھی وہی قوتیں جد و جہد کر رہی ہیں جو میری نظم میں کارفرما ہیں۔''

انہوں نے تقسیم کے بعد ہند و پاک کے درمیان در آئی عداوت و منافرت کی فضا ختم کرنے اور دوستانہ ماحول کو فروغ دینے کی کوششیں کیں جس کے اعتراف میں امریکہ کے ہارورڈ فاؤنڈیشن نے انہیں 1999 میں خصوصی اعزاز سے نوازا۔ امن مساعی کے سلسلے میں ان کی نظم 'صبحِ فردا' کا ذکر برمحل ہوگا۔

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے
اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبحِ آزادی
یہ سرحد جو لہو پیتی ہے اور شعلے اگلتی ہے

ہمارے خاک کے سینے پہ ناگن بن کے چلتی ہے
سجا کر جنگ کے ہتھیار میداں میں نکلتی ہے
میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبح فردا کا

سردار جعفری کی نظم ''کون دشمن ہے'' بھی اسی امن مساعی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں انہوں نے ہندو پاک کی تاریخ میں ہندو مسلم یکجہتی کو دیکھنے اور باہمی روابط اور ہم آہنگی کی گنگا جمنی تہذیب کے وسیلے سے دوستی اور بھائی چارے کے ماحول کے احیا کی کوشش کی ہے:

ہمارے پاس ہے کیا دردِ مشترک کے سوا
مزہ تو جب تھا کہ مل کر علاج جاں کرتے
خود اپنے ہاتھ سے تعمیر گلستاں کرتے
ہمارے درد میں تم اور تمہارے درد میں ہم
شریک ہوتے تو پھر جشنِ آشیاں کرتے

لاکھوں لوگوں کی طرح سردار جعفری کا بھی گراں قدر خیال یہ تھا کہ جنگیں صرف مسائل پیدا کرسکتی ہیں، مسائل کو حل نہیں کرسکتیں۔ ہندو پاک اگرچہ دو خطوں میں منقسم ہو چکے ہیں مگر دونوں ملکوں کے مسائل ایک ہی نوعیت کے ہیں لہٰذا دونوں ممالک کی حکومتوں کو جنگ کی تیاریوں میں بے جا مصارف اور وسائل کی بربادی کی جگہ باہمی تعاون سے ایک دوسرے کی ترقی کے لئے مصروف عمل ہونا چاہیے کیونکہ اسی میں دونوں کی بھلائی ہے۔ نظم کا آخری بند قیام امن کی فکر و سعی پر یوں ختم ہوتا ہے:

تم آؤ گلشنِ لاہور سے چمن بردوش
ہم آئیں صبح بنارس کی روشنی لے کر
ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر
اور اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے؟

ڈاکٹر اسلم پرویز جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی سے اردو زبان و ادب میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ڈائرکٹوریٹ برائے اطلاعات و اشاعت، حکومت دہلی سے وابستہ رہے۔ بعد ازاں انہوں نے اردو اکیڈمی دہلی کے موقر رسائل 'ایوان اردو' اور بچوں کا ماہ نامہ 'اُمنگ' میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور دہلی سرکار کے سہ لسانی ماہ نامہ 'دلی ماسک' کی بھی ادارت کی۔ بروقت وہ ایگزام برانچ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد میں برسرِ خدمت ہیں۔

سردار جعفری کی اہم میراث: احترام آدمیت

محمد مصاحب علی

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زبان سے گاؤں گا
جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے
سینے کو زمین کے چھیڑیں گے
میں پتی پتی کلی کلی اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا
سرسبز ہتھیلی پر لے کر شبنم کے موتی رو لوں گا
میں رنگ حنا، آہنگ غزل، انداز سخن بن جاؤں گا

-----:-----

اعجاز ہے یہ ان ہاتھوں کا ریشم کو چھوئیں تو آنچل ہے
پتھر کو چھوئیں تو بت کر دیں، کالک کو چھوئیں تو کاجل ہے
مٹی کو چھوئیں تو سونا ہے چاندی کو چھوئیں تو پائل ہے
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

میں نے اپنے مقالے کی شروعات سردار جعفری کے تعارف کلمات کے بجائے دو الگ الگ نظموں کے ٹکڑوں سے شروع کی؟ یہ دونوں ٹکڑے میرے مقالے کے عنوان سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔ میرے عنوان میں مباحثی اعتبار سے دو لفظوں کا استعمال ہوا ہے۔ ایک میراث اور دوسرا احترام آدمیت۔ پہلے ٹکڑے سے میراث کی طرف اشارہ ہے تو دوسرے ٹکڑے سے احترام آدمیت کی طرف۔ پہلے ٹکڑے سے میں

نے لفظ میراث کے استعمال کا جواز پیش کیا ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص اپنے پیچھے کوئی چیز چھوڑ جاتا ہے تو وہ اپنے وارث کو اس کی تلقین کرتا ہے کہ یہ میری میراث ہے اسے اچھے سے سنبھال کر رکھنا۔ اسی کے توسط سے میں تم لوگوں کے درمیان جانا اور پہچانا جاؤں گا۔

سوال یہ ہے کہ سردار جعفری کی شخصیت کے وہ کون سے پہلو ہیں جو ان کی وراثت کہی جاسکتی ہیں جن سے ہماری آئندہ کی نسلیں مشعلیں روشن کرسکتی ہیں۔ سردار جعفری کی زندگی کی داستان میں بھی ایسے کئی ابواب ہیں جن سے نور حاصل کیا جاسکتا ہے۔ سردار جعفری کی زندگی باخبری اور بے خبری سے عبارت ہے۔ باخبری ایسی کہ قومی سطح سے لے کر بین الاقوامی سطح تک کے تمام تحریکوں اور سرگرمیوں سے واقف ہی نہیں بلکہ ان میں سرگرم بھی رہے ہیں اور اسی کا نتیجہ تھا کہ بین الاقوامی سطح کے دانشوروں اور ادیبوں میں ان کا نام شامل تھا اور یہی باخبری اور شعور ان کے فکروفن کی وراثت کا اہم حصہ ہے اور بے خبری بھی اس قدر تھی کہ انھوں نے اپنی زندگی کس طرح گزاری، باوجود آخری دور کے مفاہمتوں کے کس طرح اپنی تخلیقی اندوختے میں اضافے کئے اور کیسے کیسے زاویے ابھارے وہ بھی توجہ طلب ہیں۔ ان وراثتوں کے اہم پہلوؤں کو چن لینا اور ان کو محض اپنے دور کی آرائش وزیبائش کے لئے استعمال نہ کرنا بلکہ انھیں نئے دور کی دریافت کا وسیلہ بنانا ہر نسل کی ذمہ داری ہے۔ یہی وہ آرزو ہے جو سردار جعفری کی نظم ''میرا سفر'' کے آخری مصرعوں سے دلدوز انداز میں ظاہر ہوتی ہے کہ

لیکن میں یہاں پھر آؤنگا
بچوں کے دہن سے بولونگا

لہٰذا ہم نے ان کی وراثتوں کے اہم پہلوؤں میں سے سب سے اہم پہلو احترام آدمیت کو اپنے مقالے کا موضوع بنایا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے احترام انسانیت کو چھوڑ کر احترام آدمیت کا لفظ کیوں استعمال کیا؟ اس سوال کا جواب جاننے سے پہلے ہمیں یہ جاننا ہوگا کہ انسان اور آدمی یہ دونوں الگ الگ ہیں یا ایک یا ان میں افضلیت کا فرق ہے۔

اکثر لوگوں کا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہ دونوں لفظ ایک ہے۔ جو آدمی ہے وہی انسان ہے اور جو انسان ہے وہی آدمی ہے۔ عالم حضرات (یعنی جاننے والا) اور خصوصاً ہمارے ادباء اور نقاد حضرات کسی شخص کو اچھا، باتہذیب اور نیک بتانے کے لئے صرف انسان اور انسانیت کا لفظ استعمال کرتے ہیں جس سے صاف ظاہر

ہوتا ہے کہ انسان اور انسانیت افضل ہے، آدمی اور آدمیت سے۔ غالب کے شعر کا یہ مصرعہ کہ ''آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا'' اور روسو کے انسانی تصور کے ذریعے انسان کو ایک عظمت کا درجہ دیا جا سکتا ہے افضلیت کا نہیں۔ کیونکہ افضلیت خیر اور صرف خیر ہی نہیں ہے جو کہ روسو کا تصور ہے، جس کی تردید محمد حسن عسکری نے اپنے مضمون ''انسان اور آدمی'' میں کی ہے۔ افضلیت خیر اور شر کے مجموعے کے ساتھ دیا گیا ہے جو آدمی کی صفت ہے۔

افضلیت صرف خیر اور اچھائی کی وجہ سے دی جاتی تو فرشتوں کو آدمی کے اوپر افضلیت ہوتی، جبکہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن خود کہتا ہے

اذا کرمنا بنی آدم ہم نے آدمی کو اکرام بخشا اور اکرام بخشنے کی وجہ وہ خیر اور شر کا مالک ہے اور اختیارات ان کے ہاتھوں میں ہے کہ ان میں سے وہ کس کو اختیار کرتا ہے۔ قرآن میں ہر جگہ لفظ آدم کا استعمال ہوا ہے جس کے معنی آدمی کے ہیں اور جہاں پر لفظ انس یعنی انسان کا استعمال ہوا ہے وہاں پر عمل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ عمل ایک حسی چیز ہوتی ہے صفاتی نہیں۔ لہٰذا آدمی یعنی آدمیت حواس خمسہ کا نام ہے اور انسان یعنی انسانیت اس کی صفات کا۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ آدمیت کل ہے اور انسانیت اس کا صفاتی جز۔ اور کوئی جز کل کے بغیر نہیں پایا جا سکتا۔ محمد حسن عسکری نے آدمی اور انسان کا فرق بہت ہی واضح طور پر پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

> ''آدمی تو وہ ہے جس کی مادی ضروریات بھی ہے اور غیر مادی بھی۔ جو کھاتا ہے، پیتا ہے، سوتا ہے، جاگتا ہے اور جنسی خواہشات محسوس کرتا ہے۔ جس کی غیر مادی اقدار ان کی مادی ضروروتوں کا تابع ہے ان کے علاوہ آدمی وہ ہے جو نفرت اور محبت، رحم دلی اور بے رحمی سب کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جو علوی اور سفلی دونوں کی جذبات کو محسوس کرتا ہے اور سب سے بڑی پہچان یہ کہ وہ مرتا ہے انسان گوشت پوست کے جیتے جاگتے آدمی کا نام نہیں یہ صرف آدمی کا سایہ ہے۔''

(انسان اور آدمی۔ محمد حسن عسکری۔ ص ۳۵۔۳۴)

ان دلائل کی روشنی میں آدمی اور انسان کے درمیان جو بین فرق ہے وہ ہے۔

۱۔ آدمی حواس خمسہ کا نام ہے نہ کہ انسان اور ان کی صفات کا۔

۲۔ آدمی بیک وقت بالکل متضاد اور متناقص رجحانات کی رزم گاہ بنا رہتا ہے۔ ان کے افکار اور اعمال کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا جبکہ انسان کے بارے میں صرف اچھائی بیان کی جا سکتی ہے۔

لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ آدمی اہم اور افضل ہے۔ اسی بنیاد پر میں نے احترام انسانیت کے بجائے احترام آدمیت کا لفظ استعمال کیا ہے، تا کہ سردار جعفری کی فکروفن آدمی کے پورے وجود پر دلالت کرے چاہے وہ اجسامی ہو یا صفاتی۔ شروع میں، میں نے نظم کا وہ حصہ ''اعجاز ہے یہ ان ہاتھوں کا ریشم کو چھولیں تو آنچل بن جائے'' اس لیے پیش کیا ہے تا کہ آدمی کی اجسامی وصفاتی دونوں وجود پر دلالت کر سکے۔

سردار جعفری کے فکروفن میں احترام آدمیت کا درس اور خیروشر کے تصور سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ ان کے قرب وجوار کے ماحول کا نتیجہ تھا اس کے علاوہ ان کے گھر کی مذہبی ماحول اور محرم میں عزاداری بھی ہے جن کی تفصیلات ''لکھنو کی پانچ رات'' میں قلم بند کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''پیغمبروں اور چودہ معصومین کے حالات پڑھ لئے تھے اور چونکہ میں اسی عمر میں مرثیہ خوانی کے علاوہ حدیث خوانی بھی کرنے لگا تھا اور قرآن کی بہت ساری آیتیں زبانی یاد تھیں اور ان کا مجموعی اثر مجھ پر یہ تھا کہ حق وصداقت کے لئے جان کی بازی لگا دینا انسانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ میں نے حق وصداقت کو ہمیشہ زمین کی چیز سمجھا۔ نمرود وخلیل کی داستان سے لے کر شہادت حسین تک کے واقعات نے میرے خون میں حرارت پیدا کر دی تھی۔''

ان حرارتوں نے اور شدت اس وقت اختیار کر لی جب اپنے گاؤں بلرام پور اور اودھ کے دیہاتوں کی زندگی سے آشنا ہونے کا موقع ملا۔ اسی زمانے میں سردار جعفری کو گاندھی جی کی ''تلاش حق'' اور پلوٹارک کی ''مشاہیر یونان وروماں'' پڑھنے کا موقع ملا۔ ان کے مطالعے سے اپنے لئے راہ عمل تلاش کرنی چاہی۔ راستہ تو نہ ملا لیکن امیری اور امارت سے نفرت پیدا ہوگئی۔ استبداد و ناانصافی کے خلاف احتجاج کا حوصلہ بڑھ گیا جو انھیں وراثت میں واقعات کربلا سے ملا تھا اور اسی عظیم اور تاریخ ساز معرکے نے انھیں جاہلیت پسند طاقتوں کے خلاف صف آرا ہونے کا عزم عطا کیا۔ جہاں اقتدار وقت سے ٹکر لینے والے حسینؓ نے نیزوں اور تلواروں کے درمیان اعلان حق کیا تھا۔ غلام حبشی نے جنون کے سر کے زانو پر رکھ کر یہ بتا دیا تھا کہ اسلام طبقاتی امتیازات، رنگ ونسل کے تعصبات، جغرافیائی حدود اور مذہبی تعصبات سے بلند ہونے کی تلقین کرتا ہے اور اعلی انسانی اقدار کا محافظ ہے۔ انھیں تصورات کے زیر اثر سردار جعفری کی انسان دوستی اور احترام آدمیت کا جذبہ پروان چڑھا اور یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے کہ۔

بغاوت درد سہنے سے، بغاوت دکھ اٹھانے سے

بغاوت ایک انسان کے سوا سارے زمانے سے

اگر غور کریں تو سردار جعفری کی فکر وفن انسان کے کرب، ان کے مسائل، احترام آدمیت اور انسان دوستی کی مشعل راہ ہے۔ نانک، میر اور کبیر سے دلچسپی کے پیچھے انسان سے محبت اور لگاؤ کا تصور کارفرما ہے۔ آدمیت پرستی ان کی شاعری کا محور ہے۔ ''پرواز'' سے لے کر'' نومبر میرا گہوارہ'' تک ایک طویل تخلیقی سفر میں انھوں نے غیر مشروط احترام آدمیت، انسان سے محبت اور ان کی حمایت کی ترجمانی کی ہے۔

سردار جعفری کی کئی نظمیں جو احتجاجی یا موضوعاتی ہیں اس میں لفظ لہو کی حیثیت ایک کلیدی لفظ کی سی ہے۔ ان کا ایک مجموعہ ''لہو پکارتا ہے'' ان کا ڈرامہ'' یہ کس کا خون ہے'' اور شعری تخلیق کا عنوان'' خون کی لکیر'' میں بھی احترام آدمیت کی روح نظر آتی ہے۔ اس لفظ لہو کو انھوں نے دو زاویوں سے پیش کیا ہے۔ اگر یہ ظلم و استبداد اور غلامی کے خلاف بہتا ہے تو ان کے مضبوط بنیادوں کو متزلزل کر دیتا ہے۔ استبداد کے ایوانوں کو طوفان بن کر بہالے جاتا ہے اور اپنی حرارت سے محکومی کی زنجیر کو پگھلا کر اپنی سرخی سے عظمت انسانی کی ایک نئی تاریخ لکھ دیتا ہے۔

یہ لہو ہونٹوں کی خوشبو یہ لہو نظروں کا نور

یہ لہو عارض کی رنگت یہ لہو دل کا سرور

آفتاب کوہ فاراں جلوہ سینائے طور

کلمۂ حق کا اجالا یہ تجلی کا ظہور

شعلہ حرف صداقت سوزِ جان ناصبور

لیکن جب انسان دوستی اور احترام آدمیت کے تصور نے مجبور اور لاچار انسانوں سے محبت کرنا سیکھا تو اپنی آرائش و آرام کی زندگی چھوڑ کر بہتر سماج کی تشکیل کے لئے عالمی امن اور آشتی کے گیت گائے۔ جنگ کی دردناک ہلاکت خیزیوں کو انسانیت اور احترام آدمیت کا دشمن سمجھ کر مذمت کرتے ہوئے ہمارے سامنے امن و آشتی کے پیامبر کی حیثیت سے آئے اور ہر اس سوچ و عمل سے نفرت کرنے لگے جو صلح امن اور خوشحالی کا دشمن ہو۔ اسی تصور سے انھوں نے لہو کو احترام کی نظروں سے دیکھا اور سرحدوں پر اس کے زیاں کو انسانیت کا زیاں بتایا۔

سردار جعفری کا خیال ہے کہ سرحدیں خواہ مشرق میں ہو یا مغرب میں انسانوں کو تقسیم کردیتی ہیں اور احترام آدمیت کو فنا۔ خون اور شعلوں کے درمیاں ایسا خوفناک رقص ہوتا ہے جو انسان کی انسانیت اور آدمی کی آدمیت کو برباد کردیتا ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ سرحدیں ایک بوسے میں تبدیل ہو جائے اور دونوں جانب کی عوام ایک پر سکون زندگی گزار سکیں۔ انھیں خواہشوں کے موتیوں کو انھوں نے اپنی نظم ''صبح فردا'' میں اس طرح پرویا ہے۔

محبت حکمراں ہو، حسن قاتل، دل مسیحا ہو
چمن میں آگ برسے شعلہ پیکر گل عذاروں کی
وہ دن آئے کہ آنسو ہو کے نفرت دل سے بہہ جائے
وہ دن آئے یہ سرحد بوسۂ لب بن کے رہ جائے

موجودہ تناظر میں اس نظم کی اہمیت بہت ہی بڑھ جاتی ہے۔ خدا کرے کہ دونوں ملکوں کے پاسبان اپنے خون سے سرحد پر محبت کے پھول کھلائیں۔ نفرت کے کانٹے نہ اگائیں۔ لیکن ذرا سوچیے کہ کیا سردار جعفری کا پیغام انسانیت اور احترام آدمیت صرف ہندو پاک کے سرحد تک ہی محدود تھا۔ نہیں بلکہ یہ وراثت امن عالم کے لئے تھی۔ ''دشمن کون'' کا یہ بند ملاحظہ کیجیے۔

مزا تو جب تھا کہ مل کر علاج جاں کرتے
خود اپنے ہاتھ سے تعمیر گلستاں کرتے
ہمارے درد میں تم تمہارے درد میں ہم
شریک ہوتے تو جشن آشیاں کرتے

یہ بند صرف ہندو پاک کے لئے دوستی کا پیغام نہیں بلکہ پورے عالم کے لئے امن و آشتی کا ورثہ ہے۔ سردار جعفری کے خراج تحسین کا حق اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب ہم ان کی انسان دوستی اور احترام آدمیت کے پیغام کو پورے عالم کے لئے امن وشتی کا پیغام سمجھیں۔

محمد مصاحب علی شعبہ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے ریسرچ اسکالر ہیں۔ انھوں نے 'حیات جاوید' اور 'حالی کے تسامحات' کے موضوع پر ایم فل کا مقالہ قلمبند کیا۔ اور پی ایچ ڈی میں 'اردو افسانوں میں اقلیتوں کے مسائل 1980 کے بعد' پر تحقیقی کام انجام دے رہے ہیں۔

علی سردار جعفری کے شخصی مرثیے

محمد ارشاد علی

اردو کی مختلف اصناف شاعری میں مرثیہ واحد صنف سخن ہے جس میں ''رثا'' ''مدح'' میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مرثیہ لکھنے والا بھلے ہی مرنے والے کی موت پر اظہار افسوس کرے لیکن اس کے ذریعہ ادا کیے جانے والے الفاظ مرنے والے کی سیرت اوراس کے کردار کی قصیدہ خوانی کرتے ہیں ۔ یہاں اس بات کی بھی وضاحت کردینا ضروری ہے کہ مرثیہ کے تعلق سے جب گفت وشنید ہوتی ہے تو ہمارا ذہن سب سے پہلے واقعات کربلا کی جانب منتقل ہو جاتا ہے اور ہم اس بات کو خاطر میں لانا بھی گوارہ نہیں کرتے کہ کربلائی مراثی بھی دراصل شخصی مرثیے کے رہین منت ہیں ۔موت پر آہ وبکا کرنا عہد آفرینش ہی سے فطرت انسانی کا جزولاینفک ہے اور یہ سلسلہ اب تک دراز ہے۔ شخصی مراثی ہمیں ماضی تا حال ہر ادب اور ہر دور میں دیکھنے کو ملتے ہیں اور کربلائی مرثیہ نے اسی کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

سردار جعفری کے شخصی مرثیے سے بحث کی سے قبل شخصی وکربلائی مرثیہ کی تعریف ملاحظہ فرمائیں

''مرثیہ کے معنی ہیں کسی کی موت پر جی کڑھانا اوراس کے محامد ومحاسن بیان کر کے اس کا نام دنیا میں زندہ رکھنا۔''

(مقدمہ شعروشاعری، مرتبہ ڈاکٹر رفیق حسین، ص 337)

پروفیسر مجید بیدار لکھتے ہیں:

''شخصی مرثیہ صرف ایسی نظموں کو کہا جائے گا جن کے ذریعہ شاعر اپنے رشتہ دار یا قرابت دار یا پھر دوستی اور محبت یا پھر استاد یا شاگرد کے توسط سے مرنے والی شخصیت سے دلی لگاؤ رکھے۔ محرم اور ربط وتعلق میں رہنے والی شخصیت کی موت پر لکھی جانے والی شاعری کو مرثیہ کہا جاتا ہے''۔

(رسالہ ہندوستانی زبان، جنوری تا مارچ 2011، ص 67)

پروفیسر گیان چند جین رقم طراز ہیں:

"چونکہ مرنے پر ماتم کرنا آفاقی اور دوامی شعار ہے اس لیے شخصی مرثیہ ہر ادب میں، ہر دور میں ملتا ہے، کربلائی مرثیے نے اسی کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ اردو میں ان کا وافر ذخیرہ ہے۔ یہ کسی بھی صنف میں مل سکتا ہے۔" (محیط، علی سردار جعفری نمبر۔ ص 98)

درج بالا سطور میں ناقدین کی جو آرا پیش کی گئی ہیں ان کو سامنے رکھ کر اتنی بات تو کہی جا سکتی ہے کہ مرثیہ دراصل اس نظم کو کہتے ہیں جس میں اظہار غم کے ساتھ متوفی کے اوصاف بیان کیے جائیں۔ اب رہا سوال کہ جب مرثیہ کا مطلب کسی کی موت پر غم کا اظہار کرنا ہے تو واقعات کربلا کو بیان کرتے وقت جب ہم شہیدان کربلا کا ذکر کرتے ہیں تو اسے کربلائی مرثیہ کیوں کہتے ہیں جب کہ وہ بھی تو شخصیت کا بیان ہے؟

اس کا جواب میری سمجھ کے مطابق یہی ہے کہ کربلا میں جو واقعات پیش ہوئے ہیں اس کے پس پردہ جو مقصد تھا وہ بس "جہاد فی سبیل اللہ" تھا۔ آل رسول ﷺ اور ان کے ساتھیوں نے۔ سر کٹانا گوارہ کیا لیکن باطل کے آگے جھکے نہیں کیوں کہ انہیں پتہ تھا کہ **اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوقًا**۔

چونکہ شہیدان کربلا کا اس میں سوائے اپنے دین وایمان کی حفاظت کے کوئی ذاتی مفاد نہیں تھا۔ اس کو ہم کربلائی مرثیہ کہیں گے، جب کہ اس کے برعکس شخصی مرثیہ جس فرد واحد پر لکھا جاتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی نصب العین ہوتا ہے۔

علی سردار جعفری نے متعدد شخصی مرثیے لکھے ہیں جن میں غالبؔ، لیننؔ، اقبالؔ، منٹوؔ، سجاد ظہیرؔ، جواہر لعل نہرو اور لال بہادر شاستری وغیرہ کے اسما خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ شخصی مرثیہ میں متوفی کی شخصیت کے خدوخال اس طرح ابھارے جاتے ہیں کہ سننے والے کو مرحوم کی سیرت سے واقفیت ہو۔ اس مضمون میں سردار جعفری کے تین شخصی مرثیوں (لینن، غالب، اقبال) کو معروضی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سردار جعفری نے اپنے مرثیہ "لینن" میں ولیدیمر ایلیک (لینن) کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ لینن انیسویں صدی کی مشہور انقلابی شخصیت تھی۔ لوگ اسے کارل مارکس کے شارح کے طور پر بھی گردانتے ہیں کیوں کہ اس نے کارل مارکس کے خیالات کی تشہیر کی تھی۔ لینن کے مارکس سے متاثر ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ 1887ء میں اس کے بڑے بھائی کو سکندر ثالث زار روس کے خلاف سازش کرنے کے جرم میں پھانسی دے دی

گئی تھی۔ لینن نے مارکس کے ان خیالات کو کہ ''یہ دنیا دو طبقوں میں بٹی ہوئی ہے، پہلا طبقہ سرمایہ داروں کا ہے اور دوسرا مزدوروں کا۔ پہلا طبقہ ظالم ہے اور دوسرا مظلوم'' کو ذہن میں بسالیا اور تیس سال کی جدو جہد کے بعد اس نے روس میں انقلاب برپا کردیا۔

اس مرثیہ میں سردار جعفری نے لینن کو دوستوں کے لیے الفت کی زبان اور دشمنوں کے لیے شمشیر سنان کہہ کر مخاطب کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ لینن کی محنت و مشقت نے دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہ اس کی محنت کا ثمرہ ہے کہ آج کا مفلوک الحال انسان بھی اپنے حق کے لیے صدائے احتجاج بلند کرسکتا ہے۔ سرمایہ دار جو کل تک ان کا خون چوستے تھے آج وہ ان پر سنگ گراں بن کر برس رہے ہیں۔ سردار جعفری نے لینن کی ہر بات کو تفسیر حیات کے مترادف قرار دیتے ہوئے کہا ہے:

سرخ فوجوں کے تجمل میں جھلک ہے اس کی
نوجوانوں کے ارادوں میں جواں ہے لینن
جس نے ہر قوم کو ہر ملک کو سیراب کیا
سرخ میخانے کا وہ پیر مغاں ہے لینن
جس کی ہر بات ہے تفسیر حیات ابدی
جس کو ہر شخص نے سمجھا وہ زباں ہے لینن

سردار جعفری نے مرثیہ ''لینن'' میں تشبیہ و استعارے کی مدد سے لینن کے اوصاف کی قصیدہ خوانی نہایت ہی عمدہ طریقے سے کی ہے۔

لینن کے بعد سردار جعفری نے دوسرا مرثیہ غالبؔ پر لکھا ہے۔ غالبؔ جو اپنی شاعری کے سبب دنیا میں مشہور ہیں، ان کی عظمت کا راز محض اس میں پوشیدہ ہے کہ ان کا کلام زماں و مکاں کی قید سے بہت آگے نکل چکا ہے اور بالغ النظر اور روشن دماغ افراد سے ہر دور میں خراج عقیدت حاصل کرتا رہا ہے۔ معنی آفرینی کا معاملہ ہو یا شعری تہہ داری کا، ہر جگہ غالبؔ، غالبؔ نظر آتے ہیں۔ غالبؔ کے مرثیے میں سردار جعفری نے غالبؔ کی شاعرانہ خصوصیات کا بیان کھل کر کیا ہے اور اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ انہیں غالبؔ سے قبل کوئی داوٗدِ سخن نظر نہیں آتا۔ اس کی آواز ساحری ہے اور بیان پیغمبری۔ ملاحظہ کریں:

جو لگادے آگ کوئی نغمہ زن ایسا نہ تھا
تجھ سے پہلے کوئی داؤد سخن ایسا نہ تھا
تو نے چھیڑے ہیں وہ نغمے شاعری کے ساز پر
لحن داؤدی کو رشک آئے تری آواز پر

غالبؔ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے سردار جعفری آگے لکھتے ہیں کہ غالب اپنے وقت کے ایسے چراغ ہیں جس کی روشنی سے نہ جانے کتنے دل منور ہو چکے ہیں اور اس کا نور مستقبل کے کاشانے میں آج بھی نظر آتا ہے۔ غالبؔ کا مرثیہ پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جعفری صاحب نے مرثیہ لکھنے سے قبل عبدالرحمن بجنوری کا وہ جملہ اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیا تھا جس میں انہوں نے غالبؔ کی کتاب کو الہامی کتاب قرار دیا ہے۔ کیوں کہ ان کی کتاب کو ام الکتاب کہنے سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔ بہر حال غالبؔ کے مرثیے میں سردار جعفری صفات انسانی کے حدود کو توڑتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن قاری پر یہ بار گراں نہیں گزرتا کیوں کہ اس کی نظر شاعر کے اشعار پر ہے نہ کہ غالبؔ کی شخصیت پر۔

لینن اور غالبؔ کے مرثیہ کے بعد جعفریؔ نے جس شخص پر قلم اٹھایا وہ کوئی اور نہیں شاعر مشرق علامہ اقبالؔ ہیں۔ اقبالؔ کی شاعری، خطبات، مقالات، فلسفہ خودی و بے خودی یا دوسری کتاب یا خصوصیات کے تعلق سے کوئی تمہیدی گفتگو کرنا ایسا ہی ہے جیسے پرانی باتوں کو یکجا کر کے دوبارہ پیش کرنا۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اقبالؔ پر تحقیق کرنے کے سارے راستے مسدود ہو چکے ہیں۔ اگر لگن و ایمانداری سے کوئی موضوع تلاش کیا جائے تو مقامات آہ فغاں اور بھی ہیں۔ سردار جعفری کے اس مرثیے میں ہمیں دو باتیں خاص طور پر نظر آتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ انہوں نے اس میں اقبالؔ کا انداز شعر اپنایا ہے اور دوسری بات یہ کہ اس میں سردار جعفری نے شعر کی تکمیل میں ایسے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے جو کلام اقبالؔ میں ہشت پہلو ہیرے کی طرح چمکتے ہیں مثلاً نرگس، ماہ وانجم، ساقی، ضرب کلیم، بال جبرئیل، سلسبیل اور ساز خلیل وغیرہ۔ ابتدائی چھ اشعار ایسے ہیں جن میں استفہامیہ انداز، سوالیہ نشان کے ساتھ موجود ہے۔ باقی اشعار ان کے اوصاف کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ مرثیہ جہاں اقبالؔ کی قصیدہ خوانی کرتا ہے وہیں ہمارے سامنے ایک سوالیہ نشان بھی چھوڑ جاتا ہے کہ اب کون ہے جو ان کے نقش قدم پر چلے، کون ہے جو کاروان شوق کو سرگرم سفر ہونے کی دعوت دے، کون ہے جس کے دم سے پھر نغمہ ساز خلیل گونجے گا۔ اس حوالے سے یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

ارتقا ہے اس کا جادہ اس کی منزل انقلاب

کاروانِ شوق سرگرم سفر ہونے کو ہے

اقبالؔ کی شاعری اپنے عہد اور اپنے نظریہ دونوں کی ترجمانی کرتی ہے۔ان کی معنویت صرف عہد اقبالؔ تک محدود نہیں بلکہ ہر دور پر محیط ہے۔بیسویں صدی میں عالم اسلام جن پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا اور مغربیت کا زور جس طریقے سے بڑھ رہا تھا اس کا ردعمل ایک انقلاب کی صورت میں نمودار ہوا۔اقبالؔ نے فلسفہ خودی سے جہاں انسان کو اس کی Inner Quality سے آگاہ کیا وہیں انہوں نے اسلامی افکار اور اپنے عہد کے پر آشوب حالات کا بیان جتنے موثر انداز میں کیا ہے اس کی مثال کسی اور شاعر کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتی۔

اس مرثیہ میں سردار جعفری نے اقبالؔ کی ابتدائی شاعری پر بھی زور دیا ہے کہ کس طرح اقبالؔ نے اپنے ابتدائی کلام میں وطن سے محبت کا اظہار کیا ہے اور کس قدر وہ مناظر فطرت کے دلدادہ ہوا کرتے تھے۔ سردار جعفری خالص ترقی پسند شاعر تھے۔لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ اقبالؔ کا مرثیہ لکھتے وقت سردار جعفری ان کے اشتراکی پہلوؤں پر توجہ صرف نہ کریں؟ کلیات اقبالؔ میں کئی اشعار ایسے ہیں جن سے نظریہ اشتراکیت جھلکتی ہے اور بہت حد تک ممکن ہے کہ ایسے ہی اشعار کو بنیاد بنا کر سردار جعفری نے انہیں اشتراکیت کا نقیب سمجھا ہو۔اس ضمن کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

کھل گیا در، پڑ گیا دیوار زنداں میں شگاف

اب قفس میں جنبش صد بال و پر ہونے کو ہے

جس کا چہرہ تھا غریبوں کے لہو سے تابناک

وہ نظام کہنہ اب زیروزبر ہونے کو ہے

ان تینوں مرثیوں کا مختصراً جائزہ لینے کے بعد اتنی بات تو کہی جا سکتی ہے کہ سردار جعفری نے مذکورہ شخصیات پر مرثیہ لکھ کر جہاں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے وہیں متوفی کے تئیں اپنے جذبات و احساسات اور عقیدت و محبت کی عمدہ تصویر بھی پیش کی ہے۔

محمد ارشاد علی شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد میں پی ایچ ڈی کے ریسرچ اسکالر ہیں۔انھوں نے ''سالک لکھنوی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ'' کے عنوان سے ایم فل کا مقالہ قلمبند کیا ہے۔

علی سردار جعفریؔ کی شاعری میں پیکر تراشی

سمیہ تمکین

علی سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے ایک نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کی شاعری ترقی پسند تحریک کے نظریات اور افکار کی بھرپور ترجمانی کرنے کے باوصف متعدد موضوعات کا احاطہ کرتی ہے، جن میں امن و سلامتی، یکجہتی و یگانگت، انسان دوستی و بھائی چارگی، عدل وانصاف، انسانی عظمت، سرمایہ دارانہ نظام سے بیزاری اور ایک منصفانہ نظام کے قیام کا پیام وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس مقالے میں علی سردار جعفری کی شاعری کو پیکر تراشی کے حوالے سے جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔

پیکر کے لغوی معنی ''شکل وصورت'' کے ہیں۔ اردو میں یہ انگریزی اصطلاح ''Image'' کے متبادل کے طور پر رائج ہے، جو لاطینی لفظ ''Imago'' سے ماخوذ ہے، جس کے لغوی معنی ''نقل کرنے'' کے ہیں۔ اردو میں اس کے لیے ''تمثال'' کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے مگر کم کم۔

اعجاز اللغات میں پیکر کی تعریف اس طرح درج ہے:

''چہرہ، شکل، صورت وغیرہ۔''

اس کے علاوہ اردو کی مستند و معتبر لغات میں ''پیکر'' کے معنی کچھ اس طرح دیے گئے ہیں:

''مورت، شبیہ، بت، عکس کے ہو بہو تصویر، خیالی تصویر، تصویر کھینچ دینا، مثالی پیکر ہونا، صورت بنانا، تصویر بنانا وغیرہ۔''

بالفاظ دیگر کوئی خیالی تصویر جب شاعری میں استعمال ہوتی ہے تو پیکر کہلاتی ہے۔

امیجری ایک انگریزی اصطلاح ہے جس کے معنی ''Collective Images'' کے ہیں۔ امریکن انسائیکلو پیڈیا میں امیجری کا مفہوم اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''ادبی تنقید میں امیجری کا مطلب ہوتا ہے تصنیف میں مجموعی پیکر، Collective Images (مخصوص قسم کے صنائع بدائع)...... اپنی ایک ابتدائی (Earliest) صورت میں لفظ Image کے معنی ہوئے آدمی یا کسی شے کی مجرد شکل میں تصویر جو عموماً تراشیدہ ...... مفہوم میں بھی Images اپنے بنیادی معنی ''اس شے کی مجرد تصویر پر جو حسیات سے باہر ہو قائم رکھتی ہے۔۔۔ لہٰذا یہ نہ صرف زیورات بلکہ تصنیف کے مفہوم ...... کے لیے بھی ضروری ہے''۔

شاعری دراصل نظریہ سے نہیں بلکہ زندگی سے تقویت پاتی ہے اور احساسات کا اظہار بھی کامیاب شعری پیکروں میں ہوتا ہے۔ امیجری دراصل شاعر کے ذہنی خیالات واحساسات کا شعوری ولاشعوری تجربات کا وہ انکشاف ہے جو علم بیان کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ کلام میں دلکشی واثر انگیزی پیدا ہوتی ہے۔

پیکر تراشی حواس خمسہ کو بیدار کرتی ہے اور انھیں متحرک بھی۔ چوں کہ ہمارے حواس خمسہ ہر وقت بیدار نہیں رہتے لیکن جب کوئی خاص مقصد ان کے سامنے آجاتا ہے تو پھر بھولی بسری یادیں خود بہ خود تازہ ہو جاتی ہیں اور اس مقصد کی وجہ سے ہمارے حواس خمسہ بھی متحرک ہو جاتے ہیں اور وہ تمام باتیں اپنی تمام تر تصویروں کے ساتھ نہ صرف نگاہوں کے سامنے آجاتی ہیں بلکہ انھیں فعال بنا دیتی ہیں۔ یوں پیکر تراشی کے ذریعہ شاعر ایسی فضا تخلیق کرتا ہے کہ ہم مناظر کو دیکھنے، آوازوں کو سننے اور بعض کیفیات کو لمس، ذائقہ اور شامہ کی مدد سے محسوس کرنے لگتے ہیں۔ چناں چہ کامیاب پیکر وہ ہے جس سے قاری کے تمام حواس بیدار ہوں یعنی شاعر جب کسی چیز کی تخلیق کرے تو اس بات کا خاص خیال رکھے کہ پیکر اس کے تمام حواس پر اثر انداز ہوتے ہوئے شعری تجربے کو اس کے احساس وادراک کی سطح تک پہنچائے۔

امیجری کی اہمیت سب سے زیادہ اس بات میں مضمر ہے کہ وہ شاعر کو اس کا پیغام قاری تک پہنچانے میں مدد دیتی ہے امیجری کے ذریعہ شاعر اپنا مقصد نمایاں طور پر دوسروں کے دل ودماغ تک پہنچا سکتا ہے اس لیے شاعری میں امیجری کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

علی سردار جعفری کا شمار بیسویں صدی عیسوی کے اردو ادب کے اہم ناموں میں کیا جاتا ہے۔ ان کا کام تین چوتھائی صدی پر پھیلا ہوا ہے، اردو ادب میں ان کی کئی ایک حیثیتیں ہیں۔ مگر ان کی پہچان دراصل ان کی شاعری سے ہے اور ایک انقلابی شاعر کی حیثیت سے وہ عوام وخاص میں مقبول ہیں۔

فنی اعتبار سے علی سردار جعفری کی شاعری جمال و جلال کا حسین مرقع ہے۔ ان کی شاعری میں دلکش تراکیب، نور و آہنگ، الفاظ کی معنویت، تشبیہات و استعارات کا علامتی رنگ کے ساتھ ساتھ پیکر تراشی کا بھی استعمال ملتا ہے۔ مگر یہ تمام کے تمام نئی تراکیب ضمنی حیثیت رکھتے ہیں ان کا خاص اسلوب دراصل بالراست بیانیہ ہی ہے۔

علی سردار جعفری کی شاعری کی متعدد جہتیں ہیں جن میں رومانی، سیاسی، تہذیبی، ثقافتی اور سماجی مسائل قابل ذکر ہیں۔ ان کی مشہور نظموں جن میں ''فریب''، ''ایشیاء جاگ اٹھا''، ''جمہوری''، ''لہو پکارتا ہے''، ''نئی دنیا کو سلام''، ''مشرق و مغرب''، ''رومان سے انقلاب تک'' وغیرہ میں ان کے کردار کی ذہنی و فکری اپج اور تخلیقی بصیرت بہ آسانی نظر آتی ہے۔

''نئی دنیا کو سلام'' اپنے موضوع و ہیئت کے اعتبار سے ایک منفرد نظم ہے جس میں شاعر نے اپنی فکر، اپنے تخیل کو تجسیم، تمثیل، علامتوں اور پیکروں کی مدد سے جان ڈال دی۔ اس نظم کے کردار علامتی کردار ہیں جن میں مریم اور جاوید جد و جہد کی علامت کے طور پر ابھر کر سامنے آئے ہیں تو فرنگی کا کردار ظلم و ستم کی علامت ہے اور اہم کردار اس بچہ کا ہے جو ابھی دنیا میں نہیں آیا۔ لیکن نئی دنیا کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اس نظم میں انھوں نے جا بجا نئی تراکیب بالخصوص پیکر کو استعمال میں لاتے ہوئے اردو شاعری کو نئی جلا بخشی ہے۔ مثال ملاحظہ ہوں:

ریگ زاروں کے سوکھے ہوئے زرد پتوں سے سیلاب ابلنے لگے ہیں
کھیتیاں خاک کی کوکھ سے اٹھ رہی ہیں
اب کے سال ان کی شاخوں پہ پتے پھلے ہیں
کارخانے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں ہتھوڑے اٹھائے ہوئے آرہے ہیں
اور لوہے کے پہیے
وقت و تاریخ کے تیز رفتار پہیوں کی مانند
انقلاب اور بغاوت کے رتھ میں لگے فتح کی راگنی گا رہے ہیں

علی سردار جعفری کی شاعری میں رجائیت ہے، دلگدازی ہے، تمکنت ہے، جوش ہے، ولولہ ہے، تلخ حقائق کا احساس ہے۔ زندگی کے جو مسائل ہیں وہ بہت ہی کٹھور ہیں، جس کا درد ہر سو پھیلا ہوا ہے، کوئی نظام

ابھی تک ایسا وجود میں نہیں آیا جو اس درد بھری زندگی سے نجات دلا سکے۔ ان تمام جذبات واحساسات کا سردار جعفری گہرا شعور رکھتے ہیں اور اسی درد کو اپنی شاعری میں پیکروں کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

درد دریا ہے ایک بہتا ہوا
جس کے ساحل بدلتے رہتے ہیں
وہی تلوار اور وہی مقتل
صرف قاتل بدلتے رہتے ہیں

جعفری صاحب کی شاعری میں رومانی رنگ بھی جھلکتا ہے انھوں نے اپنے اس جذبے کو صرف اپنی داخلی جذبات واحساسات ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ وسیع تر سماجی مقاصد کے لیے برتا ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں نئی نئی ترکیبیں جیسے پیکر وغیرہ اسی نہج کے ہیں۔ مثال کے طور پر:

رات نے اپنی کالی زباں سے
خون، شفق کے دل کا چاٹا
چار طرف خامشی چھائی
پھیل گیا ہر سو سناٹا
سین کی موجوں کی نیند آئی
ڈسنے لگی مجھ کو تنہائی

سردار جعفری نے سیاسی واقعات پر بھی قلم اٹھایا اور کئی ایک آزاد نظمیں بھی لکھیں۔ جس میں ان کی مشہور نظمیں ''فریب''، ''اودھ کی صبح حسین'' اور ''تلنگانہ'' وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ آزاد نظم میں چوں کہ قافیہ کی پابندی نہیں ہوتی اس لیے اس میں نئے نئے تجربات کے لیے راہ روشن ہے۔ جس کو مدنظر رکھتے ہوئے سردار جعفری نے پیکر تراشی کے امتزاج سے ایک نئی کیفیت پیدا کی۔ ان کے مجموعوں میں خون کی لکیر، پتھر کی دیوار، امن کا ستارہ میں مجموعی فضا اس سے پُر ہے۔

کچھ عرصے بعد ان کے دوسرے مجموعے ''ایک خواب اور'' اور ''پیراہن تشدد'' منظر عام پر آئے۔ جس میں ان کی نظم ''ایک خواب اور''، علی سردار جعفری کی شاعری کو ایک نئے موڑ پر لے جاتی ہے جو پیکر تراشی کے

نمونوں سے پُر ہے۔ اس کے علاوہ پیغمبر مسیحا دست، قتل آفتاب اور تین شرابی میں بھی یہ لہجہ سامنے آتا ہے۔
مثال کے طور پر پیغمبر مسیحا دست سے ایک مثال:

وہ ہاتھ جن کو پہنائی گئی ہیں زنجیریں
وہ ہاتھ چھید چکی ہے جنھیں صلیب کی کیل
وہ ہاتھ شعلہ حق بن کے ہو رہے ہیں بلند
اندھیری رات میں روشن ہے صبح نو کی دلیل

سردار جعفری کی ایک مشہور نظم ''میرا سفر'' ہے جو پیکر تراشی کے فن پر کھرا اترتی ہے اس نظم میں ایسے ٹھوس اور مرکب پیکر ہیں جو قاری کو تخیل کے سہارے کسی اور جہاں کی سیر کراتے ہیں جس سے قاری کے حواس مکمل طور پر متاثر ہیں غرض مرکب پیکروں پر مشتمل یہ نظم کسی بھی ایک نظم کے لیے باعث افتخار ہے۔

امیجری کسی خاص واحد شکل میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ مختلف صورتوں میں رونما ہوتی ہے۔ اس کا خاص تعلق مصنف یا شاعر کے ذہن سے ہوتا ہے کہ وہ امیجری کا کس طرح سے استعمال کرتا ہے امیجری کا عمل خواب اور بے خوابی دونوں حالتوں میں وقوع پذیر ہوتا ہے چنانچہ امیجری کے حدود کا تعین کرنا مشکل ہے اور اس کے اقسام کی قطعی فہرست بنا دینا ناممکن نہیں تو ممکن بھی نہیں اور یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ امیجری کا دائرہ کار یہی ہے اور وہ اس کے باہر قدم نہیں رکھ سکتی۔

پیکر تراشی کے تعلق سے یہ دھوکا نہیں ہونا چاہیے کہ شاعر صرف ایسے پیکر تراشے گا جنھیں آنکھوں ہی سے دیکھا جا سکتا ہے کیوں کہ پیکر تراشی صرف بصارت سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ سمعی اور ذوقی پیکر بھی تراشے جا سکتے ہیں۔

سردار جعفری کی پیکر تراشی کو حواس خمسہ کی مدد سے تقسیم کیا جا رہا ہے تا کہ جو مقصد ہے وہ واضح ہو جائے۔

حواس خمسہ کے اعتبار سے پیکر تراشی کی پانچ قسمیں ہیں:

(۱) بصری، (۲) سماعی، (۳) شمومی، (۴) مذوقی، (۵) لمسی

بصری پیکر

وہ پیکر جو حس بصارت کو متوجہ کرتے ہیں یہ تین طرح کے ہوتے ہیں (۱) شکل سے متعلق، (۲) رنگ سے متعلق، (۳) حرکت سے متعلق۔

بصری پیکر کی مثال:

ابھی بہار کے لب پر ہنسی نہیں آئی
نہ جانے کتنے ستارے بجھی سی آنکھوں کے
نہ جانے کتنے فسردہ ہتھیلیوں کے گلاب
ترس رہے ہیں ابھی رنگ و روشنی کے لیے

(کون دشمن ہے)

شکل سے متعلق:

زہر آلود وہ بیتے ہوئے لمحات کے ڈنک
خوں میں ڈوبی ہوئی وہ صبح کی تلوار کی دھار
ناگ بیٹھے ہیں قوانین کے پھن پھیلائے
اور آئین کا بیں اپنی لہروں میں چھپا لیتا ہے

(ایک سال)

(۲) رنگ سے متعلق:

شام کی آنکھ میں بارود کے کاجل کی لکیر
اور ہفتوں کے سپاہی و مہینوں کے سوار

(ایک سال)

(۳) حرکت سے متعلق:

پہرے دار کی نگاہوں سے ٹپکتا ہے لہو
رائفل کرتی ہے فولاد کے ہونٹوں سے کلام

(ایک سال)

(ii) سمعی پیکر

وہ پیکر جو حس سماعت کو متوجہ کرتے ہیں سمعی پیکر کہلاتے ہیں:

ہر ایک سمت صدا دے رہے ہیں سنائے
خموشی بولتی ہے خوف کی زبان ہو کر
مجھے ہی مار کر گزریں گے قافلے گل کے
خموشی مہر بہ لب ہے کسی صدا کے لیے

(سناٹا)

(iii)شمومی پیکر

وہ پیکر جو حس شامہ کو متوجہ کریں شمومی پیکر کہلاتے ہیں:

مناؤ جشن محبت کہ خوں کی بو نہ رہی
برس کے کھل گئے بارود کے سیہ بادل

(تاشقند کی شام)

(iv)مذوقی پیکر

وہ پیکر جو ذائقہ سے تعلق رکھتے ہوں مذوقی پیکر کہلاتے ہیں:

یہ سرحد جو لہو پیتی ہے اور شعلے اگلتی ہے
ہماری خاک کے سینے پہ ناگن بن کے چلتی ہے

(صبح فردا)

(v)لمسی پیکر

وہ پیکر جو حس لامسہ سے تعلق رکھتے ہیں لمسی پیکر کہلاتے ہیں یہ دو طرح کے ہوتے ہیں (i) نرمی وسختی ظاہر کرنے والے، (ii) گرمی یا سردی کا احساس دلانے والے۔

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے
اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبح آزادی

(صبح فردا)

چوں کہ پیکر حسی اور ادراکی ہوتے ہیں لہذا حواس خمسہ کی نسبت سے ان کے نام دیے جاتے ہیں۔ پیکر کے اور بھی کئی اقسام ہیں جس کو سردار جعفری کی مثالوں کے ذریعہ واضح کیا جائے گا۔

(۱) حرارتی پیکر (Thermel Image):

اس سے ہم گرم چیزوں کا احساس کرتے ہیں اور ذہن میں حرارتی پیکر بنا لیتے ہیں۔

جب ابھرتا ہے افق سے زندگی کا آفتاب
جب نکھرتا ہے لہو کی آگ میں تپ کر شباب

(آزادی)

(۲) برودتی پیکر (Nibernal Image)

اس سے ہم سرد چیزوں کا احساس کرتے ہیں اور ذہن میں برودتی پیکر بنا لیتے ہیں:

سلگ اٹھتی ہے انتقام کی آگ
برف کی چوٹیاں دہکتی ہیں

(وقت کا ترانہ)

(۳) محرک پیکر (Empatino Image)

اس سے ہم ذہن میں مختلف قسم کے پیکر بنا لیتے ہیں:

خدا محفوظ رکھے اس کو غیروں کی نگاہوں سے
پڑیں نظریں نہ اس پر خوں کے تاجر، تاجداروں کی

(صبح فردا)

(۴) استغراقی پیکر (Sinaetic Image)

اس قوت سے ہم کسی تخلیق کے حسن میں کھو جاتے ہیں اور اس عالم میں یہ پیکر بنتے ہیں:

کھلیں گے پھول بہت سرحد تمنا پر
خبر نہ ہوگی یہ نرگس ہے کس کی آنکھوں کی
یہ گل ہے کس کی جبین کس کا لب ہے یہ لالہ
یہ شاخ کس کے جواں بازوؤں کی انگڑائی

(تاشقند کی شام)

(۵) رنگین سامعہ یاالوانی سامع پیکر

یہ ایک احساس رنگ بھی ہے جس کے ذریعہ ہم کسی چیز کو ایک حواس سے دوسرے حواس کی طرف منتقل کر لیتے ہیں مثلاً کسی آواز کو سن کر ذہن کسی رنگ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور اس رنگ کے پیکر بنا لیتا ہے اس کو رنگین سامعہ یا الوانی سامع کہتے ہیں۔

یہ ایک پھول ہے جو زخم کے گلستاں میں
کھلا، نہایا، شہدوں کے خوں کی بارش میں
نہایا خواہش امن و اماں کی شبنم میں

(امانت غم)

(۶) متحرک پیکر (Dynamic Image)

اس قسم کے پیکر میں پیکر اگر ذہن میں متحرک ہو تو اس کو متحرک پیکر کہتے ہیں:

ان لبوں پر جو بوسوں سے محروم ہیں
اک تبسم کی بے باک و روشن کرن
خنجروں کی چمک کے مقابل
ایک نعرہ ہوں میں
ایک پرچم ہوں میں
ایک سمندر کا بے ساختہ قہقہہ
اور ان کے سوا
یعنی کچھ اور بھی
جس کو اک لفظ شاعرنئی معنویت عطا کر رہا ہے
گیت کا روپ
نغمے کا پیکر

(۷) جامد پیکر (Static Image)

پیکر اگر خاموش اور پرسکون ہوں تو جامد پیکر کہلاتے ہیں:

یہ شفاف آنکھیں یہ آنکھوں کے ڈورے

چھلک جائیں جیسے گلابی کٹورے

جو ہاتھوں کو رنگ حنا مل گیا ہے

ہتھیلی پہ گویا کنول کھل گیا ہے

(۸) رنگیں پیکر (Colour Image)

اگر پیکر رنگ برنگ کا ہو تو اس کو رنگین پیکر کہتے ہیں:

اس دہکتے ہوئے گلستاں سے

ایک دو سرخ پھول لیتا ہے (کشمیر)

(۹) بے رنگ پیکر (Occoorlies Image)

اگر پیکر بے رنگ ہو تو وہ بے رنگ پیکر کہلاتے ہیں:

سیاہ رنگ پھریرے ہوا میں اڑتے ہیں

کھڑی ہوتی ہے سیہ رات سر اٹھائے ہوئے

سیاہ زلفوں سے لپٹے ہوئے ہیں مار سیاہ

سیاہ چمن پس سیہ پھول مسکرائے ہوئے

سیاہ وادی و صحرا سیاہ دریائیں

سیاہ دشت، سیہ کھیت لہلہائے ہوئے

سیاہ دودھ ہے ماں کے سیاہ سینے میں

سیاہ بچوں کو آغوش میں سلائے ہوئے

ضمیر عہد غلامی کی تیرگی ہے یہ رات

جو پھر رہی ہے اجالے سے منہ چھپائے ہوئے

(۱۰) آزاد پیکر (Free Image)

بعض پیکر جو تخلیقی نقطہ نظر سے آزاد ہوتے ہیں وہ آزاد پیکر کہلاتے ہیں:

یہ سرحد خوں میں لتھڑ پیار کے زخمی گلابوں کی
میں اس سرحد پر کب سے منتظر ہوں صبح فردا کا

(صبح فردا)

(۱۱) یادداشتی پیکر (Memory Image)

ایسے پیکر جن کا تعلق ماضی کی یادوں سے ہے وہ یادداشتی پیکر کہلاتی ہیں:

یہ سرحد خون کی، اشکوں کی، آہوں کی، سراروں کی
جہاں بوئی تھی نفرت اور تلواریں اگائی تھیں

(۱۲) تخیلی پیکر (Fancy Image)

جن پیکروں کا تعلق مستقبل سے ہے وہ تخیلی پیکر کہلاتے ہیں:

پوچھتا ہے تو کب اور کس طرح آئی ہوں میں
گود میں ناکامیوں کے پرورش پائی ہوں میں

(آزادی)

(۱۳) باشعور وہمی پیکر (Eidetic Image)

ایک ایک پیکر جس کا تجربہ اس قدر شدید انداز میں ہو کہ وہ بالکل اصلی محسوس ہونے لگیں وہ باشعور وہمی پیکر ہے:

ہر سڑک پر سمندروں کا اُبال
ہر گلی میں ہے جوش طوفانی
غرق کر دے گی بادشاہی کو
آدمی کے لہو کی طغیانی

(وقت کا ترانہ)

(۱۴) وہمی پیکر (Nalluginatocy Image)

جب پیکر پر حقیقت کا گمان گزرنے لگے تو وہ وہمی پیکر ہے:

جب کسانوں کی نگاہوں سے پکتا ہے ہراس
پھوٹنے لگتی ہے جب مزدور کے زخموں سے یاس
(آزادی)

(۱۵) مصنوعی نومی پیکر (Hypnacobid Image)

غنودگی کے عالم میں کوئی پیکر نظر آتا ہے تو وہ اس نام سے منسوب کیا جاتا ہے:

ابھی ابھی مری بے خوابیوں نے دیکھی ہے
فضائے شب میں ستاروں کی آخری پرواز
خبر نہیں کہ اندھیرے کے دل کی دھڑکن ہے
کہ آرہی ہے اجالے کے پاؤں کی آواز
بتاؤں کیا تجھے نغموں کے کرب کا عالم
لہولہان ہوا جارہا ہے سینہ ساز

مرکب پیکر

اس کے علاوہ سردار جعفری کے یہاں مرکب پیکر کی مثالیں بھی موجود ہیں جو حسب ذیل ہیں:

دھنک کی طرح بنتی، ندیوں کی طرح بل کھاتی
وطن کے عارضوں پر زلف کے مانند لہراتی
مہکتی، جگمگاتی اک دلہن کی مانگ کی صورت
کہ جو بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے
مگر سیندور کی تلوار سے صندل کی انگلی سے
ہر طرف بکھرا ہوا ہے چاند سے ماتھے کا نور
موج جمنا میں ہے رادھا کی نگاہوں کا سرور

آج پھر کاشی کی پیشانی پر رقصاں نور ہے

آج پھر تلسی کے نغموں سے فضا معمور ہے

الغرض پیکر تراشی کے ذریعہ شاعر یا ادیب کے فن اور فکر کا مطالعہ ممکن ہی نہیں نہایت ہی آسان ہے۔ اس لحاظ سے سردار جعفری کا مطالعہ پیکر تراشی کے ذریعہ کرنا زیادہ مناسب اور فائدہ مند ہے اور اس خیال کو پیش نظر رکھ کر سردار جعفری کے فکر و فن کو پیکر تراشی کے آئینہ میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جعفری صاحب نے آسان روش کو اپناتے ہوئے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو آگے بڑھایا۔ جس کی وجہ سے ایک عام قاری بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اپنی شاعری میں ہیت کے نئے تجربات کی وجہ سے ان کی شاعری ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے کیوں کہ انھوں نے اردو ادب کو نئی نئی ہیئتوں سے روشناس کرایا۔ بہرکیف علی سردار جعفری کو فیض اور مخدوم کے بعد تیسرا بڑا شاعر ہونے کا فیض حاصل ہے۔ ان کا خاص کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی انقلابی حسیت کو ایک نئے پیکر، نئے آہنگ اور نئے لب ولہجہ کے ذریعہ قارئین تک پہنچایا۔

سمیہ تمکین شعبہ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کی پی۔ایچ۔ڈی ریسرچ اسکالر ہیں۔انہوں نے "ناصر کاظمی کی شاعری میں پیکر تراشی" پر اپنا ایم۔فل کا تحقیقی مقالہ تحریر کیا ہے۔ان کی پی۔ایچ۔ڈی کا موضوع 'جدید اردو شاعری کی فکری جہات' ہے۔

علی سردار جعفری کی تخلیقات کا مطالعہ نسائی نقطہ نظر سے

ڈاکٹر جاں نثار معین

سردار جعفری عوامی شاعر تو تھے ہی لیکن انھوں نے خواتین پر مخصوص نظمیں مزدور لڑکیاں، سرمایہ دار لڑکیاں، عورت کا احترام اور عورت کے نام سے لکھا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تخلیق و تنقید میں عورت کو مرکزی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ نیز متصورہ نقطہ اس شعر پر منحصر ہے۔

ہر عاشق ہے سردار یہاں　　　　ہر معشوقہ، سلطانہ ہے

یہ احساس ان کے یہاں اکثر ملتا ہے۔ انھوں نے ہر تحریر میں نسائی فکر و نظر کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ سردار کی ہر تحریر میں نسائی فکر و مسائل کثرت سے ملتے ہیں۔ سلطانہ منہاج سے سردار کا رومان ہوا جب کہ وہ شادی شدہ تھیں۔ لیکن یہ سردار کی جاذبیت تھی کہ انہوں نے پہلے شوہر سے علاحدگی اختیار کی اور سردار سے شادی کرلی۔ جعفری نے نظم سرخ سپاہی کا خط اپنی اہلیہ کے نام میں نجی جذبات واحساسات اور برجستہ محبت کا اظہار بحیثیت فخر اس طرح کیا ہے:

اے پرستانِ محبت کی پری　　　　اے فروغ شمع بزم دلبری
ہاں یہ سچ ہے تو مجھے کرتی ہے پیار　　　　تیرا پیمانِ وفا ہے استوار[۱]

یہی وہ سلطانہ ہے جسے سردار نے اپنی مشہور نظم میرا سفر میں خراج پیش کیا ہے۔ اس کا ذکر انہوں نے آپ بیتی میں بھی کیا ہے ہم ایک کافی ہاوس میں ملے۔ پہلی ملاقات میں ہی بہت اچھی، بڑی بھلی سی لگی، ہم اکثر ملنے لگے اور پہروں محو گفتگو رہتے۔ ایک روز میں نے اس کے حسن کی تعریف میں کہا، ''آپ تو بالکل وینس ڈی میلو لگتی ہیں'' اس کے ایک مہینہ بعد اس نے مجھے وینس ڈی میلو کا ایک مجسمہ تحفے کے طور پر پیش کیا۔ تو میں نے یہ کہہ کر قبول کیا کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں[۲]۔ ان کے افکار وفن سے متعلق پروفیسر شارب ردولوی نے لکھا ہے ان کی شاعری میں محاسن انداز، خوبصورت الفاظ، دلکش تراکیب، نازک پیکر، حسین استعارے، محبت کی

زبان اور الفاظ کا فنکارانہ انتخاب دلکش انداز میں ملتا ہے۔ جیسے بازار مہر وفا میں...... چھوٹا سا دل بیچ رہا ہوں...... کیا کوئی ایسا ہے جو ہونٹوں کی افسردہ شاموں کو...... صبح تبسم عطا کرے؟۔ اس ثبوت سے معلوم ہوتا ہے دلفریبی پر نا آسودہ ہونے کے بجائے وہ زخمی خوابوں کے ویرانوں میں بھٹکنے سے بہتر نئے خواب دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ جس کا ایک اور ثبوت نظم محبت کا فسوں میں پیار کے رشتہ میں ایک ارتقاعی شان ملتی ہے:

شوق ناکام سہی پھر بھی محبت کا فسوں زلف — بر دوش و جنوں خیز و جواں ہے اے دوست
سینۂ بحر سے اٹھتے ہوئے طوفانوں پر — تیری کھلتی ہوئی زلفوں کا گماں ہے اے دوست

محبت سے بھرے ان اشعار سے سردار کی نفسیات کا اندازہ ہوتا ہے وہ کتنے حساس ذہن تھے۔ انہوں نے معشوق کے نفیس احساسات کو الفاظ کے سہارے بڑی باریک بینی سے تعریف کی ہے۔ ایک اور نظم حسن سوگوار میں ایک مانوس نسوانی سراپے کی فسوں کاری کو جذبات و احساسات کے لطیف خیالات کو مختلف انداز میں محبوبہ کی جاذبیت اور اس کی کشش کی بہترین عکاسی کی ہے:

کیا کہوں کیا ہے وہ حسن سوگوار — جس کی نظریں دور سے کرتی ہیں پیار
خال و خط میں رس، نگاہوں میں شراب — ہلکی ہلکی سانس میں روح شباب
انکھڑیوں میں خواب و بیداری لیے — زلف کے ہر خم میں دلداری لیے

جعفری کی اولین نظمیں عشقیہ ہیں۔ ان میں محبوب کے جسمانی حسن اور شیوہ و ادا کا بیان نرم و نازک لہجہ میں شائستگی سے ہوا ہے۔ نیز مصرعوں کی بندش میں جس نوع کی تازہ کاری سے فطرت سے والہانہ محبت کا اظہار علامتی نظر آتا ہے:

یہ جسم کی خوشبو ہے کہ مہک بیلے کی چٹکتی کلیوں کی — پیراہن رنگیں سے شاید جنت کی ہوائیں لپٹی ہیں

شاعر نے عشقیہ جذبات میں بھی استعاروں کی رمزیت سے نازنیں کے حسن کی تصویر کھینچی ہے۔ آزاد نظم ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا میں محبوبہ کا ذکر بڑے دلکش انداز سے کرتے ہیں۔ وہ محبوبہ کے سوا کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ شکنتلا ہے یہاں نہ ہیلن...... نہ ہیر ہے اور نہ جولیٹ ہے...... فقط تمہارے بدن کا موسم...... کوئی نہیں تم سے بڑھ کر دنیائے دلبری اور عاشقی میں...... ہر ایک سے تم حسین تر ہو...... تمہارے دلکش بدن کے رنگوں میں مضطرب ہے...... زمین کا رنگ تم زمیں کا جمال تم ہو...... زمیں کی بیٹی...... تم اپسروں سے اور

حوروں سے پاک تر ہو...... مگر تم اس خاک کی چمک ہو...... کہ جس کی نس نس میں ...... سیب انگور او گیہوں کی فصل کا خوں رواں دواں ہے ...... بدن میں شبنم کی روشنی ہے ...... محبوبہ کی تعریف کے بعد اس کو پانے کی حسرت یوں ہے تم اپنے ہونٹوں کا شہد ...... آنکھوں کے پھول ...... ہاتھوں کا چاندے دو۔[5] وہ محبوبہ کے حسن و جوانی کی تعریف کے بیان میں اس قدر ہنر رکھتے ہیں ایک قطرہ بھی ہو تو سمندر سے ملا سکتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہوں:

روانی ایسی کہ گنگا کی کھایئے قسمیں
روانی ایسی کہ جنت کا آب جو کہیے

اس شعر سے ان کی جواں عمری و تعقل پسندی اور نسائی حسیت سے وہ خوب واقف نظر آتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں نسائی حسنِ جمالیات مخصوص انداز میں منظر کشی کی ہے۔ اس ہنر کے پیچھے ان کا خود نجی تجربہ ہے۔ جس کی ایک مثال خرم قدم کے شعر میں دیکھی جا سکتی ہے:

ادا کی برق چمکی زلف پیچاں کی گھٹا برسی　　　اودھ کے میکدے کی سمت ابر کوہسار آیا[6]

ان کی شاعری دلکش اشاراتی اور برجستہ اظہار ہے۔ انھوں نے بڑی سادگی سے محبوبہ کے حسن کو خوبصورت الفاظ میں پیش کیا ہے۔ جیسے وہ نظم خوشی میں پہلے بند میں ہی اجنتا کے پراسرار غاروں سے نکلنے والی دوشیزاؤں کے بے مثال حسن کا علامتی انداز میں ذکر کرتے ہیں تو کہیں دستِ حنائی پر اظہار الفت کرتے ہیں:

اندھیری رات میں اکثر وہ دوشیزہ نکلتی ہے　　　مسیح و خضر و گوتم کو رہی ہے جستجو جس کی
زمانے نے ہزاروں سال کی ہے آرزو جس کی　　　جبیں پر جس کی صبح نو کی تابانی مچلتی ہے
ازل کی تابش سیمیں ہے ہالہ اس کے چہرے کا　　　کف دستِ حنائی پر ابر کی شمع جلتی ہے

غور طلب اشعار ہیں نظم کا محرک وقتی ہونے کے باوجود یہاں شاعر نے نظم خوشی میں مرکزی خیال دوشیزہ کا رکھا ہے۔ یہی جذبہ ان کی ایک نظم تین شرابی مختلف اقوام کے انسانوں کے میل ملاپ سے جو تنہائی اور بیگانگی کے خول سے پیدا ہونے والے احساسات کو استعاراتی رمزیت کا اظہار ہے:

عشق و طرب کی محبوبائیں　　　نشۂ مے کی دوشیزائیں
کتنی شیریں اور لیلائیں　　　کتنے رانجھے کتنی ہیریں
مشرق و مغرب کی تقدیر　　　حلقہ باندھے ناچ رہی تھی

سردار کی شاعری میں عورت مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی خوبیاں بیشتر نظر آتی ہیں۔ ان کے خیال میں عورت صنفی اعتبار سے مساوی درجہ رکھتی ہے۔ قدرتی طور پر بے حد جذباتی اور لطیف ہوتی ہے۔ جسے مردوں نے مفاد کے تحت ہمیشہ استحصال کیا ہے۔ سردار نے اپنی آزاد نظم اودھ کی خاک حسیں میں ماں کے اخلاقِ حمیدہ اور اعلی صفات کا اظہار اس شعر میں کیا ہے:

کہ جس پر انگڑائیوں نے اپنے حسیں نشیمن بنا لیے ہیں

میں اپنی ماں کے سفید آنچل کی چھاؤں کو یاد کر رہا ہوں

اس شعر میں غریب کسان، مزدور خاتون کی بے بسی ہے۔ ایک مصرعہ میں لکھا ہے یہ خواتین جن کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہیں اور جو اونچے پیڑوں پہ اپنے بالوں کی پھانسیوں میں لٹک رہی ہیں ہر طرح سے عورت پر زیادہ تر ظلم وستم کیا گیا ہے۔ چاہے گھریلو ہو یا کارخانوں میں۔ کیوں کی عورت کی اُجرت شروع سے ہی مرد کے مقابل میں کم ہوتی ہے۔

اس مختصر تعارف کے ساتھ ہی ان کی شاعری میں عورت کی اہمیت وافادیت پر ان کی نظم عورت اردو کی رومانی نظموں میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے صنفِ نازک کو حسن جمالیات سے کہیں تعبیر کیا ہے تو کہیں اسے زندگی کی ناگزیز ضرورت قرار دیا ہے۔ یہ سردار کی شاعری ہے جہاں عورت کی حسیت بالائی سے لے کر اس کے فہم ادراک کی صحیح ترجمانی نہ صرف ان کی شاعری میں بلکہ ان کی نجی زندگی کے رکھ رکھاو میں بھی جا بجا ملتی ہے۔ جس کا ذکر انہوں نے تشبیہات واستعارات کے ساتھ تغزل بھرے لہجے میں کیا ہے۔ یہ نظم وجودِ زن کی بہترین شاعرانہ عکاسی ہے:

صدف کو خوبیِ قسمت سے تو جو مل جاتی صدف کے سینۂ روشن میں اک گہر ہوتی

ترا نزول جو ہوتا سوادِ گلشن میں نہالِ فصلِ بہاراں کا اک ثمر ہوتی

گر ہواں کے آغوش میں جگہ پاتی تو رقصِ شعلہ و بیباکئ شرر ہوتی

زمیں پہ ٹوٹ کے گرتی نہ آسماں سے اگر ندیم چاندنی، تاروں کی ہم سفر ہوتی

عورت کے حسن وجمال کی تعریف میں کبھی فصلِ بہاراں سے جوڑا تو کبھی اسے رقصِ شعلہ و بیباکی شرر کہا۔ یہاں شاعر نے مردوں کی نفسیات اور ان کے احساسات کی منظر کشی کی ہے۔ یہ حقیقت ہے عورت بھی فرد کے لحاظ سے مساوی درجہ رکھتی ہے۔ اس کی نا آگہی سے اپنے اہمیت کھو رہی ہے اور تاریکی اُس کا نصیب بن گئی ہے۔

اندھیری شب کو میسر نہیں جمال ترا | نہیں تو رات سحر سے حسین تر ہوتی
جو بحر پر ترے آنچل کی چھاؤں پڑ جاتی | تو موجِ بحر کے شانوں پہ زلف تر ہوتی
حیات نے تجھے عورت کا مرتبہ بخشا | نہیں تو شمع افق مشعلِ سحر ہوتی
عطا کیا ہے محبت کا اک جہاں تجھ کو | بنایا فطرتِ آدم کا راز داں تجھ کو ے

ان کی نسائی فکر سے متعلق علی احمد فاطمی نے لکھا ہے سردار سے قبل عورت کی روایتی امیج جوش اور اختر شیرانی نے بدلے ضرور تھے لیکن مجاز نے جب آنچل کو پرچم بنانے کی بات کہی تو پوری ترقی پسند شاعری میں عورت کا کردار ہی بدل گیا۔ فیض کی محبوبہ ہو یا کیفی کی عورت، مجروح وساحر کی ہم سفر سبھی نے باغیانہ ہم سفری، ہم نظری کے مناظر پیش کئے لیکن سردار کی مریم صرف جاوید کی بیوی یا ہندوستان کی عورت نہیں بلکہ دنیا کی تمام بہادر عورتوں کی علامت بن جاتی ہے:

ہے انسان کی کائنات اس کے دم سے | فروزاں ہے شمعِ حیات اس کے دم سے
اس آنچل میں ہے زندگی کا شرارہ | وہ آغوش تہذیب کا گہوارہ

ان اشعار کے علاوہ انہوں نے عورت کا احترام میں خواتین کی مشترکہ نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے طنز کا گوشہ نمایاں کیا ہے۔ جو ان اشعار میں ایک خاص کیفیت میں سمویا ہے۔ کہا جائے تو یہ خیال اپنے آپ میں نسائی جمالیات کی پوری عکاسی کا مرکزی پیکر ہے۔

کیا ہوا گر تری رنگیں رہگذر سے دور دور | زندگی کے راستوں میں پیچ وخم کھاتا ہوں میں
تو نہ جانے کیوں سمجھتی ہے کہ تجھ کو بھول کر | اپنے احساسات کی دنیا میں کھو جاتا ہوں میں
میری خاموشی پہ اکثر تمتما اٹھتی ہے تو | تیری خاموشی کا لیکن راز پا جاتا ہوں میں
آہ یہ تہذیب کا خاد و تمدن کا فریب | اس نظامِ زندگی میں جس سے رسوا ہے حیات
تیری ہستی رقصِ عشرت کے سوا کچھ بھی نہیں | اپنے ہونٹوں کے حسیں گلنار محرابوں سے پوچھ

اِن اشعار میں سردار نے مخصوص رنگ وآہنگ میں صنفِ مظلوم سے متعلق جن احساسات کو وفورِ جذبات اور شدتِ اثر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ عورت کے جوہرِ ذاتی تک پہنچنے کی ایک مقبول کوشش کی ہے۔ عورت کی پیش کشی سے ہی شاعر کا امتیازی وصف نمودار ہوتا ہے۔ نسائی پیکر کو انہوں نے اپنی تحریروں کا موضوع بحث بنا یا۔ جیسے عورت کی جمالیات حسیت کو حسن زن سے جوڑا، فطرت اور نزاکت کو بہترین شعری پیکر عطا کیا ہے۔

ان میں بوسوں کی حرارت کے سوا کچھ بھی نہیں　　تیرے ابرو کے اشاروں میں ارادہ ہے نہ شوق

تیری آنکھوں میں شرارت کے سوا کچھ بھی نہیں　　یہ ترے ماتھے کا ٹیکہ آنکھوں میں شرارت کے سوا کچھ بھی نہیں

یہ ترے چہرے کا غازہ یہ ترے ہونٹوں کا رنگ　　عشق کی نظروں میں دعوت کے سوا کچھ بھی نہیں

یہ نظم نہ صرف صنفِ نازک کی نزاکت کی عکاسی کرتی ہے۔ بلکہ نسائی کشمکش کی خوبصورت انداز میں چھوٹے چھوٹے جملوں میں علامہ اقبال کی فکر وجودِ زن سے ہے کائنات میں رنگ کی حقیقت سردار کی اس نظم میں ملتی ہے۔ اس دور اندیش شاعر موقع محل عورت کی نازکی، لطافت، حسن اور اس کی شرارت کو بطور علامت پیش کیا ہے۔

تیرے اعضا کی نزاکت تیرے پہلو کا گداز　　مرد کے بستر کی زینت کے سوا کچھ بھی نہیں

میں یہ کہتا ہوں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں　　سوچتا ہوں اور اکثر سوچتا رہتا ہوں میں

کیا تری دنیا نزاکت کے سوا کچھ بھی نہیں　　جذب کر لیتی ہے تجھ کو مرد کی جادوگری

جب شاعر نے نسائی حسن ونزاکت کو استعارہ کے طور پر پیش کیا ہے وہیں سماج پر ایک طنز کیا ہے۔ وہ عورت کو نشاط کا کھلونا اور لذت کا سامان سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

تو کہ اک لمحے کی فرصت کے سوا کچھ بھی نہیں　　اک نشاط آگیں کھلونا بن کے رہ جاتی ہے تو

جیسے تو سامانِ لذت کے سوا کچھ بھی نہیں　　جب تلک تو خود نہ توڑے گی طلسم رنگ و بو

تیری قیمت ایک عورت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ [۳]

اس ضمن میں پروفیسر سید محمد عقیل نے رقم کیا ہے عورت کی یہ تصویر ہندوستانی ہے جو مدتوں سے سامی، ایرانی اور ترکی کی رنگ آمیز تصویر ہے۔ جیسے عورت پیر کی جوتی سے اوپر اٹھ کر حرم سرا کے رنگین شبستانوں سے گھومتی ہوئی اپنے محدود احترام یافتہ تجربوں سے باہر نکلتی ہے۔ مارکسی تصور کے ساتھ آکر مرد کے شانہ بہ شانہ کھڑی ہو جاتی ہے۔ [9] اس کا اعتراف خود سردار نے ترقی پسند ادب صفحہ 241 میں اس طرح کیا ہے۔ ''اور اب یہ نئی عورت ہمارے ادب میں قدم رکھ رہی ہے...... جب تک عورت کو معاشی آزادی نہیں ملے گی اور وہ وسیع سماجی آزادی میں اپنا حصہ حاصل نہیں کرے گی تب تک عشق اور حسن دونوں بیمار رہیں گے۔ اب عورت کے تصور میں گہرائی پیدا ہو رہی ہے۔ جو بہترین قسم کی حقیقت نگاری بھی ہے۔''

سردار کے روشن ارتقائی نظریات کی وجہ سے پرواز کی مزدور لڑکیاں نئی دنیا کو سلام تک پہنچتے پہنچتے ایک ذہین باغی عورت کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ مزدور لڑکیاں، میں سردار خود بدلتے ہیں نئی دنیا کو سلام میں عورت عالم کاری کے اثرات سے نجی طور پر بدلتی رہتی ہے۔ اس طویل تمثیلی نظم میں عورت، محبت، حرارت، حریت، تاریخیت، وطنیت، رومانیت، رنگ و آہنگ میں جمالیاتی شعور میں پیش کی گئی ہے۔ ''میری مریم۔۔ میرے بچے کی ماں...... تو کبھی بنگال کی سیکڑوں عورتوں کی طرح اپنے روتے ہوئے...... لال کو، دل کے ٹکڑے کو، سنسان راہوں کی جلتی...... ہوئی خاک پر ڈال کر بھاگ جائے گی ان قحبہ خانوں میں...... جن میں روٹی کے سوکھے ہوئے ایک ٹکڑے...... کی خاطر جواں عصمتیں گوشت کے لوتھڑوں کی طرح...... بک رہی ہیں۔۔ تیرے مظلوم بچے کی چیخیں...... عصمتیں بک رہی ہیں...... عزتیں بک رہی ہیں''۔ ١٠

نظم 'مزدور لڑکیاں' کے علاوہ عورت ان کے ابتدائی نظموں میں مرکزی حیثیت سے پیش ہوتی رہی۔ نیز وہ خواتین کے مسائل پر ایک دردمندانہ اظہار ہے جو ایک نسائی آواز بن کر ابھرتی ہے۔ خواتین کے ذریعہ دنیا کے نظام کو بدلنے کا تصور پہلی بار سردار کے یہاں ملتا ہے۔

گردش افلاک نے گودی میں پالا ہے انھیں	سختی آلام نے سانچے میں ڈھالا ہے انھیں
گھورتی رہتی ہے گرمی میں نگاہ آفتاب	آسماں کرتا ہے نازل ان پہ کرنوں کا عتاب
سر سے ساون کی گھٹا جاتی ہے منڈلاتی ہوئی	سرد جاڑوں کی ہوا سینوں کو برماتی ہوئی
بیکسی ان کی جوانی مفلسی ان کا شباب	ساز ان کا سوز حسرت خاموشی ان کا رباب
سر سے پا تک داستانیں حسرت ناکام کی	نرم و نازک قہقہوں میں تلخیاں ایام کی

اس نظم کی اہم خصوصیت یہ ہے عورت کے قہقہوں سے لے کر اس کے نرم و نازک لہجے اور اداؤں اور زرد گالوں کی کشش کو ان لفظوں میں سمویا ہے۔ عورت کی لطافت اور پیچیدہ تصورات کو بھی اس نظم کے دامن میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ کہیں اس کے ملائم ہونٹوں کی اہمیت، ہاتھوں کی نرمی کو لے کر ایک ایسا منظر پیش کیا ہے جس سے عورت کی معصومیت اور اس کی نزاکت سے دنیا میں رونق ہے۔

خشک لب پھیکی نظر مدقوق چہرے زرد گال	وہ دھنسی آنکھیں فردو رنگ گرد آلود بال
پپڑیاں ہونٹوں پہ زخموں کے کناروں کی طرح	گرم ہاتھوں پر عرق مدھم ستاروں کی طرح
بوجھ مرہونِ منت ان کے ابرو کا تنا	ان کا حاکم ظلم ان کا پاسباں بیجا دبا

ان کے ساتھی پھاوڑے ان کی سہیلی ہے کدال | زندگی پر یہ وبال اور زندگی ان پر وبال
لیکن ان کی پستیوں کو اپنی رفعت سے نہ دیکھ | ان کی غربت پر نہ جا ان کو حقارت سے نہ دیکھ

سردار نے عورت سے متعلق جن نظریات کو پیش کیا ہے وہ حقائق پر مبنی ہیں۔ شاعر نے ان اشعار کے ذریعہ اس کی بے چارگی اور زبوں حالی تک محدود مخلوق کو انسان کی حیثیت سے متعارف کیا ہے۔ بالخصوص ہندو خواتین پر ہونے والی زیادتیوں کی طرف اشارے ملتے ہیں۔

اپنی نظروں سے یہ لکھ سکتی ہیں تاریخوں کے باب | ان کے تیور دیکھتی رہتی ہے چشمِ انقلاب
ٹھوکروں پر ان کی جھک سکتے ہیں ایوان وقصور | توڑ دیتی ہیں ہتھوڑوں سے چٹانوں کا غرور
ان کی چوٹوں پر نکلتے ہیں پہاڑوں سے شرار | وہ اگر چاہیں الٹ ڈالیں بساط روزگار
بن کے قوت ایک دن ابھرے گی برسوں کی تھکن | دیکھ لینا یہ بدل دیں گی نظام انجمن

ان اشعار میں عورت کی بہادری کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔ وہ صنفِ نازک ہونے کے باوجود تاریخوں میں اپنا لوہا منوا سکتی ہے۔ جیسے مہ لقا بائی چندا، حبہ خاتون، رضیہ سلطانہ ہو یا جھانسی کی رانی ان کی خدمات تاریخ میں موجود ہے۔ چاہے جنگ ہو یا میدانِ کربلا ہر جگہ عورت مرد کے شانہ بہ شانہ ثابت قدم رہی ہے۔ اسی لیے شاعر نے لکھا ہے ٹھوکروں پر اس کی جھک سکتے ہیں ایوان وقصور۔ اگر صحیح رہنمائی ہوتی تو وہ قوتِ ارادی سے چٹانوں کا سینا چیرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ نظم سرمایہ دار لڑکیاں میں خواتین کی صفات، اخلاق، عادت واطوار اور نفسیات کی پوری عکاسی کی ہے۔

شہر کے رنگیں شبستانوں کی تنویریں ہیں یہ | نوجوانی کے حسین خوابوں کی تعبیریں ہیں یہ
ہے انھیں کے دم سے مصنوعی تمدن کی بہار | ہیں یہی تہذیب کے آذر کدے کی شاہکار
دیدہی ان کی بہشتِ کیف وفردوسِ نشاط | خوش رخ وخوش پیرہن خوش پیکر وخوش اختلاط

ان کی شاعری میں نسائی جذبات بہت ہی شدت کے ساتھ فطری انداز میں ابھرتے ہیں۔ جس سے عملی زندگی میں بھی عورت کے فطری تقاضوں کے زیر اثر لذت سے بھرپور اسلوب کے باوجود بالواسطہ اور ایمائی اظہار کے ڈکشن سے خالی نہیں ہے۔ ان کے یہاں جوانی کے حسین تعبیریں اور بہشت کیف وفردوسِ نشاط کی خوشیوں بھرے پیکر کو بہ کو ملتے ہیں۔

محفلوں کی شادمانی رقص گاہوں کا سرور　　دل کے کاشانوں کی آبادی طرب گاہوں کا نور
اک لطافت اک نزاکت نطق گوہر بار کی　　اک شعاعِ نورِ شاعر کے تجلی زار کی

سردار جعفری نے عورت کی بہادری، زیبائش اور اس کی جسمانی خوبصورتی کے علاوہ نسائی احساسات کی عکاسی کی ہے۔ صنفِ نازک کی دلآویزی اور گفتگو کے خاص انداز کو ایک موتی کی لڑی میں پرویا ہے۔ نیز نسوانی انگ، نوجوانی کی زیبائش اور حسن واداؤں کو بڑی خوبصورتی سے صفحۂ قرطاس پر اس طرح بکھیرا ہے:

اک مغنی کے نفس کا نغمۂ کیف و بہار　　اک مصور کے قلم کی جنبش بے اختیار
بزم آرائی کی خو ذوقِ کم آمیزی کے ساتھ　　جنبشِ مژگاں بھی اک شانِ دلآویزی کے ساتھ
گردنوں کا خم، کمر کا لوچ، سینے کا ابھار　　صندلی ہاتھوں سے بت خانوں کی صحنیں آشکار
قہقہے سوئے ہوئے جذب جگانے کے لیے　　گفتگو ہر سننے والوں کو لبھانے کے لیے
بیقرار آنکھیں دلوں کو دعوتیں دیتی ہوئی　　نوجوانی بار بار انگڑائیاں لیتی ہوئی

یہاں عورت کی فطرت اور سادگی ہر شعر میں مخصوص انداز میں ہے۔ جو نہ صرف نسائیت اور اس کے احساسات کی بہترین عکاسی ہے۔ بلکہ جنسی تلذذ پیدا کرنے والے الفاظ کو بڑی باریک بینی سے پیش کیا ہے جس سے عشق کا ذوق اور مردوں کے نسائی جذبات دونوں میں ایک طرح کا میل نظر آتا ہے۔ اس سے شاعر کی دور اندیشی اور جاذبیت وحسن کا اعلیٰ نمونہ نظر آتا ہے:

ولولے ہر ہر نفس زیر و زبر ہوتے ہوئے　　دم بدم جھونکے ہوا کے تیز تر ہوتے ہوئے
سامنے اک بار آ جانا ٹھٹکنے کے لیے　　نوجوانوں سے الجھ پڑتا جھجکنے کے لیے
اہرمن تو اہرمن ہو جائے یزداں بھی شکار　　ان کا ہر انداز تاجر ہر ادا سرمایہ دار
عشق کے ذوق نظارہ نے نکھارا ہے انھیں　　مرد کی صدیوں کی محنت نے سنوارا ہے انھیں
ڈوب تو سکتی ہیں یہ لیکن ابھر سکتی نہیں　　یہ کنار و بوس کی حد سے گزر سکتی نہیں ۴

سردار جعفری کی نظم نئی دنیا کو سلام میں جاوید اپنی شریک حیات مریم سے کہتا ہے تیری ہم عمر کتنی ہی ائیں کوئلے اور لوہے کی کانوں میں اپنی شکستہ جوانی سے لپٹی ہوئی رو رہی ہیں ان کے بچوں کی معصومیت چھن چکی ہے۵۔ یہاں عورت حسن کا پیکر و معشوق کی حیثیت سے نمودار ہوتی ہے اور ایک بچہ بھی پال رہی ہے جو نئ دنیا کے نئے آدرشوں کی علامت ہے جو استعارہ ہے۔ اس ضمن میں سردار نے لکھا ہے ''یہ نظم واقعات سے پیدا

ہونے والے جذبات، تاثرات اور احساسات پیش کیے ہیں۔ جاوید اور مریم (میاں بیوی) جدو جہد کی علامتیں اور فرنگی ظلم کی علامت ہے۔ خاص اس مریم کے پیٹ میں جو بچہ پیدا ابھی نہیں ہوا۔ اس میں کے ساتھ بچے کے وجود کو علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ روشن ہونے کے باوجود اندھیروں میں بھٹک رہی ہیں''۔ یہ چند اشعار نمونے کے طور پر ہیں:

سیاہ زلفوں سے لپٹے ہوئے ہیں مار سیاہ
سیاہ چمن ہیں سیہ پھول مسکرائے ہوئے

سیاہ دوپٹوں کے آنچل سیہ جبینوں
سیہ لباس سیہ جسم کو چھپائے ہوئے

نشاں سیاہ لبوں پر سیاہ بوسوں کے
سیہ نشاط کی بدمستیاں چرائے ہوئے

سیاہ دودھ ہے ماں کے سیاہ سینے میں
سیا بچوں کو آغوش میں سلائے ہوئے

روایتی معشوق جبیں، زہرہ جبیں ہو یا خورشید جبیں کو خوبصورت یا پاکیزہ علامت مانا جاتا ہے۔ ان صفات کے باوجود عورت مفلسی اور بے چارگی سے شخصی اہمیت سے محروم ہو چکی ہے۔ ان متضاد صفات پر سردار نے عورت کے سنگار میں ملبوسات، ستر پوشی، عصمت و عفت کی حفاظت اور داغ دار پیشانی کو چھپائے ہوئے ماتم کنایوں کو سیاہ رنگ کو علامت کے طور پر عورت کو استعارہ بنا کر پیش کیا ہے۔ ظلمت کی انتہا یہ کو ماں کا دودھ جو نوازئیدہ بچے کے لیے سرچشمہ حیات کو بھی سیاہ کہا ہے۔ دودھ کا مخرج پستانِ مادر بھی اپنی فطری صفات سے محروم ہو چکا ہے۔ یعنی جب ماں کا سینہ ہی صحت مند نہیں اور نہ اس سے نکلنے والا دودھ صحت بخش ہے۔ جو بچے کی اچھی صحت کا ضامن نہیں ہو سکتا ہے۔ لہذا بچہ بیمار ہو جائے گا۔ بچے کی سیاہی بیماری کی علامت ہے۔ اس حالت میں ماں اور بچہ دونوں سیاہ ہو چکے ہیں۔ اس ڈرامائی نظم کی وضاحت ڈاکٹر مظہر مہدی اس طرح کرتے ہیں جبر کی سیاہی نے معصوم خواتین کی پارسائی اور پاک دامنی کو داغ دار، سیاہ کر دیا ہے۔ اس آبروریزی کے خلاف اٹھنے والی آوازیں مزاحمتی ہیں۔ چوں کہ سیا رنگ ماتم و احتجاج کی علامت بھی ہے۔ ان آوازوں کو سردار نے سیاہ چیخیں کہا ہے[6]۔ نسائی کرب کو سیاہی سے جوڑا تو کبھی عورت کی پاک دامنی کو آنچل کو کفن بننے کے احساسات کو اس شعر میں بطور خاص ہے:

سرے آنچل جو ڈھلکا ہوا تھا
مرے خون میں ساز بج رہا تھا

مریم مردوں کے قدم سے قدم ملا کر چلنے کی کوشش کرتی نظر آتی ہے۔اس کے آنچل کو پرچم کی شکل میں پیش کیا ہے۔مرد وعورت کے عشقی جذبات اور انگریز حکمرانوں کے جبر واستحصال کے خلاف مریم جنگ کا اعلان کرتی نظر آتی ہے۔ پہلے جاوید اور مریم کی شادی کا ذکر ہے:

نہاں ابر میں چاند کب تک رہے گا	بھلا عشق سے حسن کب تک چھپے گا
تو شرماتی جاتی ہے میری نظر سے	حجاب اور گل کو نسیم سحر سے
گذاریں جاراتیں تری آرزو میں	سمٹ آئی ہیں کاکل مشک وبو میں
جو پلکیں حیا سے جھکی جارہی ہیں	وہ کچھ اور دل میں چبھی جارہی ہیں
ترے رخ پہ حسن ومحبت کا ہالہ	یہی ہے مری زندگی کا اجالا
محبت کی راتوں کی قندیل تو ہے	جوانی کے خوابوں کی تکمیل تو ہے
مرادوں کی مانگی ہوئی رات ہے یہ	کہ بچھڑے ہوں کی ملاقات ہے یہ

اس نظم کی دوسری تصویر میں مرد کی زیادتی سے تنگ آ کر مریم حالات سے پریشان نظر آتی ہے۔مریم پھٹے کپڑوں میں ہونے والے بچے کے لیے کرتا سیتی ہے۔ ہر رنگ کے پیوند کاری سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ مفلسی سماج کے حقائق کا علامتی اظہار ہے:

اگرچہ جہان آب وگل بہت حسین ہے	مگر غموں سے چور چور شیشۂ زمین ہے

اس نظم کی کہانی جب نیا موڑ اختیار کرتی ہے۔جاوید کو ظلم و جبر کے خلاف بغاوت کرنے سے پاداش میں سزائے موت کا حکم سنایا جاتا ہے۔اس وقت مریم اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔رحم مادر میں پلنے والا یہی بچہ شاعر کی آرزوں، تمناؤں کا محور ہے۔یہی استعارہ ہے۔اس نظم کی ہیروئین مریم زندگی کے موڑ پر شوہر کا ساتھ دیتی ہے۔اور وہ ہمت کے ساتھ تمام مسائل کا مقابلہ بھی کرتی ہے۔یہ دبی کچلی اور کمزور مخلوق نہیں ہے۔ بقول خود سردار جعفری جب تک عورت کو معاشی آزادی نہیں ملے گی اور وسیع سماجی آزادی میں اپنا حصہ حاصل نہیں کرے گی، تب تک عشق اور حسن دونوں بیمار رہیں گے۔یہی عورت نئی دنیا کو سلام میں نئی نسل کی پرورش کرتی نظر آتی ہے۔نئی دنیا کو سلام میں عورت کی حقیقی عشق ورومان، رنج والم کے علاوہ اس کی بے بسی و تنہائیاں اور اولاد کی پرورش وخوابوں کی تکمیل کرتی ہوئی عورت کی عکاسی ہے۔ایک اور جگہ خواتین کی نفسیات

کے علاوہ عادت واطوار پر خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔ جس سے ہندوستانی خواتین کی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے:

اے امیر نہ بدخشاں کی طرف رخ کرنا — بیلیں انگوروں کی زنجیر لئے بیٹھی ہیں
مرد شمشیر بکف تیری پذیرائی کو — عورتیں جذبہ تحقیر لئے بیٹھی ہیں

سردار نے یہاں عورت کی نفسیاتی پہلوں کو حقیقت کی روشنی میں دیکھا ہے اسی لیے وہ جہاں محبوب کی باتیں کرتے ہیں وہیں ماں اور بیٹیوں کو بھی اپنی شاعری کا مرکز بناتے ہیں۔ جس کی مثال مشرق ومغرب میں دیکھی جاسکتی ہے:

ہیر مغموم ہے پنجاب کے میدانوں میں — جولیٹ روتی ہے انگلینڈ کے افسانوں میں
تیرے بازار میں یوسف بھی زلیخائیں بھی — تیرے دیرانوں میں مجنوں بھی ہیں لیلائیں بھی
گیسو کالے ہیں مرے دیس کے محبوبوں کے — اور بادل ہیں سنہری ترے معشوقوں کے
آنکھیں نیلی ہیں تری شوخ حسیناں کی — جھیلیں کا جل کی مرے آئینہ سیماں کی
اصلیت نکہتِ گل کی نہیں گلدانوں سے — مے بدلتی نہیں بدلے ہوئے پیمانوں سے

سردار جعفری کا افسانہ منزل میں انگریزوں سے نفرت وطن کی آزادی کی امنگ، طبقاتی سماج کو بدلنے کی خواہش، نسائی جذبات و بغاوت عداوت۔۔۔ جس سماج میں خواتین کی مجبوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھایا جارہا ہو، جہاں زبان اور ذہن پر تالے پڑے ہوں، اس کا بہترین نمونہ منزل ہے۔ اس میں ایک ایسی لڑکی کو اپنے افسانے کا مرکزی کردار بنایا ہے۔ جس کی عمر پندرہ سولہ سال ہے۔ وہ انقلابیوں کے ساتھ ہے۔ جو انگریزوں سے انتہائی شدید نفرت کرتی ہے۔ وہ دلیر اور حوصلہ مند، ثابت قدم ہے۔ خود اعتمادی کا جذبہ بھی رکھتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اس کا شوہر اشفاق کمزور نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی بیوی اس کے سامنے جیل جاتی ہے۔ وہ بے دست و پایہ منظر دیکھتا ہے۔ ان کی شادی خاندانی رسوم کے مطابق ہوئی ہے۔ فاطمہ کا گھرانہ خود بھی انگریزوں کا منظور نظر تھا۔ اسی باعث اسے الجھن رہتی تھی۔ لیکن مشرقی شرم وحیا اور سعادت مندی نے اسے بغاوت سے روکے رکھا...... اتفاقاً شادی بھی ایسے شخص سے ہوتی ہے جو انگریزی فوج میں افسر وحکم کا غلام ہے۔ اسی لئے وہ بہت دنوں تک شوہر کو برداشت نہ کرسکی۔ نیز وہ ایک دن ملک کی آزادی کی خاطر جیل چلی گئی۔

سردار جعفری نے اپنی آپ بیتی میں جاگیردارانہ نظام سے متعلق لکھا ہے میری یاد میں اس کی انتہائی بھیانک تصویریں محفوظ ہیں۔ گرمیوں کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں جھکے ہوئے کسان جن کی پیٹھوں پر اینٹیں لدی ہوئی ہیں، ان کے جوتے مارے جارہے ہیں اور وہ دہائیاں دے رہے ہیں، پیڑ کی شاخوں میں بالوں سے لٹکی ہوئی عورتیں، پتلی پتلی سوکھی ہوئی ٹانگوں اور باہر نکلے ہوئے پیٹوں کے بچے۔ بڑی بڑی سیاہ مگر بجھی ہوئی آنکھیں، ایک بار میرے سامنے ایک کسان عورت ننگی کردی گئی۔ یہ اور اس قسم کی بے شمار تصویریں ہیں جو اگر کوئی مصوری پردے پر بنادے تو دنیا چیخ اٹھے۔ بشیر احمد انصاری نے لکھا ہے سردار جعفری خواتین کا بہت احترام کرتے تھے۔ کسی بھی مجلس میں خواہ نجی ہو، دوستوں کی ہو یا ہم خیال رفیقوں کی، کبھی خواتین کے بارے میں ریمارک پاس نہیں کرتے تھے۔ کسی کی داستانِ عشق کو چھیڑا بھی جائے تو وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے تھے کہ اس میں پردہ نشینوں کے نام آتے ہیں۔ انھوں نے بمبئی کی ورکنگ گرلز کے مسائل پر ایک فلم بنائی تھی گیارہ ہزار لڑکیاں اس میں خاص کر اس نغمہ کو شامل کیا تھا:

اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے روشنی لے کے اندھیرے سے نکلنا ہے تجھے[9]

علی سردار جعفری کی تحریریں بنیادی طور پر صنفی مساوات کی غمازی کرتی ہیں۔ ترقی پسند نقاد ہونے کی وجہ سے ان کی نسائی فکر مغربی تانیثیت کی عکاسی کرتی ہے۔ مغربی طرز پر ہندوستانی خواتین کو بھی مابعد جدید تقاضوں کو پورا کرتی دیکھنا پسند فرمایا۔ انہوں نے پدرانہ سماج کو اپنی تخلیقات ہو یا تنقید ہر جگہ نسائی فکر غیر شعوری طور پر پیش کیا ہے۔ افسانے ہوں یا شاعری ہر صنف میں عورت کے مسائل پر زور دیا ہے۔ بالخصوص دیہی خواتین کے کرب، پسماندگی، تعلیمی کمی اور تشدد کی شکار ہونے کی اہم وجوہات ان کی تحریروں میں جا بجا ملتی ہیں۔ اگر ہم مختصر الفاظ میں یہ کہیں تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت سے نہ صرف عالمِ انسانیت کو مذہبی اختلافات سے پاک کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ وہ خواتین کی آگہی، حسن جمالیات، سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی یہاں تک کہ نفسیاتی طور پر خواتین کو خواہ صنفی اعتبار سے ہو یا فرد کے لحاظ سے مکمل آزادی دینے کے قائل تھے۔ سردار جعفری کی تحریروں سے خواتین کو حوصلے اور اعتماد سے آگے بڑھنے کا ولولہ پیدا ہوا۔ سردار جعفری کی تمام تحریروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نسائی جذبات میں خلوص، ایثار، مروت، محبت اور شگفتگی کا عنصر ہمیشہ غالب رہتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ کلیاتِ علی سردار جعفری، (شاعری) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، جولائی، ستمبر 2004، ص120 جلد اول

۲۔ علی سردار جعفری، آپ بیتی، گوشہ جعفری، کتاب نما، نئی دہلی، ص59

۳۔ سردار جعفری شخصیت اور فن، شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 2002، ص 26 اور 28

۴۔ کلیاتِ علی سردار جعفری، (شاعری)، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، جولائی، ستمبر 2004، ص58۔

۵۔ سردار جعفری شخصیت اور فن، شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 2002، ص56

۶۔ ایضاً

۷۔ علی سردار جعفری شخص، شاعر اور ادیب، حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، پونے، 2002، ص474 تا476

۸۔ علی سردار جعفری (شخص، شاعر اور ادیب (، حاجی غلام اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، پونے، 2002، ایضاً ص87

ڈاکٹر جاں نثار معین شعبہ تعلیم نسواں' مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے ریسرچ اسکالر ہیں۔ اردو میں بھی ایم اے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ایم فل ''ادارہ ادبیات اردو کی مطبوعات کی وضاحتی کتابیات'' اور پی ایچ ڈی ''آزادی کے بعد دہلی میں اردو ناول نگاری: بدلتے فکری وفنی رجحانات کا مطالعہ'' کے موضوع پر کیا۔

علی سردار جعفری بحیثیت شاعر، نقاد و صحافی

ڈاکٹر محمد عبدالرؤف

علی سردار جعفری عہد آفریں شاعر، ذی فہم ادیب، بالغ النظر نقاد، اعلیٰ درجے کے نثر نگار، ماہر اقبالیات بے باک صحافی، سیاست داں اور ایک عظیم جینئس تھے۔ سردار جعفری نے پندرہ سولہ برس کی عمر یعنی 1929ء سے ہی مرثیہ کہنا شروع کیا۔ پہلے مرثیہ کا پہلا بند دیکھئے اور ان کے بلند پایہ کا اندازہ کیجئے۔ مرثیہ کے اشعار ملاحظہ کیجئے۔

آتا ہے کون شمع امامت لئے ہوئے
ہاتھوں میں جام سرخ شہادت لیے ہوئے

لب پر دعائے بخشش امت لیے ہوئے
پھیلی ہے بو فضاء میں شہہ مشرقین کی
آتی ہے کربلا میں سواری حسینؓ کی

غزل کا پہلا شعر:

دامن جھٹک کے منزل غم سے گذر گیا
اٹھ اٹھ کے دیکھتی رہی گردِ سفر مجھے

پہلی نظم کا ایک بند:

نکال دوں تمہیں اس طرح دل کے گوشے سے
کہ جیسے کھلتا ہوا پھول توڑ لے کوئی
مری حسین ثریا یہ ہو نہیں سکتا

ان کے دس شعری مجموعے شائع ہوئے ۔ پرواز (1944ء)' جمہور (1946)' نئی دنیا کو سلام (1947)' خون کی لکیر (1949)' امن کا ستارہ (1950)' ایشیا جاگ اٹھا (1950)' پتھر کی دیوار (1953) ایک خواب اور (1965)' پیراہن شرر (1966ء)' لہو پکارتا ہے (1978)۔

شاعری

ابتداء میں وہ آزاد نظم کے شدید مخالف رہے لیکن 1947ء کے آس پاس انہوں نے اپنے تصور میں تبدیلی پیدا کی اور ''نئی دنیا کو سلام'' آزاد ہیئت میں لکھی ۔انہوں نے آزاد نظم کو بھی عوامی جدو جہد کے لیے استعمال کیا۔

شعری مجموعوں ''پرواز''، ''خون کی لکیر''، ''نئی دنیا کو سلام''، ''امن کا ستارہ'' اور ''ایشیاء جاگ اٹھا'' میں ظلم اور سامراجیت کے خلاف سردار جعفری کی نفرت، حقارت، غم وغصہ براہ راست بے باک اور تشدد آمیز ہے ۔مجموعہ ''پتھر کی دیوار'' (1953) سے ان کی شاعری میں ایک خوبصورت موڑ نظر آتا ہے ۔سیاسی اور ملکی حالات بدل چکے تھے ۔سابقہ شعری مجموعوں کی بہ نسبت اس مجموعہ میں اشتراکی نظریہ کی تبلیغ' مارکسزم اور سرخ پرچم کا ذکر بھی قدرے کم ہے ۔آزادی سے قبل سردار جعفری کے یہاں جس طرح کا انقلابی اور اشتراکی نظریہ کار فرما تھا' اگر چہ اب بھی ہے مگر پیشکش کی سطح پر کسی قدر تبدیلی ضرور پائی جانے لگی تھی'' پتھر کی دیوار'' میں شامل نظموں میں انقلابی اور باغیانہ عناصر قدرے کم ہیں ۔اس کے بعد کے مجموعوں میں سردار جعفری کی یہ سنبھلی ہوئی کیفیت نمایاں ہونے لگتی ہے۔ مجموعہ ''ایک خواب اور'' (1965) کی بعض نظمیں پہلے دور کی نظموں کے مقابلے میں زیادہ گہرے شعور اور فکری پختگی کا پتہ دیتی ہیں ۔یہاں تک آتے آتے سردار کی شاعری کا آہنگ اور لہجہ زیادہ غنائی ہو گیا ہے ۔نظموں کا انداز بھی شیریں' نرم اور مدھم لب ولہجہ سے عبارت ہے ۔ اس مجموعے کی نظموں میں برمحل تشبیہوں' استعاروں' علامتوں' مناسب ترکیبوں' محاکات کا استعمال اور الفاظ کی بندش سے جو شیرینی' حلاوت' نغمگی' موزونیت اور موسیقیت پیدا کی ہے وہ بے حد دلچسپ ہے۔ پیشکش کا انداز بھی دلفریب' حسین اور دلکش ہے۔

مجموعہ ''پیراہن شرر'' (1966) کا زیادہ تر کلام اگر چہ سیاسی ہے لیکن اس کا انداز بے حد نرم اور معتدل ہے ۔وہ شاعر جو کبھی قلم سے تلوار کا کام لیا کرتا تھا' اسی قلم کو شاخ گل بناتا نظر آتا ہے ۔''ایک خواب اور''

پیراہن شرر'' اور ''لہو پکارتا ہے'' میں خوشگوار تبدیلی آئی۔ موضوعات کی سطح پر اب بھی وہ اپنے سابقہ موقف پر قائم ہیں لیکن پیشکش یا فن میں تبدیلی کے عناصر کو دیکھا جا سکتا ہے۔ مجموعہ ''لہو پکارتا ہے'' (1978) کے بعد سردار جعفری کے شعری سفر میں متعدد اسباب کے باعث کمی واقع ہوئی ان میں ان کے آٹھ دس افراد خاندان کی معاشی ضرورتوں کیلئے تگ ودو' بیماریاں جیسے Prostrate' دل کا دورہ' پیشاب رک جانے کی شکایت' آنکھوں کا آپریشن وغیرہ شامل ہیں۔ سردار جعفری نے ساری دنیا کے غم کو اپنے سینے میں جگہ دی۔ انہوں نے معصوم' بھولے بھالے انسانوں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی۔ ان کے ہر زخم کو گویائی عطاء کی۔ سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ' استحصالی سرگرمیاں' دولت مند ملکوں کی جنگی تیاریاں جنگ واسلحہ سازی' قوموں کے تصادم ومحاذ آرائی کو ناپسند کیا۔ غلامی ومحکومی کی ہر جگہ مذمت ومخالفت کی۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی انسان کی آزادی ومساوات کے حصول کی کوششیں ہو رہی تھیں' ان کی تعریف وتوصیف کی۔ انہوں نے اپنے ملک اور بین الاقوامی سطح پر ابھرنے والے انسانیت کش واقعات کا واضح ذکر کیا ہے۔ سردار جعفری نے مشرق ومغرب میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا مقصد ہمہ گیر اخوت' بھائی چارگی ہے۔ انسانیت کو وہ تمام تہذیبوں کا نچوڑ سمجھتے ہیں۔

نظم: ''مشرق ومغرب'' کے دو اشعار دیکھئے:

اصلیتِ نکہت گل کی نہیں گلدانوں سے
مے بدلتی نہیں بدلے ہوئے پیمانوں سے
بوئے گل ایک سی ہے بوئے وفا ایک سی ہے
میرے اور تیرے غزالوں کی ادا ایک سی ہے

سردار جعفری نے ہندوستان اور پاکستان کے عوام کو چاند اور ستاروں سے تشبیہ دی ہے۔ وہ ہندوپاک اور دیگر ممالک کی سرحدوں پر بندوقوں' توپوں اور جنگی مشقوں کی بجائے کھیتوں میں ہریالی' عوام میں خوشحالی اور درختوں پر سیاہی نما قطاریں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے کلام کا بنیادی محور انسان دوستی ہے۔ سردار کے لیے سب سے عظیم چیزیں انسان اور انسانیت ہیں۔ وہ اسی کے نغمہ خواں ہیں' وہ اسی کی زندگی کی بات کرتے ہیں جو محرومیوں کا شکار عام انسان ہے۔

وہ جانتے ہیں کہ یہ زندگی اس وقت تک حسین کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی جب تک عام انسان کو مظلومی اور جبر سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ ان کی وہ نظمیں جن میں براہ راست اس موضوع کا ذکر نہیں ہے ان میں بھی استعارات اور علامتیں اسی انسانیت' محبت' صلح جوئی کی خواہش کی طرف اشارہ ہیں۔ سردار جعفری کا سب سے بڑا دکھ انسان کا مصائب وآلام کا شکار ہونا ہے جس کا سبب سماجی اور معاشی نابرابری' ناانصافی اور ہوس ہے۔ ان کے ہاں انسان دوستی ہر طرح کی لسانی' مذہبی اور تہذیبی تفریق سے بلند ہے۔ انسان دوستی نسلوں اور رنگوں کے فرق سے بھی نہیں واقف ہے۔ وہ تو صرف درد کو پہچانتی ہے۔ سردار جعفری نے ہندوستان کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔ حب الوطنی ان کا شعار ہے لیکن یہ وطن دوستی ان کی عالمی اُخوت کی راہ میں حائل نہیں بلکہ اس کو تقویت پہچاتی ہے۔ وہ صرف ہندوستانیوں کی' بہبودی کے خواہاں نہیں مجموعی طور پر کل انسانیت کے مسرت بخش مستقبل کے متلاشی ہیں۔ خواہ رنگ' نسل' مذہب' زبان اور علاقے کے امتیازات کیسے ہی کیوں نہ ہو' سردار جعفری نے اپنی ساری عمر اپنے قلم سے امن عالم اور انسانیت کی آفاتی اقدار کیلئے مخالفین سے جنگ کی ہے۔ وہ انسان دوستی' روشن خیالی' امن ومحبت' رواداری اور زندگی کے خوبصورت تصور کی مصوری کرتے رہے۔ ہندوپاک میں محبت' بھائی چارگی' بہتر تعلقات کے لیے سردار جعفری نے عملی کام بھی کیا ہے اور نظمیں صبح فردا' کون دشمن ہے' گفتگو بند نہ ہو وغیرہ لکھیں۔

سردار جعفری نے ایشیاء کی آزادی' امن عالم' دوسری جنگ عظیم' ویت نام جنگ میں ظلم و بربریت' فاشزم' تعصب' فرقہ پرستی اور دنیا کے چنگیزوں' ہٹلروں اور سرمایہ داروں کے خلاف کھل کر اور بڑھ چڑھ کر لکھا۔ سردار جعفری ملکی مسائل' تہذیبی روایات' مشترکہ تہذیب' مذہبی رواداری' بھائی چارے اور صلح وآشتی کو پیش کرتے رہے۔ انہوں نے ہندوستان کے نوجوانوں' کسانوں' مزدوروں کو للکارا اور غلامی کی زنجیر توڑ دینے کی دعوت دی۔ انہوں نے ملک کے عوام وخواص کے جذبہ حب الوطنی کو ابھارنے کی کوشش کی۔ انہیں سماج و معاشرے میں بڑھتے ہوئے تعصب' نفرت' بھوک' مفلسی کا شدید احساس رہا ہے۔

سردار جعفری بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ بالخصوص آزاد نظموں میں ان کے جوہر خوب نمودار ہوئے۔ ان کی شعری تربیت مرثیہ نگاری کے ماحول میں ہوئی۔ پندرہ سال کی عمر میں مرثیہ کہنا شروع کیا۔ ان کے مرثیوں میں بہاریہ مضامین' خوب صورت پیکر' تشبیہات' استعارات کا حسن' آمد میں جوش وخروش' جلال و

جمال کی کیفیات، تلمیح اور علامات کا برمحل استعمال ملتا ہے۔ سردار جعفری نے ایک سیاسی مثنوی ''جمہور'' بھی لکھی جس میں انگریزی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی ترغیب، انقلابی آہنگ، بغاوت کا رنگ غالب ہے۔

سردار جعفری نے قطعات لکھے۔ ان میں رومان، انقلاب اور ان دونوں کا حسین امتزاج بھی ملتا ہے۔

سردار جعفری نے غزلیں بھی کہیں۔ ان میں بھی وہی موضوعات ہیں جو ان کی نظموں میں ملتے ہیں۔

آفریقہ اور ایشیاء کے عوام کی بے بسی کا ذکر ملاحظہ کیجئے:

یہ بے کس و بیقرار چہرے
صدیوں کے یہ سوگوار چہرے
مٹی میں پڑے دمک رہے ہیں
ہیروں کی طرح ہزار چہرے
لے جا کے انہیں کہاں سجائیں
یہ بھوک کے شکار چہرے
افریقہ و ایشیاء کی زینت
یہ نادر روز گار چہرے

سردار جعفری نے اپنی رومانی شاعری میں محبوب کی تعریف کی۔ اس کی آمد کا خیر مقدم کیا۔

کس قدر شاداب و دلکش ہے وہ حسنِ ناتمام
جس کی فطرت غنچگی، دوشیزگی ہے جس کا نام

(نظم حسن ناتمام)

رومان اور انقلاب کے امتزاج والی نظموں میں پیرایہ بیان حسین و لطیف ہے۔ ان میں رومان بھی ہے، انقلاب بھی ہے، بغاوت بھی ہے، طنز بھی ہے۔ ان تمام چیزوں کو سردار جعفری نے متوازن انداز میں پیش کیا۔

''سرمایہ دار لڑکیاں'' کے اشعار دیکھئے:

شہر کے رنگین شبستانوں کی تنویریں ہیں یہ
نوجوانی کے حسین خوابوں کی تعبیریں ہیں یہ

ہے انہیں کے دم سے مصنوعی تمدن کی بہار

ہیں یہی تہذیب کے آذر کدے کی شاہکار

(نظم سرمایہ دار لڑکیاں)

انقلابی نظموں میں نظم "بغاوت" کے اشعار دیکھئے:

بغاوت دور حاضر کی حکومت سے ریاست سے

بغاوت سامراجی نظم و قانون و سیاست سے

بغاوت سخت پتھر کی طرح بے حس خداؤں سے

بغاوت مفلسی کی عاجزانہ بد دعاؤں سے

بغاوت درد سہنے سے بغاوت دکھ اٹھانے سے

سردار جعفری نے عورت کی تقدیس اور حرمت کا اظہار کیا۔ ان کی نظم "نومبر میرا گہوارہ" دیکھی جا سکتی ہے:

اپنے آنچل میں چھپا لیتی تھی

ننھے سے کھلونے کو

اس چہرے سے بڑھ کر خوبصورت

کوئی چہرہ ہو نہیں سکتا

"نئی دنیا کو سلام" میں مریم ہر قدم پر اپنے شوہر کے ساتھ ہے۔

وہ سماجی حقائق سے آنکھیں ملا کر تمام مسائل کا مقابلہ کرتی ہے۔

سردار جعفری کے یہاں عورت' مرد کی نفسانی خواہشات کی تکمیل کا محض ذریعہ نہیں بلکہ زندگی کے ہر مرحلے اور مقام پر وہ مردوں کی ہم سفر اور شریک کار ہے۔ عیش و نشاط کی گھڑیوں میں وہ بہترین رفیق ہے اور میدان کارزار میں بھی مردوں کی معین و مددگار ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں بیوی کا ذکر جس خوبصورت انداز میں کیا ہے اس کی مثال اس سے قبل اردو شاعری میں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔ ان کا اقرار کتنا دلچسپ ہے۔

ہر عاشق ہے سردار یہاں پر

ہر معشوق سلطانہ ہے

اپنی نظم ''مزدور عورتیں'' میں پورے یقین واعتماد کے ساتھ سردار جعفری کہتے ہیں۔

ٹھوکروں پر ان کی جھک سکتے ہیں ایوان وقصور
توڑ دیتی ہیں ہتھوڑوں سے خیالیوں کے غرور

ان کے خیال میں عورت اور مرد دونوں ایک کل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زندگی کے بڑے سے بڑے مسائل کو باہمی پیار و محبت سے حل کر سکتے ہیں۔

مریم کی زبانی عورت کی عظمت کو وہ سلام کرتے نظر آتے ہیں۔

کبھی جام بن کر جھلکتی ہے عورت
کبھی اشک بن کر چمکتی ہے عورت
وہ بس چند لمحوں کی ہمدم نہیں ہے
کہ عورت فقط شہد و شبنم نہیں ہے
محبت کی مسند پہ حسن و جوانی
شجاعت کے میدان میں جھانسی کی رانی
وہ ہر گام پر مرد کی ہم سفر ہے

سردار جعفری پر اقبال کا گہرا اور اچھا اثر ہوا۔ اقبال کی ترکیبیں' مصرعے' استعارے' سردار جعفری کے کلام میں بکھرے پڑے ہیں۔ اقبال کی طرح سردار جعفری کے یہاں بھی کمزوروں سے ہمدردی اور ظالم وجابر کے خلاف نفرت و بیزاری کے جذبے عام ہیں۔

سردار جعفری نے اقبال کے آہنگ' فلسفہ' حرکت و عمل اور تیزی و تندی سے خوب استفادہ کیا ہے۔ اقبال کی طرح سردار جعفری بھی بدلتے ہوئے سیاسی منظرنامے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اقبال کی طرح وہ دور حاضر کے تغیرات سے آنے والے دور کی تصویر دیکھ لینے پر قادر ہیں۔ لہجے' فکر' موضوع' اسلوب' الفاظ کی نشست و برخاست اور آہنگ کے اعتماد سے سردار جعفری کی نظموں اور غزلوں کے متعدد اشعار سے اقبال کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

سردار کی نظمیں ''اقبال خدا کے حضور میں''، ''فرشتوں کا گیت'' اور ''فرمان خدا'' میں اُسلوب اقبال سے ماخوذ ہے۔ سردار نے اپنی نظم زندگی میں بتایا کہ زندگی سرگرداں ہے۔ اس نظم میں اقبال کے فلسفہ حرکت و عمل کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

سردار جعفری اپنی نظم ''سر طور'' میں کہتے ہیں:۔

شوق کی حد مگر چاند تک تو نہیں
ہے ابھی رفعت آسماں اور بھی
رنگ اور نور کی وادیاں اور بھی
اور بھی منزلیں اور بھی مشکلیں
ہیں ابھی عشق کے امتحان اور بھی

سردار کے ان اشعار کے بعد اقبال کی وہ غزل یاد آ جاتی ہے جس کا مطلع یوں ہے:۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

سردار جعفری کی طویل نظمیں اپنے رنگ و آہنگ، موضوعات کی اہمیت اور وسعت کے سبب اردو کی طویل نظموں میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ''ایشیاء جاگ اٹھا'' 776 مصرعوں پر مشتمل ہے اور یہ ایشیائی عوام کی طویل جدو جہد کی داستان ہے۔ دیگر طویل نظموں میں ''نئی دنیا کو سلام'' (1840 مصرعے) ''ہندوستان''، ''پتھر کی دیوار'' قابل ذکر ہیں۔

علی سردار جعفری کے اسلوب پر انیس، جوش اور اقبال کے اثرات ہیں۔

1980 کے آتے آتے سردار جعفری پر یہ واضح ہو گیا کہ ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کی انتہا پسندی ادب کیلئے مضر ہے۔ اب وہ جمالیاتی اقدار کی اہمیت کو کھلے طور پر قبول کرنے لگے تھے۔ بیسویں صدی کی اسی کی دہائی تک کچھ ایسے ناخوش گوار واقعات بھی ہوئے جن سے متاثر ہو کر سردار جعفری آزادی سے قبل کے اپنے انقلابی اور باغیانہ لب و لہجہ کو پھر سے اختیار کر سکتے تھے لیکن اب ان پر یہ فلسفہ آشکار ہو گیا تھا کہ شاعری میں ابہام، استعارہ اور علامت بے حد ضروری ہے اور کسی بھی خیال یا واقعہ کو نرم اور مدھم لب و لہجے میں کہنا شاعری

ہے۔اس عہد کی نظموں اور غزلوں میں سردار جعفری نے جلال و جمال دونوں کو کچھ اس طرح برتا ہے جس سے ان کی شاعری مزید نکھر گئی۔سردار جعفری کی شاعری کے اُسلوب میں زورِ بیان، گرمئی کلام، سلاست، روانی زبان و بیان پر قدرت، فن کی باریکیوں پر نظر، خوبصورت الفاظ، دلکش تراکیب، نازک پیکر، حسین استعارے، منظر نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔

سردار جعفری نے آزاد نظم کو خارجی حالات اور ماحول کی تصویر کشی کے لیے استعمال کیا۔ابتداء میں سردار جعفری آزاد نظم کے شدید مخالف رہے لیکن 1947ء کے آس پاس اپنے تصور میں تبدیلی پیدا کی اور طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' آزاد ہیئت میں لکھی۔

سردار جعفری نے آزاد نظم کو داخلیت سے نکال کر عصری مسائل کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔بنجر زمین (Waste Land) کی فضاء سے نکل کر آزاد نظم کو زیادہ مثبت موضوعات کا سہارا ملا۔سردار جعفری نے آزاد نظم میں وسعت پیدا کی۔انہوں نے کوشش کی کہ ہر موضوع پر اس صنف میں اظہار خیال کیا جائے لیکن سچ یہ ہے کہ ہر موضوع کو شعریت کے ساتھ برتنا دشوار ہے اور اس دشواری کو سردار جعفری بھی آسان نہ کر سکے۔نئی دنیا کو سلام میں پابند، آزاد معریٰ، قطعہ بند یہ سب اصنافِ سخن موجود ہیں۔سردار جعفری نے پہلی بار نئی دنیا کو سلام میں آزاد نظم کی صنف کو اپنایا ہے۔

راشد اور میراجی کی آزاد نظمیں رکی تھمی، دھیمی دھیمی، سوچتی ہوئی شاعری کا نمونہ ہیں۔مگر سردار نے آزاد نظم کو مکالموں کے لیے بھی استعمال کیا اور کہانی کے بیان کے لیے بھی۔ان کے حسن خطابت نے اس صنف میں ایک نیا رنگ بھر دیا ہے اور عوامی ذہن و فکر سے قریب تر کر دیا ہے۔سردار جعفری نے عوام کو بیدار کرنے کا جو عزم کیا تھا اس میں وہ کامیاب رہے۔سردار جعفری کو اس بات کا احساس تھا کہ تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں ظلم و استحصال کی نفی کر کے ہندوستانیوں کو بلا تفریق مذہب و ملت متحد کرنا ہے۔

تنقید:

سردار جعفری فطرتاً امید و یقین اور رجائیت پسند تھے۔ان کی شاعری میں رجائیت نمایاں ہے۔عالمی ادب پر سردار جعفری کی گرفت مضبوط تھی۔سیاسیات، عمرانیات، سماجیات اور اقتصادیات میں وہ درک رکھتے تھے۔سردار جعفری نے کہا کہ شاعری کا رشتہ جب تک عوام سے نہیں ہوگا تب تک وہ معیاری نہیں ہوگی۔اچھی

شاعری کے لیے انہوں نے بتایا کہ شاعری اپنے عہد کے مسائل سے بخوبی واقف ہو اپنے عہد کے انسانوں کے دلوں کو سن سکے محسوس کر سکے اور عوام کی زبان میں بات کر سکے۔ دنیا کا بہترین ادب عوامی رہا ہے۔

سماجی زندگی کو سنوارنے کی پوری کوشش کو سردار جعفری نے شاعر کے فرائض میں شامل کیا ہے۔ سردار جعفری کے مطابق غالب آج زندہ اس لیے بھی ہیں کہ وہ ہماری زندگی کے ہر لمحہ میں شریک ہیں۔ غالب کے اشعار ہماری زندگی کی رہنمائی کرتے ہیں۔ دکھوں مایوسی اداسی کی گھڑیوں سے باہر نکلنے میں مدد دیتے ہیں۔ نشاط و مسرت پیدا کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ سردار جعفری کے مطابق منٹو کی عظمت اس میں ہے کہ اس نے سماج کے سامنے اس کی تصویر لا کر کھڑی کر دی۔ سردار جعفری ادب کو اپنے عہد کے تاریخی حالات کی دین قرار دیتے ہیں۔ اچھا ادب وہ ہے جو ملک وقوم اور وسیع تر انسانیت کو بہتر اور خوبصورت مستقبل کی طرف لے جائے۔ سردار جعفری کے دیباچوں مقدموں تبصروں تنقیدی مضامین اور اداریوں سے بھی ان کی قوت تنقید کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قاضی خلیل عباسی کی کتاب ''کیا دن تھے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے سردار جعفری نے انہیں تحریک آزادی کا ایک نڈر اور بے باک حوصلہ مند اور پر جوش سپاہی قرار دیا۔ اس کتاب میں گزرے ہوئے عہد کی شمولیت کو کتاب کی اہمیت میں اضافہ قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے ظلم سے مدافعت کو ضروری قرار دیا ہے۔

سردار جعفری حوصلہ مندی میں ایقان رکھتے ہیں۔ خمار بارہ بنکوی کی شاعری میں زندہ رہنے کا حوصلہ دینے والے اشعار کی نشاندہی کی ہے۔

سردار جعفری نے کہا کہ ہندو مسلم اتحاد ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ہی ہم وسیع تر قومی اتحاد کا تصور کر سکتے ہیں اور حب وطن کے چمن میں مختلف تہذیبوں مختلف مذہبوں کے پھول کھل سکتے ہیں۔ سردار جعفری نے کبیر کی شاعری میں انسانیت یکجہتی ہندو مسلم اتحاد مشترکہ تہذیب کی نشاندہی کی۔ سردار جعفری نے غالب کے ہاں موجود مشترکہ تہذیب کو اُجاگر کرتے ہوئے بتایا کہ غالب انیسویں صدی کی مشترکہ تہذیب کی ایک شاندار علامت تھے غیر معمولی فہم و فراست اور ماورائی دور اندیشی سے بہرہ مند غالب کی نظروں میں ہندو مسلمان عیسائی اور یہودی یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ مثالی انسان کا ان کا تصور ان کی شاعری میں جگہ جگہ عیاں ہے۔ سردار جعفری نے اقبال پر اپنی پہلی رائے اپنی تصنیف ''ترقی پسند ادب'' 1951ء میں دی تھی اس کی

بھرپور تلافی اپنی اگلی تصنیف ''اقبال شناسی'' 1976ء میں کر دی۔ ترقی پسند ادب اور اس سے قبل کی تحریروں میں سردار جعفری کا تنقیدی نقطہ نظر خاصہ محدود اور یک رخہ محسوس ہوتا ہے۔ وہ ادب کو محض مقصدی اور افادی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی بعد کی تصانیف ''پیغمبران سخن'' اور ''اقبال شناسی'' میں ان کے نقطہ نظر میں خاصی وسعت پیدا ہوگئی اور انہوں نے فن پارہ کے تعین قدر کے لیے تنقید کے مختلف دبستانوں سے بیک وقت استفادہ کیا۔ ان کا نظریۂ ادب قدرے معروضی اور ادبی اقدار سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ سردار جعفری نے اقبال کے کلام سے اس بات کی نشاندہی کی کہ اقبال نے تیسری دنیا خاص طور پر اردو، فارسی بولنے والی اقوام کو استعماری طاقتوں کی سازشوں سے خبردار اور بیدار ہونے کا پیغام دیا۔ اقبال مسلم بیداری' ہندوستان کی بیداری' ایشیاء کی بیداری اور عالم انسانیت کی بیداری کے شاعر تھے۔ سردار جعفری نے بتایا کہ اقبال سے ترقی پسندوں نے انسانی ہاتھوں کی عظمت' تصور انسانیت' نظریہ حیات جیسی چیزیں لیں، انہیں استحکام دیا' مقدور بھر آگے بڑھایا۔ سردار جعفری نے تقابلی مطالعے بھی کئے' انہوں نے کہا کہ کبیر کی تعلیمات پر رومی کے تصورات کا بھی عکس دکھائی دیتا ہے۔ میر اور اقبال کے کلام میں مماثلت کی نشاندہی کی۔ سردار جعفری میر' غالب کے بعد اقبال کو سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔ سردار جعفری نے بتایا کہ پاکستانی شعراُ کے لہجے میں ایک غم کی لہر ہے' احتجاج ہے اور ہجرت کا تصور ہے اس کی وجہ وہاں کے حالات ہیں۔ ہمارے ہاں ہندوستان میں ایک نشاط کی لہر ہے' جمہوری مزاج ہے۔ سردار جعفری کی لڑائی' جاگیرداری اور سامراجی ذہنیت کے خلاف ہے اس لئے انہیں اپنی نوا تیز کرنی پڑی۔ سردار جعفری نے بتایا کہ منٹو نے ان کرداروں کی تصویر کشی کی ہے جن سے سرمایہ داری نظام نے ان کی انسانیت چھین لی ہے۔ یہ سب پہلے کبھی انسان تھے یا ان میں انسان بننے کی صلاحیت تھی لیکن اس سماج نے جس کی بنیاد لوٹ کھسوٹ پر ہے' ان سب کو جانور بنا دیا ہے۔ وہ جانور جن کی صورتیں انسانوں کی سی ہیں لیکن پھر بھی انسان نہیں ہیں۔ سردار جعفری نے کبیر (پندرھویں صدی)' میر (اٹھارویں صدی) اور غالب (انیسویں صدی) کی شاعری کو ان کے عہد اور حالات کے پیش نظر دیکھا اور اس کے سیاسی' سماجی اور معاشرتی پہلوؤں کی نشاندہی کی۔ انہوں نے کہا کہ ماضی کے ادیبوں کو ان کے عصری ماحول' پس منظر میں رکھ کر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

شاعری اور ادب میں سردار جعفری کے پیش نظر یہی بات رہی کہ وہ کہاں تک اپنے سماجی مساوات کی ترجمان ہے۔ کہاں تک اس میں زندگی کے مقاصد شامل ہیں اور کہاں تک یہ اپنی زندگی کو آگے بڑھانے میں

مدد دے سکتی ہیں۔ ان مبادیات کی روشنی میں سردار جعفری نے ادبی تخلیقات کا تجزیہ کیا۔

سردار جعفری مارکسسٹ Marxist ہیں۔ وہ کارل مارکس کے نظریہ کو پسند کرتے ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک کے زبردست مبلغوں میں ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین اور تحریروں کے ذریعے ترقی پسند نقطہ نظر کو عام کیا اور ادب کو ان کے ذریعے پرکھنے کی کوشش کی۔ ان کی تنقید میں وہی اصول اور ضابطے ملتے ہیں جو ترقی پسند تحریک یا مارکسی تنقید سے عبارت ہیں۔

کٹر ترقی پسند نقاد ہونے کے باوجود ان کو جمالیات سے عار نہیں تھا۔ انسان اور انسان دوستی کا سبق ان کے تنقیدی رویے میں بھی ملتا ہے۔ اقبال شناسی اور پیغمبران سخن انہیں ایک اعلیٰ تنقیدی منصب پر کھڑا کرتی ہیں۔ میر، غالب، کبیر داس، میر، اقبال اور دیگر شعرا پر ان مضامین سے ان کی قوت استدلال، منطقی توضیحات، استدلالی تجزیئے اور جمالیاتی احساسات کا اظہار ہوتا ہے۔

صحافت:

سردار جعفری نے سبط حسن، مجاز کے ساتھ مل کر ہفت روزہ پرچم اور پھر ماہنامہ نیا ادب لکھنو سے جاری کیا۔ نیا ادب کا پہلا شمارہ اپریل 1939ء میں شائع ہوا۔ جوش نے اپنا رسالہ کلیم بھی اس میں ضم کر دیا۔ نیا ادب کے بعد سجاد ظہیر کے ساتھ سردار جعفری، کمیونسٹ ہفتہ وار اخبار ''قومی جنگ'' میں صحافتی فرائض انجام دینے لگے۔ 1967ء سے سردار جعفری نے اپنی ادارت میں سہ ماہی رسالہ ''گفتگو'' جاری کیا۔ یہ ضخیم رسالہ تھا۔ اس کے جملہ 32 شمارے بے ترتیبی سے شائع ہوئے۔

نیا ادب کے روح رواں سردار جعفری ہی تھے۔ لکھائی چھپائی کا بندوبست، کاغذ کی فراہمی، ادیبوں سے خط و کتابت، آمدنی و خرچ، حساب انہیں کے ذمہ تھا۔ اخبار ''قومی جنگ'' میں بھی کام کیا کرتے جیسے کاغذ کا انتظام، پروف ریڈنگ، اخبار چھپتے وقت پریس میں موجودگی، کمرے کی صفائی۔ سردار اور ان کے ساتھ مضامین لکھتے، کاپیاں جڑواتے، پریس لے جاتے اور سڑکوں پر چیخ چیخ کر اخبار بیچتے۔

نیا ادب میں سماجی، سیاسی، عصری، ادبی و تخلیقی رجحانات ان کے اداریوں میں ہوا کرتے۔ اس رسالہ میں جو مضامین شائع کئے گئے ان میں آزادی، جمہوریت، عالم انسانیت کی فلاح و بہبود، اخوت و مساوات، ظلم کے خاتمے کی باتیں ہوتیں۔ سامراجیوں، سرمایہ داروں اور فاشسٹوں کی سازشوں کو بے نقاب کیا گیا۔ عوامی ادب

کی اہمیت اجاگر کی گئی ۔ترقی پسند نظریات کے فروغ میں رسالہ نیا ادب نے حصہ لیا۔سردار جعفری نے قومی جنگ اخبار میں ادارت کے ساتھ مضامین اور کالم بھی لکھے۔

سہ ماہی رسالہ گفتگو میں مختلف مکاتیب فکر کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شائع کی گئیں اور انہیں متحد کرنے کی کوششیں کی گئیں ۔ یہ رسالہ ترقی پسند نظریات کا علمبردار تھا۔اس کا ادبی مسلک ترقی پسندی‘ صحت منداور باشعور قدروں کی ترجمانی تھا۔سردار جعفری نے بتایا کہ جدیدیت کا ایک صحت مندر جحان بھی ہے جسے انہوں نے ترقی پسندی کی توسیع قرار دیا اور اس میں بہت اچھے لکھنے والے پیدا ہوئے ۔اس رسالہ میں سردار جعفری نے بتایا کہ ادب‘ حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے اور ان کو حل کرتا ہے۔

سردار جعفری نے بتایا کہ محبت‘ روحانی غذا ہے اور ساری کمزوریاں اسی روحانی غذا کے نہ ملنے سے پیدا ہوتی ہیں ۔جنہیں دولت اور ثروت پیاری ہے ان کے لیے ادب کے مندر میں جگہ نہیں ہے۔ جو سچا آرٹسٹ ہے وہ خود پروری کی زندگی کا عاشق نہیں ہوسکتا۔اچھا ادب وہ ہے جو ملک وقوم اور وسیع تر انسانیت کو بہتر اور خوبصورت مستقبل کی طرف لے جائے ۔اس رسالہ میں سردار جعفری نے بتایا کہ ہندوستان پاکستان ایک درخت کی دوشاخیں‘ ایک درخت کے دو پھول‘ ایک خوبصورت چہرے کی دو آنکھیں‘ ایک دریا کی دو موجیں ہیں۔ ہماری باہمی محبت بے شمار تشبیہیں اور استعارے تراش سکتی ہیں ۔ ہمارے دونوں ملکوں کے ادیب اور دانشور محبت کے سفیر ہیں۔ ہماری دلی تمنا ہے کہ پاکستان جائیں اور نفرت کی ان جھوٹی دیواروں کو گرادیں جو سیاست نے کھڑی کر رکھی ہیں ۔اس رسالہ میں سردار جعفری اور دیگر ادباء وشعرا‘ ملکی وبیرونی شعرا کی تخلیقات، سردار جعفری کے تبصرے‘ تنقیدی جائزے‘ سمیناروں‘ ترقی پسند مصنفین کی کانفرنسوں کی روداد یں‘ جدیدیت پر اظہار وغیرہ ملتے ہیں۔

سردار جعفری‘ آل انڈیا ریڈیو میں بطور شاعر‘ مقرر‘ فیچر نگار رہے ۔ٹی وی سیریئل ''کہکشاں'' اور ''آج کل'' لکھے ۔دستاویزی فلموں ''پھر بولواے سنت کبیر'' ''ڈاکٹر محمد اقبال'' ''ہندوستان ہمارا'' دی لٹریری اسٹارم'' فلمی کہانیاں‘ فلمی نغمے اور فلم پروڈیوسر رہے۔ روشنی اور آواز ڈرامہ لال قلعہ‘ شالیمار باغ‘ تین مورتی نواس‘ سابرمتی آشرم لکھے۔انہیں پدم شری‘ گیان پیٹھ‘ ڈی لٹ اور کئی اعزازات سے نوازا گیا۔

انسانیت کا شیدائی ایسا شاعر و ادیب برسہا برس میں پیدا ہوتا ہے۔ اس نے مشرق و مغرب کی تفریق مٹانے' معاشرتی استحصال و عدم مساوات' غلامی ظلم و ناانصافی سے نجات دلانے' عالمی امن کے قیام کے لیے اپنی ادبی' شعری' انقلابی اور تنقیدی خدمات کے ذریعہ ایسے ایسے کام کئے جو شاید ہی کسی اردو شاعر و ادیب کے حصے میں آئے۔ انسانیت کا شیدائی ایسا شاعر ادیب برسہا برس میں پیدا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد عبدالرؤف نے ایم ۔اے اردو' عثمانیہ یونیورسٹی اور ایم ۔فل اردو' یونیورسٹی آف حیدرآباد سے کامیاب کیا۔ علی سردار جعفری بحیثیت شاعر' نقاد اور صحافی کے موضوع پر تحقیق کی اور یونیورسٹی آف حیدرآباد سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

سردار جعفری کی نثری خدمات

حامد اکمل

اشتراکی نظریہ یا ترقی پسند فکر کو وسیع معنوں میں انسانیت پسند مانا جاتا ہے۔ اردو کے ترقی پسند شعراء اور ادباء کے یہاں یہ احساس عام بھی ہے لیکن کمیونسٹ حکومتوں خصوصاً روس اور چین میں مذہب کی مخالفت کے نام پر اور اسی انسانیت پسندی کے نام پر شہری حقوق اور انسانی آزادیوں کو کس طرح پامال کیا گیا، اس کے ثبوت سیاسی تاریخ اور تخلیقی ادب میں بھی موجود ہیں۔ اور کوئی ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں کمیونزم کے زوال نے بھی یہ ثابت کر دیا کہ وہاں کے ارباب اقتدار اس نظریے کی سخت گیری کو عوامی زندگی کے لیے ایک لعنت میں تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ عالمی سامراج کے سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ کس طرح پینگیں بڑھا رہے تھے۔ اس کی بڑی مثال روس کی بجائے چین میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ابھی یہاں کمیونزم کا زوال اقتدار کے خاتمے کی شکل میں نہیں ہوا ہے لیکن سرمایہ دارانہ یا تجارتی شکنجہ روس سے زیادہ ہے۔ چین نے اشتراکی نظام کے پروپیگنڈے کے ساتھ خاموشی سے سرمایہ کاری کو فروغ دیا۔ آج عالمی مارکٹ میں سوئی سے لے کر بھاری مشینوں تک چین کی مصنوعات کی مانگ سب سے زیادہ ہے۔

اردو ادب میں اشتراکیت کے فروغ کے لیے ترقی پسند تحریک کے آغاز اور روس میں کمیونزم کے خاتمہ کے بعد اس تحریک کے خاتمہ تک کی داستان کافی طویل اور دلچسپ ہے۔ نظریاتی پروپیگنڈے اور ترقی پسندی کے فیشن نے اردو ادب کو نقصانات بھی پہنچائے اور فوائد بھی۔ ترقی پسند تحریک نے نئے دور کے بعض بلند قامت شاعر اور افسانہ نگار بھی دیے۔ ترقی پسند شاعروں کے مقابلہ میں جدیدیت کے علمبردار شعرا بھی کم نہیں ہیں۔ لیکن ترقی پسند تحریک نے جو بڑے افسانہ نگار اردو کو دیے ہیں ان کے قد کے افسانہ نگار جدیدیت کے رجحان نے نہیں پیدا کیے۔ گفتگو نظریاتی پروپیگنڈے اور ادب کی ہے۔ ادب کی بنیادی شناخت نہ نظریاتی طور پر قطعیت پاتی ہے اور نہ غیر نظریاتی طور پر۔ اس کی اپنی الگ جہت اور تقاضے ہیں۔ اگر یہ محبت اور تقاضے پورے

ہوں تو ادب، ادب ہے ورنہ بے سود اظہار خیال یا سادہ اطلاع۔ سردار جعفری یقینی طور پر ترقی پسند تحریک کے سب سے بلند قامت علمبردار ہیں۔ قائد ہیں یعنی اسم بامسمّٰی سردار۔ ان کی شاعری کا ایک خاصہ حصہ نظریاتی پروپیگنڈے کی تعریف میں آتا ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے اشتراکیت یا ترقی پسندی سے ہٹ کر جن موضوعات کا سخن گوئی کے لیے انتخاب کیا ہے۔ انھیں ان کی فکری گہرائی اور طرز اسلوب نے فن پارہ بنادیا ہے۔ ان کی غزلوں میں رومان اور کشمکش عصر کے موضوعات کے بھی اچھے شعروں کی تلاش مشکل نہیں ہے۔

جاں نثار اختر اور استعارہ کے زیر عنوان اپنے مضمون میں شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''ترقی پسند شعراء کے ارتقاء کی داستان بیشتر المناک ہے۔ ان کے سامنے کوئی واضح فن کارانہ معیار نہ تھا بلکہ وہ سماجی اور سیاسی تقاضوں کے بیان کو فن کارانہ معیاروں کا بدل سمجھتے تھے۔ لہٰذا ان کی شاعری میں جو تبدیلیاں آئیں وہ اکثر خارجی ضرورتوں کے تحت آئیں۔ فنکارانہ ارتقاء کا حوالہ ان میں نہ تھا۔ شروع شروع میں ترقی پسند شعراء کو سستی رومانی نظمیں لکھنے سے عار نہ تھا۔ مجاز، ساحر، سردار، مخدوم، کیفی، جاں نثار اختر اور خود فیض جوان تمام شعرا کے مقابلے میں جذبات کا بے محابہ اظہار بہت کم کرتے ہیں، کوئی اس عیب سے یکسر خالی نہیں۔ عشق میں انقلاب کی آمیزش ذہنی رویے میں کسی تبدیلی کی بنا پر نہیں بلکہ اس وجہ سے ہوتی کہ خالی خولی عشقیہ شاعری سے کوئی سیاسی کام نہیں لیا جاسکتا۔''

اسی مضمون میں فاروقی آگے لکھتے ہیں کہ:

''یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ ہر زمانے کی شاعری کی طرح ترقی پسند شاعری کا بھی بڑا حصہ بے جان اور شاعری کے دائرے سے خارج ہے اور ہر زمانے کی شاعری کی طرح ترقی پسند شاعری کا بھی ایک منفرد حصہ نہایت خوبصورت اور اچھی شاعری کے زمرے میں داخل ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ترقی پسند شعراء کی اچھی شاعری ان کے نظریے کی وجہ سے نہیں بلکہ نظریے کے باوجود ہے۔ ورنہ نظریاتی حیثیت سے تو اختر حسین رائے پوری کا خیال بالکل درست تھا کہ غزل کا مزاج جاگیردارانہ اور اس کی فکر مائل بہ انحطاط ہے (یعنی ترقی پسند نظریے کی روشنی میں یہی نتیجہ نکلتا ہے) یہ ترقی پسند شعراء کی سلامت طبع تھی جو انھیں کھینچ کھانچ کر کسی طرح غزل کے طرف لے آئی۔ آئے وہ جس راستے سے ہوں لیکن پہنچے ٹھیک جگہ پر، کیونکہ غزل نے ان کی شعری کائنات کو اپنی مخصوص وسعت و وقار سے روشناس کروایا''۔

ترقی پسند شعراء کے ارتقاء کی یہ المناک داستان سردار جعفری کی شاعری پر بھی پوری طرح منطبق ہے۔ غزل کی مخالفت کے باوجود سردار کی پابند نظموں کی لفظیات ان کا محاورہ غزل کی کلاسیکی روایات اور مرثیہ کے مزاج سے مملو ہے۔ میں یہاں سردار کی شاعری اور نظموں کے حوالوں سے گریز کرتا ہوں۔ اصل میں مجھے سردار جعفری کی تنقیدی بصیرت پر اور ان کی نثری کاوشوں پر اظہار خیال کرنا ہے۔ ترقی پسند ادب اور لکھنو کی پانچ راتیں سردار کی ابتدائی نثری کاوشیں ہیں۔ لکھنو کی پانچ راتیں ایک رپورتاژ اور ان کی یادداشتوں پر مشتمل مضامین کا مجموعہ ہے جو ان کی سوانح حیات کا بھی حصہ ہے اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر گذرے ہوئے خوشگوار دنوں کی یادداشت بھی۔ ترقی پسند ادب کے ذیل میں اس ضمن میں سجاد ظہیر کی روشنائی کا بھی نام لیا جاسکتا ہے۔

سردار جعفری کا تخلیقی سفر اشتراکیت کے ساتھ 1943 میں پرواز کی اشاعت سے شروع ہوا تھا۔ اس سے پہلے 1938 میں ان کے افسانوں کا مجموعہ 'منزل' منظر عام پر آیا تھا۔ 1943 میں ان کے ڈراموں کے دو مجموعے 'یہ کس کا خون ہے' اور 'پیار' منظر عام پر آئے۔ اسی سال ان کی طویل تمثیلی نظم 'نئی دنیا کو سلام' شائع ہوئی جس نے ترقی پسند فنکار کی حیثیت سے سردار جعفری کی شخصیت کو مستحکم کیا۔ 1949ء میں ان کی نظموں کا مجموعہ 'خون کی لکیر' اور 1950 میں 'امن کا ستارہ' کے زیر عنوان طویل نظمیں اور 'ایشیا جاگ اٹھا' (طویل نظمیں) شائع ہوئی۔ 1953 میں تنقیدی کتاب ترقی پسند ادب اور نظمیں 'پتھر کی دیوار' شائع ہوئی۔ لکھنؤ کی پانچ راتیں 1962 میں اور ایک خواب اور (نظمیں) 1964 میں منظر عام پر آئیں۔ 1965 میں پیراہنِ شرر (نظمیں) 1970 میں کبیر، میر اور غالب پر ان کے مضامین کا مجموعہ 'پیغمبرانِ سخن' کے زیر عنوان شائع ہوا۔ اقبال شناسی (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) 1977 میں شائع ہوا۔ 1978 میں Chalib and His Poetry (قرۃ العین حیدر کے ساتھ) شائع ہوئی۔ ان کا ایک بڑا علمی کارنامہ 'سرمایہ سخن' ہے۔ اس کے علاوہ دیوان میر، کبیر بانی اور پریم (اردو ہندی) کی ترتیب وتدوین بھی ان کی ایک بڑی ادبی خدمت ہے۔ پیغمبرانِ سخن میں کبیر، میر، غالب کے مطالعے کی یہ خوبی ہے کہ اس میں انھوں نے نظریہ ساز ترقی پسندی کو پوری طرح نظرانداز کردیا ہے۔ اپنے مطالعاتی جائزے میں انھوں نے تمثیلی جمالیات' لسانی اقدار اور انسانی تہذیب کو پیش نظر رکھا ہے۔ انھوں نے ان شعراء کے زمانے کی تاریخ کی بجائے ان کے فکر وشعور کے سفر پر توجہ دی ہے۔ کبیر کی شاعری کے بارے میں وہ یہ کہتے ہیں۔

''حالات وواقعات کا کبیر' سن اور تاریخ کا کبیر زندہ نہیں ہے لیکن فکر وشعور کا کبیر جذبے اور احساس کا کبیر' شعر و نغمے کا کبیر زندہ ہے۔ ہر دوہا اس کی بستی ہے۔ ہر پد (نظم) اس کی ذات اور ہر خیال اس کی زبان ہے اور جب ہم اس کے بولے ہوئے لفظوں کو دہراتے ہیں تو کبیر کا ساز بجنے لگتا ہے۔ شاہی فرمان اور ڈنکے کی آوازیں گونگی ہو جاتی ہیں اور کبیر کے دل سے نکلنے والی صوت سرمدی سے روح سرشار ہو جاتی ہے۔ پنڈت کا منتر اور ملاّ کی اذان آسمانوں کے سناٹے میں گم ہو جاتی اور کبیر کا حرف محبت دھرتی کے سینے میں دھڑکنے لگتا ہے''۔ (پیغمبرانِ سخن ص 14)

میر کے عہد کا جائزہ سردار جعفری نے اس طرح لیا ہے:

''قرونِ وسطیٰ میں انسان دوستی کی سب سے بڑی تحریک تصوف کی شکل میں ابھری۔ بھگتی اور Mysticism اس کی غیر اسلامی شکلیں ہیں۔ ان تحریکوں کا رشتہ دستکاروں کا کسانوں کی بغاوتوں سے بھی رہا ہے لیکن میر کے عہد تک پہنچتے پہنچتے صرف ایک فکری نظام باقی رہ گیا تھا جو جاگیرداری نظام کی قدروں سے مختلف قدریں رکھتا تھا۔ اور ان میں سب سے زیادہ اہم وحدت انسانی کا تصور تھا جو مذہب' ذات پات اور پیشوں کی بنیاد پر تقسیم ہو جانے والے انسانوں کو ایک ہی رشتے میں پرو لیتا ہے...... عشق اور دل دو لفظ ہیں جو اس تصور کا پوری طرح احاطہ کر لیتے ہیں۔ عشق سب سے بڑا جذبہ ہے اور دل سب سے بڑی چیز۔ کعبہ ہو یا مندر اور مسجد یہ اگر ٹوٹ جائیں تو پھر بن سکتے ہیں لیکن دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے۔ حج نماز روزے سے کوئی آدمی نہیں بنتا۔ یہ ظاہری عبادتیں ہیں۔ آدمی دل سے بنتا ہے اور دل پیر و مرشد ہے۔ عشق کا مرکز ہے' خدا ہے۔ عشق اس کائنات کا خالق ہے۔ اس کا رنگ روپ ہے' عشق ہی جلاتا ہے' عشق ہی مارتا ہے۔ اس طرح خدا اور انسان کا براہِ راست رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ صرف انسان سے محبت کر کے خدا تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے آنکھیں بند کر کے مراقب ہونا' بندے کے دردِ دل کو بھول کر خدا رسیدہ بننا بے کار ہے۔''
(پیغمبرانِ سخن ص 98-97)

سردار جعفری جس نظریہ مادیت اشتراکیت کے علمبردار تھے۔ ان شعراء کے تذکرے کے موقع پر اس نظریے کو فراموش کر گئے کیونکہ مارکسزم میں انسانوں اور خدا اور بندے کے اس تعلق کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میر کے حوالے سے جس جذبے اور جن باتوں کا ذکر سردار نے کیا ہے' کبیر' غالب اور اقبال کی فکر اور شاعری میں یہ جذبہ کسی نہ کسی شکل میں مشترک ہے۔

اس کتاب میں سردار جعفری نے غالب کی شاعری کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ بقول شارب رودلوی "غالب کے یہاں کوئی مربوط فلسفہ حیات یا منظم فکر نہیں ہے لیکن ان کا مزاج فلسفیانہ ہے اور فکری عناصر ان کے کلام میں ہر جگہ موجود ہیں۔ وہ بے حد دور اندیش اور فردا بیں شاعر ہیں۔ یہی صفت ہے کہ وہ اپنے تمام ہم عصروں سے مختلف نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں صوفیانہ خیالات بھی ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت ذائقہ بدلنے کی سی ہے۔ ان میں بھی کہیں کہیں ان کی طبیعت کی شوخی حاوی ہو جاتی ہے اور وہ گناہ وثواب اور جنت اور دوزخ کے تصور کے ساتھ خدا سے بھی شوخیاں کرنے لگتے ہیں۔ وہ وحدت الوجود کے قائل تھے لیکن عام صوفیوں کی طرح ان کے الجھاوؤں میں گرفتار نہیں تھے۔ اس لیے کبھی گھبرا کر خود خدا سے سوالات کرنے لگتے ہیں کہ اگر تیرے علاوہ کچھ نہیں ہے تو یہ چہار جانب کیسا ہنگامہ ہے۔

اس سے قبل کہ میں غالب اور وحدت الوجود کے بارے میں پیغمبران سخن سے سردار جعفری کا تجزیہ نقل کروں۔ غالب اور تصوف کے بارے میں شارب رودولوی کے اس خیال کی تردید کہ غالب کے یہاں صوفیانہ خیالات بھی ہیں لیکن ان کی حیثیت ذائقہ بدلنے کی سی ہے۔ صوفی دوراں ممتاز دانشور و محقق حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی نے چند برس پہلے حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے عرس شریف کے موقع پر درگاہ شریف گلبرگہ میں منعقدہ سمینار میں اپنے مقالہ 'غالب اور فیضان بندہ نوازؒ' میں یہ انکشاف کیا تھا کہ تصوف سے غالب کی دلچسپی برائے شعر گوئی نہیں تھی۔ بقول شخصے ذائقہ بدلنے کی سی نہیں تھی۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے فرمایا تھا کہ غالب سلسلہ عالیہ چشتیہ نظامیہ نصیریہ بندہ نوازیہ یعنی حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے سلسلے کے ایک صوفی حضرت غلام نصیر الدین میاں کالےؒ کے مرید تھے۔ اس کا ذکر غالب نے اپنے کئی خطوط میں کیا ہے۔ ایک خط میں یوں لکھا ہے کہ پہلے گورے (یعنی انگریز) کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں۔ حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی نے اس سلسلے میں غالب کے اس شعر کا بھی حوالہ دیا تھا؎

ہر بن مو سے نہ ٹپکے جو دمِ ذکر لہو
حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

یہ شعر صوفیہ کے ایک ذکر کا حوالہ ہے اس ذکر سے ذاکر کا خون پانی میں تبدیل ہو کر ہر بن مو سے جاری ہو جاتا ہے۔ اس ذکر کے لیے پیر کی اجازت اور نگرانی ضروری ہے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ غالب کے

دیوان میں 100 سے زائد اشعار تصوف پر مل جاتے ہیں۔ یہ غالب کی تصوف سے عملی دلچسپی کا ثبوت ہیں۔ حضرت خواجہ حسن ثانی نے صوفیا کے اعمال واذکار سے غالب کی عملی واقفیت کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ غالب اور تصوف پر کچھ کم کام نہیں ہوا ہے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حضرت میکش اکبرآبادی جیسے بزرگ نے اس موضوع پر قلم اٹھایا جو غالب اور تصوف دونوں پر اتھاریٹی کا درجہ رکھتے تھے۔ مگر دیگر ماہرین غالبیات نے اس کے باوجود غور نہیں کیا۔ اردو کے کلاسیکل شعراء یا متقدمین سے لے کر عصر حاضر کے شعراء کے یہاں بھی متصوفانہ اشعار مل جاتے ہیں۔ یہ اردو شاعری کی ایک روایت بھی ہے اور اظہار ذات کا ایک بلند پیرایہ بھی۔

اب غالب کے بارے میں پیغمبران سخن سے سردار جعفری کا خیال ملاحظہ فرمائیں:

"وحدت الوجود کے ڈانڈے کہیں ویدانت سے جا ملتے ہیں اور کہیں نوفلاطونیت سے۔ یہ فلسفہ اپنے ہزاروں الجھاؤوں کے ساتھ ذات مطلق، نفی صفات اور ترکِ دنیا سے لے کر تشبیہ سے آراستہ اور صفات سے سجی ہوئی ذات کے تصور تک پھیلا ہوا ہے۔ اور جب اس میں ایرانی تاتاری پیگن ازم (کفر) کی آمیزش ہو جاتی ہے تو لذت طلبی کا پہلو بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اب یہ اپنی ہمت پر منحصر ہے کہ آدمی اس منزل پر پہنچ کر دنیا کو تج دے (کبیر داس) یا شوق کا ہاتھ بڑھا کر اس رنگ و نور اور صوتِ آہنگ سے بھرے ہوئے ناچتے کھلونے اٹھا لے۔" (حافظ اور غالب) پیغمبران سخن ص 145

غالب کی مقبولیت اور ہمہ گیری' قید زماں سے آگے اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ وہ

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

غالب کا سومناتِ خیال یعنی غالب کی مشہور فارسی مثنوی چراغ دیر کا ترجمہ اور مقدمہ بھی سردار جعفری کا ایک اہم علمی کارنامہ تصور کیا جاتا ہے۔ غالب کا فارسی شعر اس ترکیب کو پیش کرتا ہے۔

بہ سومناتِ خیالم در آئی تا بینی
رواں فروز بر دوش ہائے زناری

سردار جعفری نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

یعنی میرے سومنات خیال میں آؤ اور دیکھو کہ کیسے کیسے دلآویز اور روح افروز پیکر یہاں آراستہ ہیں جن کے دوش زنار سے سجے ہوتے ہیں۔ (سومنات خیال ص 21)

غالب نے اس عبادت گاہ کو سومناتِ خیال کہہ کر اس کو صوفیانہ فکر کے دائرے سے بھی باہر نکال لیا اور ایک نیا وقار عطا کیا۔ جس میں عقیدے کا دخل نہیں ہے بلکہ ایک غیر مذہبی فکر کی کارفرمائی ہے۔ یہ بات بہت دلچسپ اور فکر انگیز ہے کہ غالب نے اپنی شاعری کو سومناتِ خیال کیوں کہا اس کی کسی تحریر سے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ (سومناتِ خیال ص 22-21)

غالب کی مثنوی چراغ دیر کا ترجمہ حیدرآباد میں اختر حسن نے بھی کیا تھا۔ اس کی تقدیم و تاخیر کا تو پتہ نہیں لیکن غالب کے اپنے سومناتِ خیال کو اس کے جہانِ خیال کی رنگینی کے علاوہ اور کس چیز سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہاں سومناتِ خیال کو ایک بڑا بت خانہ تصور کیا جائے تو اس میں بتوں کی موجودگی کو معشوقوں کی انجمن سے کیوں تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ شعراء نے اگر معشوقوں کو بتوں سے تشبیہ دی ہے تو یہ ان کی پرستش یا کفر کی دلیل نہیں ہے بے حسی اور بے توجہی سنگ دلوں اور سنگی مجسموں کا ہی شیوہ ہوسکتی ہے۔ اب نام یاد نہیں آرہا ہے حیدرآباد ہی کے کسی استاد شاعر کا شعر ہے۔

یہی عالم رہا جو وحشت کا
بت بنالیں گے تیری صورت کا

یا

اب کے سوچا ہے کہ پتھر کے صنم پوجیں گے
تاکہ گھبرائیں تو ٹکرا بھی سکیں مر بھی سکیں

غالب کے سومناتِ خیال کو اسی رومانی تخئیل کے پس منظر میں دیکھا جانا چاہیے ہر چند کہ سومنات کے مندر میں جو بت تھے اور برادرانِ وطن کے مبجود تھے۔ سردار جعفری اس مثنوی کے حوالے سے سومناتِ خیال کا رشتہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب سے جوڑتے ہیں تو بھی یہ زیادہ غلط نہیں ہے۔ سردار جعفری نے مثنوی چراغ دیر کو غالب کے اپنے وطن ہندوستان سے والہانہ محبت کا اظہار قرار دیا ہے۔ غالب نے اس مثنوی میں بنارس کو ہندوستان کی تہذیبی اور جمالیاتی رنگینیوں کا مظہر اور کعبۂ ہندوستان یا کعبہ ناقوسیاں قرار دیا ہے۔

اقبال شناسی بھی سردار جعفری کی ایک اہم کتاب ہے۔ اقبال کو سردار جعفری ایشیائی بیداری کا شاعر قرار دے کر ان کی عظمت کو محدود کرتے ہیں۔ اقبال پورے عالم اسلام بلکہ عالم انسانیت کے شاعر ہیں۔ غالباً

حکیم الامت کے خطاب کے سبب بشمول سردار جعفری بھی ترقی پسندوں نے اقبال کو رجعت پسند شاعر قرار دے کر ان کی مخالفت کی لیکن پھر ان سے دوبارہ رجوع ہو کر انھیں انسانیت پسند اور ایشیاء کی بیداری کا نقیب قرار دیا۔ اقبال کی ترقی پسند فکر کو ڈھونڈ نکالا۔ سردار جعفری اقبال کے کلام میں ہندی روایت کے بعض عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اقبال کا فلسفہ اور شعر اس خودی کی تشریح اور توضیح ہے اس مقصد کے لیے انھوں نے بہت سی اسلامی روایات کو رد کیا۔ (مثلاً وحدت الوجود) اور بہت سے افکار کو نئی معنویت عطا کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے مغربی علوم سے بھی فائدہ اٹھایا اور ہندو فکر سے بھی۔" (اقبال شناسی ص 13)

اقبال سے پہلے غالب کے یہاں وحدۃ الوجود کے فلسفہ کی موجودگی کا اظہار سردار جعفری کر چکے ہیں۔ اقبال کے یہاں اس کے استرداد کا جواز سردار پیش نہیں کر سکے اس کے باوجود اقبال کی فکر پوری طرح اسلامی ہے۔ اقبال نے اپنے ہندی نژاد بلکہ برہمن زادہ ہونے پر بھی تفخر کا اظہار کیا ہے۔

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی

برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

اس حقیقت سے کس کو انکار ہے کہ اقبال کے آباء ہندو اور برہمن تھے۔ لیکن یہ ہندو اقبال سے پہلے بھی رومی اور تبریزی کے رمز آشنا رہے ہوں گے۔ دراصل یہ شعر خاندانی افتخار کے اسیر مسلمانوں پر طنز کی حیثیت رکھتا ہے۔ رومی اور تبریزی کے رمز آشنا ہونے کے لیے مسلمان ہونے کی شرط نہیں فارسی زبان سے اعلیٰ سطح کی واقفیت ضروری ہے۔ کیا کوئی مسلمان مفکر شاعر اس وقت تک انسانیت پسند نہیں ہو سکتا۔ تا آنکہ وہ ہندی روایات یا مغربی افکار سے استفادہ کر کے انھیں اپنی شاعری میں بروئے کار نہ لائے۔ دراصل اقبال شناسی ترقی پسندوں کے توبہ نامہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

میر غالب، اقبال، کبیر میرا ٹیگور کے انسانیت کے استعارے اسلامی اور ہندو روایات سے آئے ہیں۔ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب بھی عالم انسانیت کو ایک کنبہ اور ایک آدم کی اولاد قرار دیتے ہیں۔ کسی شاعر کے مذہبی پس منظر کی بنیاد پر اسے فرقہ پرست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ بات ترقی پسندوں کو کافی دیر بعد سمجھ میں آئی۔ احترامِ آدمیت کی تعلیم ہندوستان میں صوفیاء نے بھی دی ہے اور سنتوں نے بھی۔ بلا لحاظ مذہب و ملت انسانوں

کی خدمت اور رواداری کے جذبات انہیں کے وسیلے سے ہمارے ادب اور شاعری کا حصہ بنے۔ سری کرشن، شری رام، گرونانک، لینن وغیرہ پر اقبال کی نظمیں انسانی عظمت کو شاندار خراج عقیدت ہے۔ اقبال کی فکر میں غیر اسلامی افکار کی تلاش کا کام ایک خاص مقصد سے آج تک جاری ہے۔

سردار جعفری کی دیگر خدمات میں نیا ادب لکھنؤ اور گفتگو سہ ماہی ممبئی کی ادارت اہم ہے۔ گفتگو میں انھوں نے اس زمانے میں ابھرنے والے فنکاروں کو بھی نمائندگی دی تھی۔ ابتداء میں انھوں نے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کی۔ وہاں سے منتقل ہونے کے بعد کوئی ملازمت نہیں کی۔ انھوں نے آخری دور میں بعض دستاویزی فلموں کی کہانی اور مکالمے لکھے۔ آزادی کے سو سال کی دستاویزی فلم کی ہدایت بھی کی۔ پانچ سال تک ٹی وی سیریل محفل یاراں کے پروڈیوسر رہے۔ اٹھارہ اپی سوڈ پر مشتمل سیریل آج کل بنائی۔ کہکشاں کے نام سے اردو شعراء حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، مخدوم اور مجاز پر ٹی وی سیریل بنایا۔ وہ ترقی پسند ادیبوں کے سرخیل ہی نہیں اردو تحریک کے رہنما تھے۔ حکومت اور ادبی تنظیموں نے انھیں متعدد اعزازات سے نوازا۔ پدم شری، جواہر لال نہرو فیلوشپ، سویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ، سجاد ظہیر ایوارڈ، اقبال میڈل (پاکستان)، مخدوم ایوارڈ، کمار آسن ایوارڈ (ملیالم)، ہندروس دوستی میڈل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری اور گیان پیٹھ ایوارڈ۔ اس کے علاوہ وہ بمبئی یونیورسٹی کے سنڈیکیٹ کے دوبار رکن رہے۔ جموں یونیورسٹی کے وزیٹنگ پروفیسر، اقبال صدی تقاریب کمیٹی کے جنرل سکریٹری، انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کے صدر، نیشنل بک ٹرسٹ کے رکن، فلم رائٹرس اسوسی ایشن ممبئی کے صدر، مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی کے نائب صدر، گجرال کمیٹی کے رکن اور گجرال کمیٹی سفارشات کی ریویو کمیٹی (جعفری کمیٹی) کے صدر رہے۔ آئی کے گجرال جیسے سوشلسٹ رہنما کی نگرانی میں اردو کے مسائل اور مطالبات جمع کرنے کے بعد ان کا جائزہ لینے کے لیے خود سردار جعفری کی نگرانی میں کمیٹی بنی، لیکن بعض معاملات و مطالبات کو ریاستی حکومتوں کے دائرہ کار میں دینے کے سبب اس کی سفارشات پر کوئی عمل درآمد نہیں ہوسکا۔ سردار جعفری نے اس بارے میں کھل کر مضامین لکھے لیکن یہ بھی صدا بہ صحرا ثابت ہوئے۔ سیاسی عزم اور اخلاص نیت کا فقدان مسائل کو حل نہیں کرتا بلکہ ان میں اضافہ کرتا ہے۔ سردار جعفری اور گجرال کی مشقت بے فیض ثابت ہوئی۔ جب اتفاق سے گجرال وزیراعظم بن بیٹھے تو اس وقت بھی انھیں گجرال کمیٹی کی سفارشات یاد نہیں آئیں۔

سردار جعفری سے پہلے اور بعد بھی اپنی آخری سانس تک اردو کے سب سے بڑے نمائندے بنے رہے۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر اردو کے ہر سرکاری جلسے جلوس ان کی صدارت اور قیادت میں ہوتے رہے۔ یہ کام آج جن لوگوں سے حکومت لے رہی ہے ان کا قد سردار جعفری ہی کیا اردو کے ایک عام کارکن کے قد سے بھی چھوٹا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ آج کاروانِ اردو کس مرحلہ شوق میں ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا اردو کے جہد کاروں کو اپنی منزل کا پتہ بھی ہے کہ نہیں۔ میں اردو جہد کاروں کو سردار کا یہ شعر یاد دلانا چاہوں گا۔

ہر عاشق ہے سردار یہاں　　　　ہر معشوقہ سلطانہ ہے

سردار جعفری نے گیان پیٹھ ایوارڈ قبول کرتے ہوئے وزیر اعظم وقت اٹل بہاری واجپائی کی موجودگی میں تقریر کی تھی۔ اس میں سردار جعفری نے 1997 میں غالب کے صد سالہ جشن ولادت کے سال اور ہندوستان کے پچاس سالہ جشن آزادی اور اسی سال کے گیان پیٹھ ایوارڈ سے اپنے نام کے وابستہ ہونے کو قران السعدین قرار دیتے ہوئے اسے اپنی خوش نصیبی قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ دو اچھے ستاروں کا ایک برج میں جمع ہونے کو قران سعدین کہتے ہیں۔ غالب کی پیدائش اور ہندوستان کی آزادی کے ستارے جمع ہو گئے ہیں اس میں اگر ایک ذرہ بھی داخل ہو گا تو ان کے نور سے جگمگا اٹھے گا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا ہے کہ:

1857 سے 1947 تک نوے برس اردو شعرا و ادب کے سب سے زیادہ زریں سال ہیں۔ اس زمانے میں اردو نے اپنا جمالیاتی کردار بھی ادا کیا ہے اور سیاسی کردار بھی۔ اردو کے بے شمار ادیب و شاعر جنگ آزادی کے سپاہی رہے ہیں۔ ان میں بعض ادیب اور صحافیوں کو اخبار شائع کرنے کے جرم میں قتل کیا گیا یا جلا وطن کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا اور کالے پانی کی سزا دی گئی۔ ان میں سب سے نمایاں مولانا فضل حق خیر آبادی اور مفتی صدرالدین آزردہ کے نام ہیں جو اپنے وقت کے بڑے عالم اور غالب کے دوست تھے۔ بیسویں صدی میں 1947 تک ہم نے غلامی کے خلاف آندولن میں دو قومی ترانے استعمال کئے۔ ایک وندے ماترم اور دوسرا سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا۔ ایک سرکاری طور پر جن گن من ہمارا قومی ترانہ ہے۔ لیکن وندے ماترم اور سارے جہاں سے اچھا عوام کے دلوں میں زندہ ہیں۔ ہمارا سب سے زوردار نعرہ انقلاب زندہ باد ہندوستان گیر نعرہ رہا ہے' یہ بھی اردو زبان کی دین ہے۔ اردو زبان کے شعروں میں ضرب المثل بن جانے کی جو صلاحیت ہے یہ اس کا کرشمہ ہے کہ ہمارے بہت سے انقلابی شہیدوں کی زبان پر آخر وقت تک

اردو کے اشعار تھے۔ مثال کے طور پر کاکوری کیس کے شہید رام پرشاد بسمل نے اپنے ہم نام بسمل عظیم آبادی کی غزل کو پھانسی کے تختے پر پڑھ کر لافانی بنادیا ہے ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
رہروِ راہِ محبت تھک نہ جانا راہ میں
لذت صحرانوردی دورئ منزل میں ہے

یہ اشعار آج بھی ہماری ہمت کو بلند کرتے ہیں اور ہمیں ہر مشکل کا سامنا کرنے کا حوصلہ عطا کرتے ہیں۔ ان شعروں میں خون شہیداں کی گرمی ہے۔ آگے سردار جعفری نے کہا کہ:

''یہ کیسی عجیب بات ہے کہ آزادی کے پچاس سال بعد بھی غالب اور اردو دونوں بے گھر ہیں اردو فرقہ ورانہ سیاست کا شکار ہوگئی۔ تقسیم ملک نے سب سے زیادہ نقصان اردو کو پہونچایا ہے۔ اگر اس وقت غالب کے دوسو سالہ جشن ولادت اور آزادی کے پچاس سالہ جشن کے موقع پر غالب کو گلی قاسم جان میں اپنا گھر مل جائے اور اردو کو شمالی ہندوستان میں اپنا علاقہ۔ جہاں وہ ہندی کے ساتھ دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے زندہ رہ کر ترقی کر سکے تو بہت بڑے نقصان کی تلافی ہو جائے گی۔''

اس کے بعد سردار جعفری نے کہا کہ:

ہندو مسلم اتحاد ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے اس کے بعد ہی ہم وسیع تر قومی اتحاد کا تصور کر سکتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے نیوکلئیر ٹسٹ بھی ہندو مسلم نفاق کا نتیجہ ہیں۔ وہ نفاق جس نے ملک کو تقسیم کیا۔ یہ ہتھیار عشق کی نہیں خوف ونفرت کی زبان بولتے ہیں۔ اس کے بعد سردار جعفری ایک بنگالی کہانی بیان کر کے اس کے اختتام کے بعد اسے اپنے طور پر آگے بڑھا کر مسجد کے گنبد پر کلس کے نیچے شام کی سرمئی اور گلابی روشنی میں کنول کے پھول کو مسکراتے ہوئے پیش کرتے ہیں جو ان کے بقول ہندوستانی مشترکہ تہذیب اور تعمیر کی علامت ہے۔ پھر جنگ کی مخالفت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جنگ ہوئی تو کنول کا پھول جھلس جائے گا۔ وہ وزیر اعظم وقت واجپائی کو ان کے سینے میں بیٹھے ہوئے ان کے شاعر دوست کی آواز سننے کا مشورہ دیتے ہوئے ان

کی نظم ہم جنگ نہ ہونے دیں گے پڑھتے ہیں اور آخر میں ان الفاظ پر تقریر ختم کرتے ہیں ''ہندوستان پاکستان اور ساری انسانیت کو سردار جعفری کو کنول تک پہنچنے کے لیے سیاسی کیچڑ میں اترنا پڑا لیکن انھوں نے اردو کے حقوق، ہندو مسلم اتحاد، ہند پاک دوستی اور امن کی ضرورت پر بے باک اظہار خیال کیا''۔ بہت سی مصلحتوں اور سرکاری نزاکتوں کے باوجود سردار جعفری کی سچ بولنے کی ادا یعنی ان کی کج کلاہی ہمیشہ قائم رہی۔ آج کے ادیب و فنکار اور اردو جہد کاران کی حق گوئی پر پچاس فیصد بھی عمل کریں تو خواہ وہ اپنے حقوق حاصل کر سکیں یا نہ کر سکیں لیکن اپنے منصب کا حق تو یقیناً ادا کر سکیں گے۔ بقول سردار

لطف سخن

جب ہوں رسوا سرِ بازار تو ہے لطفِ سخن
حرفِ حق جب ہو سردار تو ہے لطفِ سخن
اپنے اور غیر ہوں سچ کہنے پہ آمادۂ قتل
اور نہ ہو کوئی طرف دار تو ہے لطفِ سخن
مصلحت وقت کی اقرار سکھائے لیکن
دل میں ہو جرأتِ انکار تو ہے لطفِ سخن
ظلم کے خوف کے اور موت کے سناٹے میں
ایک ایک حرف ہو بیدار تو ہے لطفِ سخن

جناب حامد اکمل صحافی اور شاعر کی حیثیت سے اردو دنیا میں جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے میسور یونیورسٹی سے ایم اے اردو میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ کے بی این ٹائمز اور ماہنامہ عالمی شمع کے ایڈیٹر ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ تشبیہ 1994 میں منظر پر آچکا ہے اور 2014 میں گلبرگہ میں شعر و ادب کے عنوان سے کتاب مرتب کر کے شائع کی ہے۔

سردار جعفری کا تاریخی، تہذیبی اور تنقیدی شعور

(ترقی پسند ادب اور پیغمبرانِ سخن کے حوالے سے)

پروفیسر علی احمد فاطمی

نثر میں سردار جعفری کا سب سے بڑا کارنامہ ''ترقی پسند ادب'' ہے جو انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس (1936) کے ٹھیک پندرہ سال کے بعد 1951ء میں شائع ہوئی۔ اس سے قبل عزیز احمد کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' اور کشن پرساد کول کی کتاب ''نیا ادب'' منظرِ عام پر آ چکی تھی۔ ہر چند کہ مجنوں گورکھپوری، سجاد ظہیر، احتشام حسین وغیرہ کے مقالات ترقی پسند فکر و نظر کی وضاحت اور صراحت میں آ چکے تھے تاہم سردار جعفری کے اندر کے ترقی پسند مفکر و دانشور نے یہ ضروری سمجھا کہ ترقی پسند فکر و فلسفہ کی نہ صرف مزید وضاحت کی جائے بلکہ مشرق کے تصوف اور مغرب کی اشتراکیت کے ڈانڈے بھی ملائے جائیں۔ تحریک کے عالمی رشتوں پر بھی روشنی ڈالی جائے نیز صحافت، فلم وغیرہ سے بھی ترقی پسندی کے رشتے استوار کیے جائیں لیکن سچ یہ ہے کہ اس کتاب کا بنیادی مقصد ترقی پسند نظریاتی مباحث کو پھیلانا، اُسے وسعت دینا اور ماضی و حال کے ادیبوں میں ان افکار و نظریات کو تلاش کرنا ہے اور پندرہ برس کے عملی تجربے اور ادبی تخلیقات کے پیشِ نظر تحریک کا جائزہ لینا بھی مقصود تھا۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں۔

> ''میں نے یہ جائزہ اپنے نقطۂ نگاہ سے لیا ہے۔ جس کی بنیاد تاریخی اور عمرانی حقائق پر ہے۔ میری ذاتی رائے کو پوری تحریک کی رائے نہیں سمجھنا چاہیے''۔

ترقی پسند ادب کتاب کا پہلا باب نقطۂ نگاہ ہے۔ جس میں ادب کی ضرورت پر تو گفتگو ہوتی ہے لیکن اس سے زیادہ آگے بڑھ کر انسانی جذبہ اور شعور کی باتیں بھی کی گئی ہیں۔ دونوں کے باہمی رشتے پر باریک باتیں کی گئی ہیں۔ سردار جعفری کا خیال ہے کہ شعور کے بغیر جذبہ محض جبلّت ہو کر رہ جاتا ہے۔ جس پر کبھی کبھی حیوانیت بھی سوار ہو جاتی ہے۔ اس لیے تخلیقی ادب کے حوالے سے جذبہ اور شعور کا تعلق بیحد اہم ہے۔ اسی مقام پر ایک خوبصورت

جملہ نکلتا ہے۔ ''جذبے میں شعور کے بغیر گہرائی پیدا ہو ہی نہیں سکتی اور جذبے کی گہرائی کے بغیر ادب' ادب نہیں رہ سکتا.....'' اور آگے لکھتے ہیں.... ''جذبہ خود شعور کی شدت سے پیدا ہوتا ہے اور تخیل بھی شعور کا محتاج ہے''۔

سردار جعفری سے قبل تنقید تھی اور ترقی پسند تنقید بھی اپنی پہچان بنا چکی تھی لیکن جذبہ اور شعور، تصور و تخیل وغیرہ کے حوالے سے ایسی تخلیقی نوعیت کی گفتگو نہیں تھی یا تھی تو برائے نام۔ خالص نقاد کے یہاں ایسی بحثیں عموماً مفقود رہتی ہیں لیکن جب ایک ذی علم فنکار اور تخلیق کار قلم اُٹھاتا ہے تو علم و فکر کے ساتھ ساتھ اس کا اپنا فنی اور جمالیاتی شعور بھی کام کرتا رہتا ہے۔ سردار جعفری کی تنقیدی نگارشات میں یہ وصف بطور خاص نظر آتا ہے۔ سردار جعفری سے قبل فیض نے بھی تنقیدی مضامین لکھے ہیں اور میزان نام کا مجموعہ ہے لیکن اس میں بھی ایسے نازک موضوعات پر گفتگو نہ کے برابر ہے جبکہ فیض سردار کے مقابلے زیادہ لطیف احساسات کے رومانی شاعر ہیں۔

سردار جعفری شعور کے ساتھ ساتھ احساسِ حُسن اور ذوقِ جمال کا بھی ذکر کرتے ہیں اور اسے راست طور پر شعور سے وابستہ کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شعور کا ارتقا بھی زندگی کی کشمکش اور جدوجہد کے ساتھ ہوتا ہے جس کی وجہ سے احساسِ حُسن اور ذوقِ جمال کے اقدار بھی بدلتے رہتے ہیں کہ یہ سب کہ سب زندگی اور سماج کے حقائق سے دوچار ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ایک خاص قسم کی ذہنی تربیت بھی ضروری ہوا کرتی ہے۔ اسی لیے اس احساس اور تصور کو سردار جعفری الہامی نہیں بلکہ اکتسابی مانتے ہیں۔ لیکن انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ محض لطف و ذائقہ پر زور دیتا ہے اور اس کی جڑوں اور سرچشموں تک اس کی نگاہ کم جاتی ہے لیکن تنقید و تجزیہ کے عمل کے لیے تمام طرح کی نزاکتوں اور گہرائیوں کا سمجھنا ضروری ہے اور پھر گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے صاف طور پر کہتے ہیں کہ ہر حسن یا حسین شے جو انسان کے مجموعی مفاد سے وابستہ نظر آئے گی وہی حسین ہے۔ جو چیز مفید نہیں ہے وہ حسین نہیں ہو سکتی۔

سردار جعفری احساسِ جمال اور تسکینِ ذوق کے جملہ عناصر کو تاریخ اور سماج سے الگ کر کے نہیں دیکھتے۔ وہ حافظ اور کیٹس کے گلاب کو بھی انسان کے سماجی اور ثقافتی ارتقا کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ ایک بندر حسین سے حسین گلاب کو نوچ ڈالتا ہے لیکن انسان کا احساس جمال رفتہ رفتہ جنگلی گلاب کو بھی باغیچہ میں یہاں تک کہ گلدان میں سجا لیتا ہے۔ یہ اس کے تہذیبی و تمدنی ارتقا کا حاصل ہے۔ سحر کو اوشا دیوی اور دریا کو گنگا کہنا محض جہالت نہیں ہے بلکہ اس کی عقیدت میں انسانی ارتقا کا جوہر پوشیدہ ہے۔ یہی جوہر آگے چل کر شعر و ادب میں اپنی جگہ بناتا ہے لیکن یہ سفر صدیوں کا ہے جسے چند سطروں میں سردار جعفری نے یوں پیش کیا ہے ؎

''پہلے انسان نے اپنے آپ کو فطرت کی شکل میں دیکھا اور جانوروں و درختوں سے وابستہ کیا اور اپنے قبیلے کے لیے وہاں سے نام حاصل کئے اور پھر اُس نے فطرت کو انسانوں کی شکل میں دیکھا اور انسانوں کو دیوتا بنا دیا جو تمام ارضی خصوصیات کے حامل تھے۔ طبقاتی سماج نے ان دیوتاؤں کو آسمانوں کے نیلے پردوں میں چھپا دیا اور وہ عوام اور ان کی محنت کے عمل سے دور جہاں سے اُنھیں خیالی روپ ملا تھا۔ ماورائیت کے دھندلکوں میں کھو گئے اس وقت انسان نے اپنے دیوتاؤں کے مقابلے پر اپنے ہیرو لا کھڑے کیے گورکی نے بتایا ہے کہ انسان نے پہلے دیو مالا کے کرداروں کی تخلیق کی اور پھر ان کے مقابلے پر اپنے افسانوی ہیرو تراشے جو عوام کی مجموعی صفات کے پیکر ہوتے ہیں''۔ (ترقی پسند ادب اشاعت دوم۔ص۔34)

اس کے بعد گفتگو جمال اور ذوق جمال پر آتی ہے جو ادب کے جمالیاتی تصور کے لحاظ سے بیحد اہم ہے۔ مختصر سی گفتگو کے بعد یہ فطری نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ہر شخص کے ذاتی تجربات الگ الگ ہوتے ہیں اور اسی کے حوالے سے تصورِ جمال بھی مختلف ہوا کرتا ہے جو وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اسی لیے وہ کہتے ہیں......'' ہر دور کا اپنا ذاتی جمال ہوتا ہے''۔ اور پھر دور اور ذوقِ جمال ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ شعور، جذبہ، تخیل و تصور کے حوالوں سے بڑی باریک باتیں اُٹھاتے ہیں اور شعر و ادب سے اس کے رشتے استوار کرتے ہیں۔ نیز یہ بھی کہتے ہیں کہ شعور کا ارتقا بھی سماج کے ارتقا سے وابستہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ

''انسانی فطرت ازلی اور ابدی نہیں ہے۔ تغیر و تبدیلی ناگزیر ہے۔ یہ ارتقا کا عمل ہے۔ شعور کی بیداری و تبدیلی انسانی فطرت کا تقاضا ہے اگر شعور ناپختہ ہے تو اسے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے''۔ (ص۔38)

اور یہ تبدیلی حسن و جمال کے تصور کو بھی بدلتی ہے۔ شعر و ادب کے معیار و کردار کو بھی بدلتی ہے۔ سردار جعفری اپنے نظریاتی تیور کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو لوگ جمال و شعور کو محض وجدانی اور باطنی قرار دیتے ہیں وہ تصوریت، عینیت اور ماورائیت کے مرتکب ہوتے ہیں اور شعوری اور غیر شعوری طور پر رجعت پرستی کے لیے راستے کھول دیتے ہیں اور اسے زمین کی سطح سے اُٹھا کر آسمان کی بلندی پر لے جا کر رکھ دیتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے چند برگزیدہ بندوں کے سوا کوئی شعر و فن کے انداز و رموز سے واقف نہیں ہو سکتا اور عام انسان اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ لکھتے ہیں..........

''آرٹ اور ادب کا یہ تصور فن کار اور عوام کے درمیان جھوٹے ذوق کی ایک دیوار کھڑی کر دیتا ہے اور آرٹ اور ادب سے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یعنی اس کا سماجی کردار چھین لینا ہے''۔ (ص۔39)

جمالیات کے سلسلے میں سردار جعفری کا حتمی خیال ہے کہ ترقی پسند تحریک جمالیات کے اس عمومی اور تاریخی تسلسل پر یقین رکھتی ہے کیونکہ اس کا تصور تاریخی اور سماجی ہے اور ادب کو تاریخ کی حرکت اور سماج کی جنبش کے ساتھ دیکھتی ہے اور ادب کو بھی تاریخ کی حرکت اور سماج کی جنبش کا آلۂ کار سمجھتی ہے اور پھر وہ جمالیات کی طرح ادب کو بھی سماجی اور مادّی سرچشموں کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔ یہ تلاش کچھ اس نوعیت کی ہے جہاں انسان کے فطری ذوق کے ساتھ طریق پیداوار اور سماجی جدوجہد کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ اس لیے جعفری کا یقین ہے کہ آرٹ، فنون لطیفہ، احساسِ جمال سب کہ سب سماجی ارتقا کے مرہونِ منّت ہیں۔ انسان کی اپنی کشمکش، جدوجہد اور بدلاؤ کی فطرت اپنا غیر معمولی اور لاشعوری کام کرتی رہتی ہے۔ انگریزی میں اس نوع کی بحثیں کاڈویل اور طامسن کی کتابوں میں ملتی ہیں اردو میں اس وقت تک اس قسم کے مباحث سردار جعفری کی تحریروں سے قبل نہیں ملتے۔ ذرا یہ جملے دیکھئے کہ کیا اردو تنقید یہاں تک پہنچ پائی تھی ۔

''شاعری انسان کا سب سے ابتدائی جمالیاتی عمل ہے اور جب شاعری ایک الگ صنف کی حیثیت سے نہیں ملتی تو وہ رقص، موسیقی، مذہب اور جادو کے ساتھ ملی ہوئی رہتی ہے وہ اخلاقی، سماجی اور سیاسی اصولوں کی ترویج کے لئے استعمال کی جاتی ہے اس لیے ساری دیومالا شاعری کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے اور ابتدائی مذاہب کی کتابیں بھی شاعری کے انداز میں لکھی ہوئی ہیں''۔ (ص۔41)

اور یہ جملہ بھی........ ''شاعری قبیلے کی معاشی زندگی سے پیدا ہوتی ہے اس طرح حقیقت خیال میں تبدیل ہو جاتی ہے اور شاعری جنم لیتی ہے''۔ (ص۔42)

سردار جعفری کا خیال ہے کہ چونکہ انسان کی فطری دلچسپی قصے کہانی سے تھی اس لیے ابتدا میں شاعری میں بھی کوئی کہانی کہی جاتی تھی جو ترنم کی محتاج نہیں تھی۔ کام کا یہ جملہ یہ ہے کہ بعد کو اسی بیانیہ شاعری سے نثر کی رومانی داستان اور ناول پیدا ہوا جس میں شاعرانہ زبان کی جگہ عام گفتگو نے لے لی اور ظاہری شاعرانہ ترنم کی جگہ خود کہانی کے اندرونی توازن نے لے لی اور جارج طامسن کا یہ جملہ........ ''اگر ناول وہ گویائی ہے جس میں ترنم نہیں ہے تو سنگیت وہ ترنم ہے جس میں گویائی نہیں ہے''۔

انسان نے فطرت اور عناصر فطرت سے نبرد آزمائی کرتے ہوئے فنون لطیفہ میں انقلاب تو ضرور برپا کر دیا لیکن اس انقلاب کے پیچھے اس کی اجتماعی جدوجہد اور سماجی کشمکش ہی کارفرما تھی۔ یہ جملے دیکھئے ۔

''یہ آرٹ جادو تھا جس کا مقصد فطرت اور ماحول کو تبدیل کر کے انسان کے لیے بہتر زندگی اور بہتر سماج کی تشکیل کرنا تھا۔ آرٹ بھی یہی فریضہ انجام دیتا ہے''۔ (ص۔46)

اور یہ بلیغ جملہ دیکھیے

''فطرت، سماج اور انسان کے درمیان جو تضاد ہے اس کو خوشگوار شکل میں حل کرنا آرٹ کا کام ہے''۔

سردار جعفری کی شاعری کے بارے میں عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ ان کے یہاں فن ولطافت کی کمی ہے وہ شاعری کو خارجی، سماجی اور عوامی زیادہ بنا دیتے ہیں جس سے نرمی اور تاثیر رخصت ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ خیال دُرست ہو لیکن سردار جعفری کا تصورِ شاعری تو بار بار یہ کہتا ہے ....

''آج بھی آرٹ کے لیے سحر کاری سب سے ضروری شرط ہے جس کے لیے آجکل تاثیر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس آرٹ اور ادب میں تاثیر نہیں وہ دو کوڑی کا ہے''۔ (ص۔47-46)

لیکن وہ تاثیر کا مطلب تفریح، تعیش اور سبک رومانیت نہیں سمجھتے بلکہ یہ کہ سننے یا پڑھنے والے کے سینے میں فنکار کا دل دھڑکنے لگے جو نئی آرزوؤں تمناؤں اور خوابوں سے معمور ہو۔ خواب سے مُراد نئے انسان، نئے خوشحال انسانی معاشرہ کا خواب۔

سردار جعفری کا یہ بھی خیال ہے کہ جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا گیا، انسان طبقات میں تقسیم ہوتا گیا اور چونکہ فنون لطیفہ کا تعلق انسان سے ہے تو وہ بھی طبقاتی ہوتا گیا اور خالص آرٹ اور خالص ادب کا تصور بھی پیدا ہونے لگا۔ یہیں سے نظریاتی تضاد بھی پیدا ہونے لگتا ہے۔ اسی مقام پر وہ گورکی کی ایک عمدہ مثال پیش کرتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ ہاتھ دماغ کی تربیت کریں اور تربیت یافتہ دماغ ہاتھ کی تربیت کریں اور ترقی کا سامان کریں۔ گورکی اس بات پر افسوس بھی کرتا ہے کہ دونوں کا باہمی رشتہ ٹوٹ سا گیا ہے۔ دنیا اور فکر کے ارتقا کے اصول مجرد ہو کر رہ گئے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر محنت سے محبت کا انقطاع ہو گیا ہے اور ادب کے دو دھڑے یا دھارے بن گیے ہیں۔ تب سے یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ سردار جعفری نے ان دو دھڑوں کو عوامی ادب اور اعلیٰ ادب میں تقسیم کیا ہے اور اس تقسیم کو پُر اثر اور معنی خیز انداز میں پیش کیا ہے لیکن بعد میں یہ بھی کہا کہ دوسرا دھڑا عوام کے تخلیقی سرچشموں اور پیداواری قوتوں سے تو ضرور دور ہو جاتا ہے لیکن پہلے دھارے سے بالکل منقطع نہیں ہوتا، یہ وہاں سے تقویت حاصل کرتا رہتا ہے خصوصاً ان لمحوں میں جب تاریخ کروٹ لیتی ہے بغاوت ہوتی ہے تو بقول جعفری

''تو دونوں دھارے ایک دوسرے کا منھ چوم لیتے ہیں اور ایک پُرشور سیلاب کی طرح چوڑے چکلے پاٹ میں بہنے لگتے ہیں۔'' (ص۔49)

اس کی مثالیں وہ روس اور چین کے ادب کے ذریعہ پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایران، ہندوستان بھی آتے ہیں اور یہ نتیجہ کن بات کرتے ہیں۔

''حقیقت یہ ہے کہ ہر دور کے بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کے بہترین کارنامے اور شاہکار اسی وقت وجود میں آئے ہیں جب انھوں نے عوامی تخیل سے بال و پر حاصل کیے ہیں''۔ (ص۔50)

اور آگے لکھتے ہیں۔

''ملٹن، ڈانٹے، گوئٹے اور شلر نے سب سے زیادہ بلند پرواز اسی وقت دکھائی ہے جب انھوں نے جماعت (Community) کی تخلیقی طاقت سے بال و پر مستعار لیے۔ جب انھوں نے اپنا انسپریشن عوامی شاعری کے سرچشموں سے حاصل کیا۔ عوامی شاعری جو اتھاہ سمندر ہے۔ بے انتہا، متنوع، زوردار اور عقل و فراست سے بھری ہوئی ہے''۔ (ص۔51)

وہ اسی صف میں فردوسی، نظامی، کالی داس، تلسی داس وغیرہ کو شامل کرتے ہیں لیکن جعفری اسی مقام پر اپنے خاص تیور کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں۔

''لیکن رجعت پرستی اتنی ناشکری ہے کہ عوامی خزانوں سے اتنا کچھ حاصل کرنے کے بعد بھی وہ عوام کے عطا کیے ہوئے حربوں کو انھیں کے خلاف استعمال کرتی ہے۔ وہ جس ہنڈیا میں کھاتی ہے اسی میں چھید کرتی ہے''۔ (ص۔53)

اس پہلے باب کے آخر میں وہ راہ راست ترقی پسند ادب کے اغراض و مقاصد پر آجاتے ہیں۔ اور بار بار جملہ دُہراتے ہیں۔

''ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ کاروانِ حیات کا رہبر بھی ہے۔ اسے محض زندگی کی ہم رکابی نہیں کرنا ہے بلکہ اس کی رہنمائی بھی کرنا ہے''۔

اگلے باب بعنوان بعض بنیادی مسائل میں ادب اور سیاست کے نمو پاتے رشتوں پر گفتگو کی گئی ہے۔ گفتگو کا آغاز مشاعروں سے ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک تاریخی جملہ یوں سامنے آتا ہے۔

''مشاعروں کا یہ انداز پہلی بار 1857 کے بعد بدلا جب محمد حسین آزاد نے لاہور میں نئے قسم کے مشاعروں کی طرح ڈالی جس میں مصرع طرح کے بجائے موضوع سخن دیا جاتا تھا اور شاعر قافیہ

پیمائی کے بجائے اس پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ یہ خواص سے عوام کی طرف جانے کے لیے ایک جمہوری جنبش تھی۔ یہ جنبش خالص مادی حالات کا نتیجہ تھی جو ہندوستانی سماج میں تقریباً سو برس سے پہلے پیدا ہو رہے تھے"۔ (ترقی پسند ادب۔ ص۔61)

یہ سلسلہ انجمن حمایت اسلام سے ہوتا ہوا کانگریس، لیگ اور سوشلسٹ پارٹیوں تک پہنچا جن کے جھنڈوں تلے مشاعرے ہونے لگے۔ کچھ تبدیلیاں اور ہوئیں جو مادی اور سماجی حالات کی تبدیلی کا نتیجہ ہیں۔ اس کے بعد وہ ترقی پسندوں کے سامعین اور قارئین کی گفتگو کرتے ہیں۔ ان کا سلسلہ تو مزدوروں اور کسانوں تک پہنچتا ہے جس کو معیار پرست اور تعیش پسند طبقہ پسند نہیں کرتا لیکن اس کا کیا کیا جائے۔ بقول سردار جعفری ۔

"میں نے ہندوستان کے مختلف شہروں میں سیکڑوں مشاعروں میں نظمیں پڑھی ہیں اور تقریریں کی ہیں لیکن وہ ذوق وشوق اور وہ اثر نہیں دیکھا جو مزدوروں کے مجمع میں نظر آیا"۔ (ص۔64)

پھر کئی ترقی پسند مشاعروں کا ذکر کرتے ہیں' مشاعروں کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ جلد ہی وہ ادب اور عوام کے رشتوں اور ادب کے معیار پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔ اس لیے یہ بھی کہتے چلتے ہیں...... "ہمیں مزدور کے مسائل کے بارے میں لکھنا ہے لیکن اس طرح کہ ادب اور فن کی سطح باقی رہے......" لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سادگی کا اپنا ایک حسن ہوتا ہے۔ غیر ضروری عبارت آرائی معمولی بات کو بھی پیچیدہ بنا دیتی ہے اور یہ بے باک جملہ...... "عقل کی عیاریاں ہزاروں بھیس بدلتی ہیں کبھی تغزل کے نام پر کبھی سوز و گداز کے نام پر کبھی ادب عالیہ کے نام پر......"

سردار جعفری پر الزام ہے کہ وہ ہمہ وقت سماجی ادب' انقلابی ادب کی گفتگو کرتے ہیں ادب میں فن اور معیار کا لحاظ نہیں کرتے ایسے معترضین کو سردار جعفری کا یہ کلیدی جملہ پڑھنا چاہیے ۔

"ہم ادیب ہیں اور ہمارا کام ادب کی تخلیق کرنا ہے۔ اگر ادب میں فن ہی ہاتھ سے چلا گیا تو کیا باقی رہ جائے گا"۔ ص۔69)

اور آگے لکھتے ہیں ۔

"محض برہنہ موضوع، نعرے بازی اور پروپگنڈہ -- نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادب غیر شعوری طور سے اس ہیت پرستی کا شکار ہو جاتا ہے جس کے لیے ہم رجعت پرستوں پر لعن طعن کرتے رہتے ہیں"۔ (ص۔69)

دیکھئے سردار جعفری کا نظریۂ ادب وفن...... پھر بھی سردار کی شاعری میں نعرہ ملتا ہے اور موضوعات کی برہنگی بھی...... ان نکات پر غور کرنے کے لیے ہمیں شعر وشاعری کی روایتی شعریات اور جمالیات پر نئی بحث کرنی

ہوگی اس لیے کہ عشقیہ شاعری کی جمالیات اور عوامی وانقلابی شاعری کی جمالیات مختلف تو ہوگی۔ بزم کی شاعری اور رزم کی شاعری مختلف ہوگی۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم بزم کے عادی ہیں رزم کے نہیں' ہم فریاد کے عادی ہیں للکار کے نہیں۔ ہم اسرار کے عادی رہے ہیں آشکار کے نہیں اس لیے عوامی اور احتجاجی شاعری کو عشقیہ شاعری کے پیمانے پر جانچتے رہے اور غلط نتیجے نکالتے رہے۔ جوش کی شاعری پر تقریر کرتے ہوئے جعفری نے کہا تھا۔

''ہمارے پاس شاعری کی جو روایت ہے اس میں انقلابی شاعری کا کوئی تصور نہیں ہے۔ فریاد کی شاعری ہے یہ للکار کی شاعری نہیں ہے''۔

وہ غالب اور اقبال کے یہاں سے حرف برہنہ نکال کر لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہی حرفِ برہنہ جوش کے یہاں تبدیل ہو جاتا ہے...... ''اگر آپ عوام کے شاعر ہیں تو آپ کی زبان، فن اسی طرح کے ہوں گے اور ہونے بھی چاہئے۔ سردار بانگ دہل کہتے ہیں...... ''ہم عوام کے ادیب ہیں اس لیے ہم کو اسی سطح پر لکھنا چاہئے جس سطح پر عوام کا ذہن ہے۔''

لیکن اس کے بھی کئی روپ ہیں اور یہ روپ جوش کی شاعری اور کرشن چندر کی کہانیوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ خود علی سردار جعفری کی شاعری کے بھی کئی روپ ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مزدوروں کے مسائل پر لکھنا اور بات ہے اور مزدوروں پر لکھنا اور بات ہے لیکن مزدوروں پر لکھنے کے لیے محض مزدوروں کو جاننا کافی نہیں بلکہ ان کے روح و دل میں اُترنے کی ضرورت ہے یعنی سماج کی پوری حرکت اور جنبش کو سمجھنا اور سمجھانا ضروری ہے جیسا کہ پریم چند نے کر کے دکھایا اور آگے بڑھ کر سردار، رشید جہاں کی کہانی غریبوں کا خدا، کرشن چندر کی کہانی مہالکشمی کا پل، اور کیفی اعظمی کی نظم چین کو اچھی مثالیں قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں...... ''تخلیقی اتحاد کے یہی معنی ہیں''۔ اس سلسلے میں وہ دنیا کے بڑے ادیبوں کی مثالیں بھی پیش کرتے ہیں لیکن اردو ادیبوں کے تعلق سے یہ بھی کہتے ہیں...... ''ہمارے بہت سے ادیب تو ابھی تک مزدور کا مطلب بھی نہیں سمجھتے۔'' اس کے بعد وہ ترقی پسند ادب تنظیم وتحریک کے بارے میں واضح طور پر لکھتے ہیں۔ الزامات کی تردید کرتے ہیں اور ترقی پسند عوامی مقبولیت کا اظہار واعلان بھی۔ یہ جملے دیکھئے۔

''ایسے سننے اور پڑھنے والے ہم سے پہلے کسی ادیب اور شاعر کو نہیں ملے تھے اور یہ ہمیں اس منزل پر ملے ہیں جب انھوں نے تاریخ اور سماج کی باگ ڈور شعوری طور سے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ جب وہ اپنی تقدیر آپ بنا رہے ہیں۔ اس ادب کی وسعت اور عظمت کا کیا کہنا جو زیادہ سے زیادہ انسانوں کے لیے ہو۔ وہ صحیح معنوں میں جمہوری ادب ہے اور اس کے جمہوری کردار پر ادیب بجا

طور پر فخر کرسکتے ہیں۔ ہمیں ناز ہے کہ ہم مٹھی بھر انسانوں کے لیے نہیں لکھتے۔ ہم ان عوام کے لیے لکھتے ہیں جو زندگی کے اصل ہیرو ہیں اس لئے وہ ہمارے ادب کے بھی ہیرو ہیں۔'' (ص۔79)

سردار جعفری کلاسیکی اور مذہبی شعر و ادب کو بھی نئی تعبیر و تفہیم کے حوالے سے دیکھتے ہیں اور ترقی پسندوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ۔

''ان خزانوں کو عوام تک لے جانے کا فرض ترقی پسند مصنفین دو طرح سے انجام دیں گے۔ ایک تو ماضی کی بہترین روایات کو اپنے ترقی پسند اور انقلابی ادب میں سمو کر اور دوسرے اس ادب کے ذریعہ سے سماج کو تبدیل کر کے ایک ایسے سماج کی تشکیل کی صورت میں جس میں کوئی جاہل اور ان پڑھ نہیں ہوگا۔ ماضی کی حفاظت حال اور مستقبل کی تخلیق ہی کے ذریعے سے ہو سکتی ہے۔'' (ص۔80)

بڑا ادب بڑے موضوع سے ہوتا ہے اس لیے موضوع کو حسین ہونا چاہئے۔ اس کے بعد وہ موضوع کے حسین ہونے کی منطق اور دلیل پیش کرتے چلے جاتے ہیں لکھتے ہیں ۔

''میری مراد حسین موضوع سے وہ موضوع ہے۔ جس کے ذریعہ سے انسانوں کی زندگی کو خوبصورت بنایا جا سکے۔ جس کا کوئی سماجی مقصد ہو۔ اسے میں موضوع کی معنویت کہوں گا۔ ۔ معنویت نہیں ہوگی تو موضوع حسین نہیں ہوگا اور موضوع حسین نہیں ہوگا تو ادب حسین نہیں ہو سکتا''۔ (ص۔81)

ادب اور پروپگنڈہ، موضوع کے ساتھ جانب داری، خیال اور اظہار، انفرادیت اور اجتماعیت وغیرہ پر عمدہ خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ جعفری کا خیال ہے کہ ہر بڑا ادب کسی نہ کسی طرح پروپگنڈہ یا تبلیغ ہوتا ہے بس فرق یہ ہے کہ وہ اس کو کس طرح پیش کر رہا ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں ...... ''ادب اخبار کی طرح پروپگنڈہ نہیں کرتا ......'' آل احمد سرور نے کہا تھا ...... ''ادب بہترین پروپگنڈہ ہے لیکن پروپگنڈہ ادب نہیں ہے۔'' لیکن جعفری بار بار یہ بھی کہتے ہیں ...... ''موضوع کا انتخاب بجائے خود کافی نہیں ہے اس کو پیش کرنے کا طریقہ بھی اہم ہے۔'' اور گفتگو ہئیت اور موضوع کی طرف مڑ جاتی ہے اور اس جملہ پر باب کا خاتمہ ہوتا ہے ۔

''ماضی ایک بہت بڑا خزانہ ہے جس میں جواہرات کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ انھیں دیکھیے اور پرکھیے تا کہ آپ خود اپنے ہیروں کو تراش سکیں۔ محض روایت پرستی رجعت پرستی ہے لیکن روایات کا احترام کرنا اور ان کے مطالعہ سے ایک تنقیدی نظر پیدا کرنا ترقی پسندی ہے''۔ (ص۔94-93)

اور سب سے آخر میں مارکس کا یہ بلیغ جملہ نکلتا ہے ۔

"ماضی کی لگام ہمارے ہاتھ میں ہے لیکن ہماری لگام ماضی کے ہاتھ میں نہیں ہونی چاہئے۔" (ص۔94)

کتاب کا تیسرا باب تاریخی پس منظر سے تعلق رکھتا ہے جو کارل مارکس کی تحریروں سے شروع ہوتا ہے اس کے فوراً بعد جعفری کا یہ جملہ...... "ادبی اور علمی تحریکیں اور نظریے وقتی تقاضوں سے یقیناً پیدا ہوتے ہیں لیکن پچھلے تہذیبی سرمائے اور گذشتہ روایات کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔"

ترقی پسند ادب کی تحریک، سرسید، حالی، شبلی، اکبر، اقبال وغیرہ کی جمہوری روایات کا تسلسل بھی ہے اور ایک ایسی نئی تحریک بھی جس سے ہمارا ادب پہلے کبھی واقف نہیں تھا۔ آگے کہتے ہیں...... "سرسید، حالی، شبلی اور اقبال کا کارنامہ کیا ہے ہم انھیں بڑا کیوں کہتے ہیں اور ہمارے موجودہ ترقی پسند ادب سے ان کا کیا رشتہ ہے؟"

پورا باب اسی سوال کے جواب میں رقم کیا گیا ہے۔ جواب کا پہلا جواز تو یہ ہے کہ ادباء وشعراء پہلی بار ادب اور سماج کے رشتے کو شعوری طور پر جوڑتے نظر آتے ہیں۔ شعوری اس لیے کہ لاشعوری طور پر تو ادب اور سماج کا رشتہ ہوتا ہی ہے۔ ہوا کے باہر کوئی سانس نہیں سکتا لیکن ان ادیبوں نے راست طور پر اس عہد کے نہ صرف سماج بلکہ سیاست سے بھی گہرا رشتہ رکھا ہے۔ لکھتے ہیں۔

> "سرسید کے سارے مضامین جو جدید اردو نثر کے پہلے نمونے ہیں اسی مقصد کے لیے لکھے گئے۔ حالی کی شاعری میں تبدیلی اور پھر مسدس کی تخلیق اسی مقصد کے تحت ہوئی۔ شبلی کی شاعری شعرالعجم اور دوسری تصنیفات اور اقبال کی پوری شاعری کے سامنے یہی مقصد تھا۔ غرضکہ سیاسی تحریکوں کے ساتھ وابستگی ہمارے ادبی ورثے میں آئی ہے"۔ (ص۔97)

حالانکہ جعفری سرسید اور حالی کی انگریز پرستی کی تنقید کرتے ہیں تاہم ان کی علم اور تعلیم سے دوستی، روشن خیالی کی حمایت بھی کرتے ہیں اور کہا...... "نئی تعلیم کی کوششوں نے سرسید کی آبرو رکھ لی۔" جو آگے چل کر ان کی ترقی پسندی کے آثار بنے۔ یہ جملہ بھی دیکھئے...... "مختصر یہ کہ یہ بزرگ سیاسی طور پر رجعت پسندی کا شکار تھے اور سماجی طور سے ترقی پسند تھے۔"

بہرحال ان تضادات کے باوجود جعفری ان کی عقل پسندی اور حقیقت نگاری کی کوششوں کو سراہتے ہیں کہ سرسید نے اپنے مضامین کے ذریعہ اور حالی نے اپنی شاعری کے ذریعہ فلسفہ اور سائنس کا ذوق پیدا کیا۔ حالی کو وہ سرسید سے زیادہ بڑا ادیب وشاعر مانتے ہیں ان کا خیال ہے کہ ان کی تحریروں میں سماجی ترقی کی خواہش اور حب الوطنی زیادہ ابھرتی ہے۔ مسدس کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''حالی کا مسدس اردو زبان کی پہلی نظم ہے جسے ہم عظیم کہہ سکتے ہیں۔ یہ حالی کا شاہکار تھا اور اس نے اردو شاعری کے دھارے کو موڑ دیا''۔ (ص۔104)

یہی نہیں وہ غزل کے بارے میں بھی کہتے ہیں...... ''غزل کو جس پر مُردنی چھانے لگی تھی روایتی بیماری سے اچھا کر کے حقیقت نگاری کا خوبصورت لباس پہنایا......'' اور یہ بھی کہا...... ''خیال بغیر مادّے کے نہیں پیدا ہوتا ہے۔'' شبلی کے بارے میں جعفری کا خیال ہے۔

''ان کا (شبلی) سیاسی شعور سرسید اور حالی کے شعور سے کہیں آگے ہے...... انھوں نے اردو میں ایجی ٹیشنل شاعری کی بنیاد ڈالی ہے اور تنقید نگاری کو ترقی دی''۔ (ص۔105)

بحیثیت مجموعی وہ حالی اور شبلی کی غیر معمولی خدمات کا اعتراف یوں کرتے ہیں۔

''حالی اور شبلی کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پہلی بار ادب و تنقید کی بنیاد مادی حالت پر رکھی۔ انھوں نے بتایا کہ ادب مادی حالات کے مطابق اپنا چولہ بدلتا ہے اور مواد اور ہیئت دونوں میں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ شبلی نے تو تشبیہوں اور استعاروں کی تبدیلی کے مادی اسباب دریافت کرنے کی کوشش کی۔ اس اعتبار سے حالی کا مقدمہ شعر و شاعری اور شبلی کی شعر العجم بہت بڑے کارنامے ہیں اور ابھی تک اردو تنقید کی کوئی کتاب ان سے آگے بڑھنا تو درکنار ان کے قریب بھی نہیں آسکی ہے''۔ (ص۔106)

اور ساتھ میں یہ بلیغ جملہ بھی...... ''اس سلسلے میں ترقی پسند نقادوں کو بہت کچھ کام کرنا ہے اور ماضی کے بھاری پتھروں کے نیچے سے ان سرچشموں کو ڈھونڈ نکالنا ہے جن سے صدیوں تک ہماری کشتِ ادب کی آبیاری ہوئی ہے۔'' اس کے بعد اقبال آتے ہیں گفتگو کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے۔

''اقبال کی شاعری کیفیات کے اعتبار سے ان سب کی ادبی تخلیقات سے الگ ہے۔ وہ ایک نئے دور کی شاعری ہے۔ نئی آرزوؤں اور تمناؤں سے سرشار پُر امید اور حوصلہ مند، متحرک، مترنم اور رقصاں...... ابھی تک اردو زبان نے اقبال سے بڑا شاعر پیدا نہیں کیا۔ وہ ہمہ گیری اور وسعت ابھی کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی جو اقبال کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ یہ قومی تحریک آزادی کے ابتدائی اُبال کا زمانہ تھا جو اپنے سارے تضاد کو لے کر اقبال کی شاعری میں ڈھل گیا''۔ (ص۔108)

لیکن ساتھ میں وہ یہ بھی کہتے ہیں۔

''اقبال کا پیام بڑا تھا لیکن اپنے عہد کے اُلجھاؤں سے آزاد نہ ہو سکا۔ اس لیے اس شاعری میں زندگی بخش رجحانات زہریلے رجحانات کے ساتھ اس طرح پیوست ہو گئے ہیں جیسے دودھ میں پانی ملا دیا گیا ہو''۔ (ص۔109)

اگلے باب میں ''حقیقت نگاری اور رومانیت'' کے موضوع پر گفتگو کی گئی ہے جس کی ابتدا جوش کے اشعار اور گورکی کے جملوں سے ہوتی ہے۔ سردار جعفری پہلے بھی رقم کر چکے تھے لیکن یہاں حقیقت اور رومانیت کے رشتوں کو از سرِ نو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے وہ پھر کہتے ہیں ۔

''جدید اردو ادب جس کا آغاز سن ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا۔ عقل پسندی، حُب الوطنی، انسان دوستی اور سامراج دشمنی کی منزلوں سے گذرتا ہوا جب پہلی جنگ عظیم کے بعد انقلاب کے موڑ پر آیا تو اس میں بُحران پیدا ہو گیا۔ اس کی عقل پسندی پر مذہب کی پرچھائیں تھی۔ حُب الوطنی پر ماضی پرستی چھائی ہوئی تھی۔ انسان دوستی طبقاتی قدروں میں اسیر تھی اور سامراج دشمنی میں سمجھوتے بازی کی آمیزش تھی۔ انھیں زنجیروں نے انقلاب کی منزل پر جدید ادب کو جکڑ لیا''۔ (ص۔125)

اور پھر وہ ان تمام زنجیروں کا ذکر کرنے لگتے ہیں۔ اس سے علی گڈھ تحریک اور ترقی پسند تحریک کے مابین بنیادی فرق بھی واضح ہوتا ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کی تحریکات نے اس عہد کی سیاست کے ساتھ ساتھ سیاست کی حقیقت اور اقتدار کی حقیقت کو بھی واضح کر دیا اور روایتی رومانیت کو بھی پیچھے چھوڑ کر انسان کی امید، خواب اور نئے انسان اور انسانی معاشرہ کے تصورات سے جوڑ دیا جیسا کہ گورکی نے بھی کہا ہے کہ متحرک قسم کی رومانیت انسان کو زندہ رہنے کی خواہش کو تقویت پہنچاتی ہے اور بغاوت پر آمادہ کرتی ہے۔ یہ تھا رومانیت کا جدید اور سائنٹفک تصور جو راست طور پر انسانی جدوجہد سے رشتہ رکھتا ہے۔ سردار جعفری نے نہ صرف اس تصور بلکہ حالات پر بھی عالمانہ گفتگو کی ہے جو غالباً اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی گفتگو ہے۔ کسان کی بغاوت، مزدور کی تحریک نے تحریکِ آزادی میں جو ایک نئی طاقت و توانائی دی تھی اس نے نہ صرف تحریک بلکہ تفکیر کو بھی متاثر کیا۔

بقول سردار جعفری ۔

''یہ نئے طبقے جو سیاست میں شریک ہو رہے تھے زندگی اور تہذیب میں بھی اپنا حق طلب کرتے ہیں۔ شاعری اور ادب میں بھی ان کا حصہ ہے وہ اپنے ساتھ اپنی شاعری لے کر آتے تھے۔'' (ص۔125)

سردار جعفری نے یہ بھی کہا کہ ادیب ایسے موڑ پر آ گیا تھا جہاں اسے یا تو انقلاب کی طرف قدم بڑھانا تھا یا بالکل رک کر رہ جانا تھا...... ''اس موڑ پر جہاں اقبال ساتھ چھوڑنے لگے، پریم چند اور جوش ملیح آبادی نے

اردو ادب کی رہنمائی کی۔'' جعفری کا خیال ہے کہ پریم چند اور جوش دونوں قومی تحریکِ آزادی کے اُبال کی تخلیق ہیں۔ان کا ادب اس تحریک کی کمزوریوں اور سمجھوتے بازیوں کے خلاف ایک زبردست احتجاج کی حیثیت رکھتا ہے۔ پریم چند نے افسانے لکھے اور جوش نے شاعری کی۔ نثر ونظم کا جو فرق ہوا کرتا ہے وہ دونوں کے یہاں تھا جس کو جعفری نے اس طرح کہا کہ پریم چند نے حقیقت نگاری کا رُخ اختیار کیا اور جوش نے رومانی بغاوت کی۔ اس کے بعد وہ دونوں کا تجزیہ کرتے ہوئے تفصیل میں چلے جاتے ہیں اور یہ تجزیہ بھی ملتا ہے...... ''پریم چند میں طالسطائی کی روح تھی اور جوش میں شبلی کی۔'' تفصیل میں یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔

> ''پریم چند نے حقیقت نگاری کی جو بنیادیں قائم کی ہیں وہ بڑی صحت مند ہیں اور انھیں بنیادوں پر مستقبل کے اردو ادب کی عمارت کھڑی ہوگی۔ ہر بڑا ادیب اپنے عہد کے انقلابات کے کسی نہ کسی پہلو کی ترجمانی ضرور کرتا ہے اور اس اعتبار سے پریم چند کی عظمت مسلم ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کے انقلاب کے بنیادی سوال کو اپنے ادب کا مرکزی نقطہ بنایا اور وہ کسانوں کا سوال ہے جسے انھوں نے فنکارانہ انداز سے پیش کیا''۔(ص۔126)

وہ پریم چند کے تضادات کا بھی ذکر کرتے ہیں اور زبان و بیان کا لیکن اس کو ان کی حقیقت نگاری اور انسان دوستی سے جوڑ کر لاجواب قرار دیتے ہیں۔اسی انسان دوستی اور حقیقت نگاری کو آگے بڑھانے کی تلقین کرتے ہیں۔ سردار جعفری خود پوری حقیقت وجرأت کے ساتھ ان بڑے فنکاروں کے بارے میں اپنی آراء پیش کرنے میں ذرا بھی ہچکچاتے نہیں خواہ وہ اقبال ہوں یا پریم چند۔ سردار جعفری کے تجزیاتی رویے میں معروضیت ہے عقیدت نہیں۔اس سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے لیکن سردار کے علم، شعور اور تجزیاتی ذہن سے انکار ممکن نہیں۔ پریم چند کے حوالے سے ان کی یہ بھی شکایت ہے کہ اردو تنقید نے پریم چند کے سرمایۂ ادب پر اتنی توجہ نہیں دی جتنی کہ دینی چاہیے۔اسی لیے وہ بار بار ہندی اور انگریزی ادیبوں وکتابوں کا ذکر کرنے پر مجبور ہیں دو ایک مثالیں وہ احتشام حسین اور ہنس راج رہبر کے مضامین سے بھی دیتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ جس وقت یہ کتاب لکھی گئی اس وقت تک پریم چند پر کوئی معقول کتاب منظرِ عام پر نہیں آئی تھی۔قمر رئیس، مدن گوپال، یوسف سرمست وغیرہ کی کتابیں بعد کی ہیں۔اس وقت تک اردو تنقید کا محور ومرکز شاعری زیادہ تھا اس لیے سردار کے سامنے فکشن کی تفہیم وتنقید سامنے نہ ہوتے ہوئے بھی جس طرح کا تجزیہ کیا ہے اور حقیقت نگاری کے محاسن اور معائب پر جو گفتگو کی ہے وہ اپنے آپ میں غیر معمولی ہے جو سردار کے ادبی وتنقیدی وژن اور فکر ودانش کے

اعلیٰ ثبوت فراہم کرتی ہے۔ وہ پریم چند کے تنقید کو روایتی آلۂ کار سے نہیں بلکہ عالمی افکار اور انسانی اقدار کے حوالے سے جانچتے پرکھتے ہیں جن پر سردار کا پختہ یقین ہے لیکن وہ ادبی انداز کو نظر انداز نہیں کرتے۔ ذیل جملوں میں آپ کو ادبی اقدار کی جھلک ملے گی ساتھ ہی انسانی افکار کی بھی۔

''ان کی حقیقت نگاری اتنی بھرپور ہے کہ ان کی مثالیت اور تصوریت پر حاوی ہو جاتی ہے پڑھنے والا ان کی تصوریت سے کم متاثر ہوتا ہے اور حقیقت نگاری سے زیادہ۔ ان کی تحریریں ظلم اور بے انصافی سے نفرت اور آزادی کا بے پناہ جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ وہ ہمارے دل میں انسان کی عظمت اور وقار کو بڑھا دیتی ہیں''۔ (ص۔134)

ہوری کے حوالے سے کردار نگاری کے بارے میں ان کے خیالات ملاحظہ ہوں۔

''دنیا کے ادب کے لافانی کردار وہ ہیں جن کی تخلیق میں عوامی ذہن کا تخیل صرف ہوا ہے جن میں عوام کی بوباس ہے اور اردو ادب میں پہلی بار ایسے کرداروں کی تخلیق پریم چند نے کی ہے اور ہوری اس میں سب سے بڑا کردار ہے''۔ (ص۔136)

پریم چند کے تجزیے کے بعد وہ جوش ملیح آبادی کی انقلابی شاعری کا تجزیہ کرتے ہیں۔ گفتگو اس جملے سے شروع ہوتی ہے۔

''جوش کا صحیح ادبی مقام سمجھنے میں سب سے بڑی غلطی شاعر انقلاب کے لقب کی وجہ سے ہوتی ہے'' (ص۔144)

اور یہ بھی کہ...... ''انقلاب کا لفظ فکر کو غلط راستوں پر ڈال دیتا ہے''۔

اور پھر یہ بھی...... ''جوش سو فیصدی رومانی شاعر ہیں۔ ان کا انقلاب کا تصور بھی رومانی ہے''۔

اس کے بعد وہ جوش کی رومانیت پر علمی و منطقی گفتگو کرتے ہیں اور ان کی انقلابی نظموں کو بھی رومانی نظمیں کہتے ہیں ساتھ میں یہ بھی کہتے ہیں کہ آزادی کا یہ حسین تصور اور بھرپور یقین اردو شاعری میں اس سے پہلے نہیں آیا تھا اس کے بعد وہ جوش کی عقل پرستی کی بھی تعریف کرتے ہیں۔ حالانکہ کوئی اعتراض کر سکتا ہے کہ جوش کی عقل پرستی اور جذباتی رومانیت میں از خود ہلکا سا تضاد اُبھرتا ہے کہ رومانیت بہر حال جذباتیت سے ایک اندرونی رشتہ رکھتی ہے اور عقل پرستی کے آڑے آتی ہے لیکن جوش کے یہاں سردار ایسا نہیں دیکھ پاتے یا نظر انداز کر جاتے ہیں لیکن یہ ضرور کہتے ہیں کہ جوش کی عقل پرستی ان کے پیش رو تمام شعرا اور ادیبوں سے مختلف ہے اس میں وہ حالی اور اقبال سے بھی آگے نکل جاتے ہیں اور یہ کلیدی جملہ ہاتھ لگتا ہے...... ''یہ باغیانہ قسم کی عقل پرستی ہے کیونکہ پہلی بار مذہبی تصورات سے الگ اور آزاد ہوتی ہے۔''

وہ نظموں کے ذریعہ اس آزادی اور علیحدگی پر علمی وتنقیدی گفتگو کرتے ہیں لیکن اس گفتگو میں معروضیت کم عقیدت زیادہ نظر آتی ہے تاہم ان کی نظموں کے ذریعہ جو دلائل سامنے آتے ہیں ان میں اس قدر استحکام و استدلال ہے کہ بات پختہ نظر آتی ہے۔ پھر ایسے جملے بھی لکھتے ہیں ؎

''الفاظ کا اتنا بڑا جادوگر کبھی پہلے پیدا ہی نہیں ہوا......''

''جوش کی فطری منظر کشی انیس اور اقبال کی منظر کشی سے مختلف ہے......''

''نظیر سے زیادہ قریب ہیں کہ ان میں ہندوستان پہچانا جاتا ہے......''

ان سب کے باوجود سردار جوش کے یہاں کوئی ٹھوس فلسفہ تلاش نہیں کر پاتے بلکہ فکری طور پر تضاد ہی پاتے ہیں جس کے اظہار میں وہ کوئی تکلف نہیں کرتے۔ آخر میں یہ بھی کہتے ہیں ؎

''ان خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود ان کی شاعری کا مجموعی اثر بہت اچھا ہے۔ یہ جوش کا کارنامہ ہے جس نے ایک نسل کو متاثر کیا ہے اور انھیں اپنے دور کا سب سے بڑا اور مقبول شاعر بنا دیا ہے۔ ترقی پسند شاعر جوش کے اس رویئے کو لے کر ہی شاعری کر رہے ہیں''۔ (ص۔166)

اس کے بعد چند سطروں میں وہ حسرت موہانی، علی عباس حسینی، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری وغیرہ پر تبصرہ کرتے ہیں۔ چند جملوں میں ہی تجزیہ کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ یہ جملے دیکھئے ؎

''علی عباس حسینی کا فن پریم چند کے باغ کا پھول ہے''۔

''حسرت کا اصلی سرمایہ ان کی عشقیہ شاعری ہی ہے جو ارضی اور جسمانی ہے اور پاکیزہ ہے''۔

''وہ (فراق) بنیادی طور پر حسن کی جسمانیت اور عشق کی نفسیاتی باریکیوں کے شاعر ہیں''۔

''اختر شیرانی نے اردو شاعری کو گوشت پوست کی عورت، معشوقہ اور محبوبہ تخلیق کیا ہے''۔

''اردو تنقید کی مادی اور علمی بنیادیں قائم کرنے میں انھوں نے (مجنوں گورکھپوری) بہت بڑا حصہ لیا اور آج ترقی پسند تنقید ان کی مرہونِ منت ہے''۔

''غالب کے بعد حالی اور شبلی نے اردو نثر کو جتنا سہل اور سلیس بنا دیا تھا نیاز فتح پوری نے ان کے بعد اسے اتنا ہی مشکل اور نا قابلِ فہم بنا دیا''۔

ان جملوں بلکہ فیصلوں کی حقیقت پر بحث ہو سکتی ہے لیکن سردار جعفری کے تجزیاتی ذہن اور جرأت مندانہ قلم سے انکار کی گنجائش کم سے کم ہے۔ سردار جعفری نے فراق کی تنقید کے بارے کہا ہے کہ وہ تنقید لکھتے

ہوئے بھی شاعر بنے رہتے ہیں تو کوئی یہ الزام سردار جعفری پر بھی لگا سکتا ہے لیکن پھر بھی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ تاثراتی تنقید کی راہ اپناتے ہوئے سردار کے تاثر میں علم وفکر، منطق واستدلال کے عناصر اسقدر کثرت سے ہوتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے مخالف نظریہ کے لوگ بھی قائل ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

یہ وہ شاعر وادیب تھے جو سردار جعفری سے سینئر تھے لیکن سردار نے ان سب کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا یہاں تک کہ اقبال اور جوش کی کمیوں کی طرف بھی اشارہ کیے بغیر نہیں رہ سکے جبکہ اُس وقت اُن دونوں شاعروں کا طوطی بول رہا تھا۔ اسے آپ سردار کی حق گوئی یا تنقید کی ایمانداری کہہ سکتے ہیں جس کی ابتدا مجنوں گورکھپوری اور احتشام حسین کر چکے تھے لیکن سردار کی نگاہ نقاد کے ساتھ ساتھ ایک فنکار اور تخلیق کار کی بھی ہے جس کو ان کے تنقیدی عمل سے الگ کر پانا ممکن نہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ اسی نے ایک مخصوص تنقیدی و تجزیاتی اسلوب دیا تو غلط نہ ہوگا اور یہی سردار کی شناخت ہے۔

پانچویں باب میں راست طور پر ترقی پسند مصنفین کی تحریک کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ ابتدا تعارف، مقصد اور عمل پر گفتگو کی گئی ہے اس کے بعد اس کے کارنامے اور نتائج برآمد کیے گئے ہیں۔ مثلاً تحریک نے عوامی ادب کو از سر نو زندہ کیا۔ کسان، مزدور کے شعور کو انقلابی جدو جہد نے بیدار کیا احتجاج کی لہر تیز ہوئی۔ ترجمے کا کام بڑھا جس کے ذریعہ گورکی، ٹالسٹائی، قاضی نذرالاسلام، ٹیگور وغیرہ پڑھے گئے۔ ناول، افسانے کے ترجمے کیے جانے لگے۔ ماحول بدلا، نظریہ بدلا تو ایک کارواں بنا۔ کچھ لوگ کارواں کے خلاف بھی گئے۔ مخالفت بھی ہوئی کہ ان کو ادیبوں کی اجتماعی کوششوں سے خطرہ تھا اور پھر مخالفت کی کہانی، سامراج وادیوں اور قدامت پرستوں کا ردِ عمل، تحریک پر طرح طرح کے الزامات لگے لیکن بقول جعفری......

''ترقی پسند تحریک بڑی تیزی سے پھیلی اور سامراجی رجعت پرستوں اور سامنتی قدامت پسندوں کی تمام مخالفتوں اور بدنام کرنے کی سازشوں کے باوجود دنیا پر چھا گئی......'' (ص۔ 191)

لیکن یہ بھی اعتراف کہ تنظیم کمزور رہی لیکن اس کمزوری کے باوجود تحریک نے ادب اور نئی شاعری کے ذریعہ نئے عوامی انقلابی خیالات کو لے کر آگے بڑھتی رہی اور روایتی ادب کی شعریات اور جمالیات کو بدلتی رہی۔ درمیان میں وہ حلقۂ ارباب ذوق کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ نیا ادب اور ترقی پسند ادب کے درمیان جو خلط ملط ہوا اور اس سے جو خلط مبحث ہوا اُس نے گڑبڑی پیدا کی لیکن احتشام حسین، ممتاز حسین وغیرہ کے مضامین نے ان غلطیوں کو صاف کرنے کی کوشش کی جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے۔ ۱۹۴۵ء کی

حیدرآباد کانفرنس میں سجاد ظہیر نے واضح طور پر کہا...... ''ہمیں ہر ادیب پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالنی چاہئے اور کھوٹے اور کھرے کو الگ الگ کرنا چاہیے''۔

احتشام حسین نے بھی واضح طور پر کہا...... ''ترقی پسند ادب نیا ادب ضرور ہے لیکن سارا نیا ادب ترقی پسند ادب نہیں ہے۔'' اس ضمن میں سردار ممتاز حسین، عزیز احمد وغیرہ کا ذکر بھی کرتے ہیں اور بعد میں خود اپنے ہم عصروں کے بارے میں چند جملوں میں نتیجہ برآمد کرتے ہیں۔ مثلاً ؎

''منٹو کے یہاں جنس کا طلسم جس میں ان کا شعور چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے حد درجہ مریضانہ ہے۔ جنس نے منٹو کے یہاں مذہب کی جگہ لے لی ہے''۔

''راشد نے مغلق اور نامانوس ترکیبوں کا سہارا لے کر نظم کا ذہنی وژن بڑھانا چاہا'' وہ راست طور پر ترقی پسند ادیبوں، شاعروں پر تنقید کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے لیکن اس کا جواز بھی پیش کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

''سماج کی گندگی اور اس کے زہریلے اثرات سے بچنا آسان کام نہیں ہے۔ ترقی پسند ادیب اسی سماج میں پیدا ہوئے تھے اور اسے بدلنے کی کوشش کررہے تھے جس کے صدیوں کے جاگیرداری انحطاط اور انتشار میں سامراجی نظریات نے اپنا زہر گھول دیا تھا اس لیے بعض فرسودہ قدریں، بعض غلط نظریات، بعض انحطاطی اثرات خود ترقی پسند ادیبوں کی تحریروں میں جھلک آئے تھے''۔ (ص۔ 199)

بہر حال ان گڈمڈ صورتوں کے باوجود گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ بقول جعفری ؎

''ترقی پسند ادب کا کارواں ان پُر پیچ راہوں سے گذرتا ہوا آگے بڑھتا گیا اور نظریاتی صفائی' معنوی گہرائی اور جذباتی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ دراصل یہ سفر رومانیت سے حقیقت نگاری کی طرف تھا جو ترقی پسند تحریک کا لازمی رجحان تھا''۔ (ص۔ 210)

فوراً ہی 1947ء کے فسادات سامنے آئے۔ ملک آزاد تو ہوا لیکن ساتھ ہی تقسیم بھی ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ ان بڑے المناک حادثے نے ایک بار پھر شعر و ادب کی صورت ہی بدل کر رکھ دی۔ ایسے کربناک حالات میں انحطاط پسندوں نے تو جنس میں پناہ لینی چاہی اور اسے فرائڈ کی تحلیل نفسی کے ذریعہ عوام کی شدت پسند جبلت سے جوڑا اور جنسی گھٹن کا نتیجہ قرار دیا۔ کچھ پست ذہنیت کے لوگوں نے ان فسادات کا خیر مقدم کیا اور خونریزی کو اس خون سے تعبیر کیا جو بچے کی ولادت کے وقت ماں کے رحم سے جاری ہوتا ہے۔ کچھ اور لوگوں نے اور بھی کہا

لیکن ترقی پسند ادیبوں کے لیے یہ ایک سخت امتحان کا وقت تھا۔ انھوں نے پوری سنجیدگی اور وابستگی کے ساتھ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں شمع جلانے کی کوشش کی۔ جعفری نے یہ بھی لکھا۔

''اس موقع پر ترقی پسند ادیبوں نے جو کچھ لکھا اس میں سب سے زیادہ بلند درجہ کرشن چندر کی کہانیوں کو شامل ہے جن میں میرے نزدیک سب سے اچھی کہانی ''پیشاور ایکسپریس'' ہے۔ احمد عباس کی کہانی ''جتا'' اور عصمت کی کہانی ''جڑیں'' بھی اس سلسلے کی اہم اور اچھی کہانیاں ہیں''۔ (ص۔ 203)

اس کے بعد وہ ان ادیبوں کا ذکر سخت انداز میں کرتے ہیں جو حکومت کے وفادار ہو جاتے ہیں اور اس وفاداری کو حُب الوطنی اور ترقی پسندی کا نام دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ زبان کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ترقی پسندوں نے اسے بھی سماجی اور سیاسی تناظر میں دیکھا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ......

''نہ ہندی سارے ہندوستان کی زبان ہے اور نہ اردو سارے پاکستان کی زبان ہے۔ ہر زبان کو اپنے علاقہ میں پوری طرح پھلنے پھولنے کا موقع ملنا چاہیے اور ان کے بولنے والوں کو اس کا حق ہونا چاہئے کہ وہ اپنا سارا تہذیبی، سماجی اور سیاسی کاروبار اپنی اپنی زبانوں میں چلائیں''۔ (ص۔ 205)

ترقی پسندوں نے خود اختیاری کی صورت پر زور دیا جس سے باہمی ربط وضبط اور محبت میں اضافہ ہوگا لیکن حلقۂ ترقی پسندی سے باہر یہ خیال عصبیت اور فرقہ پرستی کے ساتھ عام ہو رہے تھے لیکن ترقی پسندوں نے اسے عوامی نقطۂ نظر سے عام کرنے کی کوشش کی۔ اس پر سجاد ظہیر اور رام بلاس شرما یعنی اردو اور ہندی کے تمام ترقی پسند ادیب متفق تھے اور یہ اعلان کر رہے تھے۔

''اردو اور ہندی دو الگ الگ زبانیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی زبان کے دو ادبی روپ ہیں جسے عرفِ عام میں ہندوستانی کہا جاتا ہے اور جو اس علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے جو انبالہ سے بہار تک اور دہلی سے ناگپور تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ دونوں روپ شہروں میں رائج ہیں لیکن دیہاتوں میں سمجھے جاتے ہیں۔ جہاں اردو اور ہندی زبان کی مختلف بولیاں مثلاً اودھی، برج بھاشا وغیرہ بولی جاتی ہیں۔ اردو اور ہندی کی نحوی ساخت ایک ہے۔ دونوں کی بنیاد کھڑی بولی ہے جو مدھیہ پردیش کی شورسینی اپبھرنش سے نکلی ہے''۔ (ص۔ 208)

ایک اور بلیغ بات کہی گئی کہ ''دراصل ہندی اردو کے فرق کو دور کرنے کا مسئلہ جنتا کی جہالت دور کرنے اور تہذیب وادب کو عوام تک پہنچانے کا بھی مسئلہ ہے''۔

اور اس خلیج کو بھی پاٹنے کی ضرورت ہے جو سامراجی طاقتیں بڑھاتی رہتی ہیں۔ ساتھ ہی وہ خلیج بھی جو بول چال کی زبان اور ادبی زبان کے درمیان حائل ہے۔ نیز اُس مشترکہ تہذیبی روایت کو فروغ دینے کی ضرورت ہے جس سے اردو ہندی کا فرق مٹتا ہے۔

لسانی مسائل پر گفتگو کرنے کے بعد وہ تحریک کی کمزوری پر بھی اظہار کرنے میں تکلف نہیں کرتے لیکن اس کی انتہا پسندی کو ایک فطری عمل قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد گفتگو غزل اور اعتراضات غزل پر آ جاتی ہے۔ کلیم الدین احمد، یوسف حسین خاں کے اذکار کے بعد وہ یہ کہتے ہیں کہ غزل کی مخالفت حالی یا ترقی پسندوں نے بھی کی۔ سردار جعفری مخالفین کی معصومیت اور بے خبری کی بات کرتے ہوئے اس دور کے شاہکار ترقی پسند افسانوں اور شاعری کا ذکر کرتے ہیں جس نے اس دورِ انحطاط میں شعر و ادب اور ترقی پسند ادب کی آبرو رکھی۔ ایک جگہ وہ یہ بھی کہتے ہیں ؎

> ''تنگ نظری اور انتہا پسندی سے ترقی پسند ادب کو نقصان ضرور پہنچا ہے لیکن اس کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ ہر بات غلط تھی اور سارا ترقی پسند ادب مردود تھا یہ صرف دشمنوں کا پروپگنڈہ ہے جس کی طرف سے ہوشیار رہنا چاہیے''۔ (ص۔227)

اور پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ نیا ادب اور ترقی پسند ادب کا خلط مبحث باقی نہیں رہ گیا۔ رجعت پسند اور غیر صحت مند ادب اور ترقی پسند ادب واضح طور پر پہچانے جانے لگے لیکن سختی اور تنگ نظری سے کچھ نقصان تو پہنچا ہی۔ آخر میں وہ یہ کہتے ہیں ؎

> ''ترقی پسند ادیبوں نے سیاسی اور سماجی زندگی کے اتنے پہلوؤں پر قلم اُٹھایا ہے کہ ان کی تخلیقات سے ہندوستان کی جنگ آزادی کی ہر منزل اور ہر موڑ کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ مجموعی حیثیت سے ترقی پسند ادب کا لہجہ پُر وقار جذبہ ہمت افزا اور انداز فاتحانہ ہے''۔ (ص۔234)

اگلے باب میں ''تخلیقی رجحانات'' عنوان کے تحت ترقی پسند ادب کے غالب رجحانات پر گفتگو کی گئی ہے۔ ہر چند کہ وہ ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ ''ترقی پسند ادب کا سب سے حاوی رجحان ماحول کی سخت گیری کا رہا ہے۔'' لیکن اس کے بعد وہ عشقیہ جذبے پر گفتگو کرتے ہیں اور بات ادب میں عورت کے مقام و منصب پر آ جاتی ہے۔ لکھتے ہیں ؎

> ''ترقی پسند شاعری سے پہلے اردو شاعری میں عشق تو بہت تھا لیکن عورت کا وجود برائے نام تھا۔ افسانے کی دنیا میں جس عورت نے قدم رکھا تھا وہ یا تو مصنوعی تھی یا بیحد گھٹی دبی اور بھینچی ہوئی۔ زندہ

عورت کہیں کہیں ملتی ہے جیسے پریم چند کے یہاں پھر یہ افسانوی ادب بیحد مختصر بھی تھا۔ ترقی پسند افسانہ نگاری اور شاعری میں عورت گوشت پوشت کی جیتی جاگتی عورت اپنا پورا حسن و جمال لے کر آئی وہ ماں، بہن، بیوی اور محبوبہ بن کر جلوہ گر ہوئی''۔ (ص۔238)

اس سلسلے میں وہ جوش و اقبال کو بھی معتوب کرتے ہوئے اختر شیرانی کو سراہتے ہیں لیکن یہ بھی کہ وہ حقیقی محبوبہ کو پیش کرنے کے باوجود پردے میں ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ عورت کو اصلاً آزادی، عزت اور حیثیت ترقی پسند شاعروں اور افسانہ نگاروں نے دی اور اس کی آزادی کا بھی مطالبہ کیا اور یہ جملہ لکھتے ہیں کہ ''ترقی پسندوں نے عشق کو فطری، خوبصورت اور جاندار بنایا اور ادب میں نئی سچائیاں اور لطافتیں پیدا کیں''۔

اس کے بعد وہ اس کی تفصیل میں چلے جاتے ہیں اور عشق و انقلاب کے رشتوں پر گفتگو کرتے ہیں۔ فیض، مجاز سے مثالیں پیش کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ کرشن چندر اور منٹو کی کہانیوں کے فرق کو بھی پیش کرتے چلتے ہیں جن میں اکثر ان کی ذاتی پسند حمایت اور مخالفت کے آثار جھانکنے لگتے ہیں۔ منٹو کے سلسلے میں بطور خاص ترقی پسندوں نے جو عشق۔ معشوق اور محبت کے تصورات پیش کیے وہ فطری تھے اور عملی بھی اور زندگی و زمین سے جُڑے ہوئے بھی۔ یہاں محض خیال اور رومان یا جاگیردارانہ احساس نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند ادب میں عورت اپنے آنچل کو پرچم بناتی نظر آتی ہے۔ ترقی پسند محبت گھٹیا محبت سے بہر حال مختلف ہوا کرتی ہے۔ وہ محبت کے ساتھ ساتھ زندگی کی جدوجہد میں بھی برابر سے شریک ہوتی ہے۔ وہ اپنی محبت کے لیے سب کچھ قربان کرسکتی ہے تو اس سے کنارہ کش بھی ہوسکتی ہے کیونکہ اس کی محبت میں صرف اس کا اعصاب نہیں بلکہ دل بھی شامل ہے اور ترقی پسند عورت کا دل پاک ہے۔ ترقی پسند ادیب عورت کو صرف وسیلۂ محبت ہی نہیں بلکہ سماجی، معاشی آزادی کے حوالے سے بھی دیکھتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ جب تک عورت کو آزادی اور حق نہیں ملے گا عشق اور حسن دونوں بیمار رہیں گے۔

اردو شاعری میں عورت و محبوب کے کردار پر بیحد روشنائی اور تخلیقی قوت خرچ کی گئی ہے لیکن اب تک محض اس کی صورت پر، اس کی حیثیت اور حقیقت پر نہیں۔ ترقی پسند ادب میں پہلی بار اور غالباً سردار جعفری نے پہلی بار اپنی کتاب میں ترقی پسند رجحانات کے حوالے سے عورت کی اصل انسانی و اخلاقی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔ عورت کو نہ صرف ایک انسان کے روپ میں دیکھا ہے بلکہ اسے ہم سفر اور ہم نظر بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس ہم سفری میں بنیادی جذبہ عشق تو ہے ہی ساتھ ہی ایک دوست اور ہم نظر کا رویّہ بھی ہے۔ اس لیے کہ وہ

عورت کے ذریعہ زندگی میں حسن تلاش کررہے تھے اور اگر زندگی میں حسن نہیں ہے تو محض عورت کا حسن کافی نہیں ہے۔ اس لیے ترقی پسند شاعری میں عورت کے عنوان سے کئی نظمیں ملتی ہیں اور اس کے مرتبہ کو بلند کرتی ہیں ورنہ عورت کے تعلق سے تو سرسید، حالی، اقبال اور جوش کا بھی نظریہ صاف نہیں ہے۔ سردار جعفری نے نہایت بے باکی اور حقیقت پسندی کے ساتھ پہلی بار کھلے ذہن کے ساتھ عورت کی عظمت کا اظہار کیا اور ترقی پسند شاعری میں اس کے تصور پر علمی و منطقی گفتگو کی جس میں کبھی کبھی حمایتانہ انداز ضرور ملتا ہے لیکن حقیقت پسندانہ بھی، اس سے انکار ممکن نہیں۔ خود سردار جعفری اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں ۔

جب تلک تو خود نہ توڑے گی طلسمِ رنگ و بو
تیری قسمت ایک عورت کے سوا کچھ بھی نہیں

اس مقام پر وہ بڑے پتے کی بات کہتے ہیں ۔

''تبدیلی کی خواہش جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہیں باہر سے نہیں آتی بلکہ اپنے زمانے کی حقیقت اور اس کے پوشیدہ امکانات سمجھنے سے آتی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ادیب اور آرٹسٹ حقیقت کو جتنی اچھی طرح سمجھیں گے اُن کا فن اتنا ہی نکھرے گا''۔ (ص۔245)

اور پھر آئندہ اوراق میں حقیقت اور رومانیت پر گفتگو ملتی ہے۔ حقیقت کی قسمیں، رومانیت کی قسمیں، اس کی پرتیں، جہتیں اور ان سب کا باہم اشتراک --- لیکن ان سب پر حاوی ہے صحت مند رومانیت جو اصلاً انقلابی رنگ رکھتی ہے اور اس انقلاب یعنی ماحول کو بدلنے کے بھی کئی رنگ ہیں یعنی تبدیلی کی بھی کئی جہتیں ہوتی ہیں جو الگ الگ انداز سے الگ الگ قسم کے شاعروں کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ کچھ ادیب یہ سمجھتے ہیں کہ حقیقت جتنی پوشیدہ رہے تو بہتر ہے ضرورت سے زیادہ اظہار ادب کو جانبدار بنا دیتا ہے تو اس کا جواب جعفری یہ دیتے ہیں ۔

''اس منطق کے مطابق صرف حقیقت کی تصویر کشی کافی نہیں ہے۔ اس دلیل کی کمزوری یہ ہے کہ یہ نیم حقیقت کے نظریہ کی حامی ہے۔ یہ صرف تاریک اور غمناک پہلوؤں کی عکاسی کرسکتی ہے...... اگر آرٹ کا کام صرف حقیقت کی تصویر کشی کرنا ہے تو پھر اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کیونکہ حقیقت موجود ہے اور اپنی تصویر کشی کی محتاج نہیں ہے۔ اس میں ادیب کا شعوری عمل ختم ہوجاتا ہے...... جب تک آرٹ بھوکوں اور غلاموں کو بھوک اور غلامی سے نکلنے کا راستہ نہیں دکھاتا تب تک وہ

ان کے لئے قابلِ اعتبار نہ ہوگا۔ یہاں آرٹسٹ کو صرف حقیقت کے مظاہر پر اکتفا کرنے کے بجائے ان کی تہوں کو ٹٹولنا پڑتا ہے اور کیوں اور کیسے کا جواب دینا پڑتا ہے اور جیسے ہی ادیب یا آرٹسٹ جواب دینے کی کوشش کرتا ہے مستقبل اس کے سامنے بے نقاب ہو جاتا ہے''۔ (ص۔249)

اسی طرح وہ مزید آرٹ، استعاروں، ہیئتوں وغیرہ پر استدلال کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں جن سے اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے لیکن اس سے زیادہ اتفاق کی۔ جعفری کا کمالِ نقد یہ ہے کہ وہ کوئی گفتگو منطق و دلیل کے بغیر نہیں کرتے اور یہ بھی کہ ایک قدم بھی اِدھر اُدھر نہیں بھٹکتے یہ ان کی تحریر و تفکیر کی خوبی ہو سکتی ہے اور کچھ لوگ اس میں سختی پا کر خرابی بھی کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنی کتاب اردو میں ''ترقی پسند ادبی تحریک'' میں لکھتے ہیں ۔

''ذات اور شخصیت کوئی بنی بنائی چیز نہیں ہے بالخصوص ادب اور فن میں اس کی پرورش اور پرداخت کرنی پڑتی ہے اور اس کا عرفان حاصل کرنے کے لیے بھٹی میں تپنا پڑتا ہے۔ اس راستے سے صحیح سلامت وہی لوگ گذرتے ہیں جو اپنے مطالعے اور غور و فکر سے سمتوں کے پیچ و خم کو سمجھنے کی کوشش کریں اور آدابِ رہروی سے آگاہی حاصل کریں ۔ جعفری نے ترقی پسندوں کے مسلک کو اپنایا...... مگر ترقی پسندی صحیح معنوں میں کیا ہے اس کے خارجی پیمانے کہاں سے دستیاب ہوں گے اس کی کوشش انھوں نے نہیں کی...... خود اپنی ذات کے چوکھٹے سے نکال کر کائنات کی پہنائیوں میں رکھنے کی کوشش کرے۔ خود اپنی ذات کو ہی کُل کائنات اور اپنی سطح کو ہی اعلیٰ سمجھنے کے فریب میں نہ مبتلا ہو۔ مگر جعفری کی ساری ذہانت و فطانت اس بات میں صرف ہوئی کہ اپنی شاعری کو پہلے ترقی پسند فرض کریں اور اسی کو صحیح معنوں میں ترقی پسندی کا نمونہ مانیں''۔ (ص۔326)

خلیل الرحمٰن اعظمی کے ان اعتراضات کے جوابات دیے جا چکے ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں، یہاں میں خود سردار جعفری کی چند سطریں پیش کر کے گفتگو کو آگے بڑھاؤں گا۔ ''ترقی پسند ادب'' کے حرفِ اوّل میں وہ صاف طور پر لکھتے ہیں ۔

''حقیقتاً میں نے نقاد کے فرائض انجام نہیں دیے ہیں کیونکہ مجھے نقاد ہونے کا دعویٰ نہیں ہے۔ میں نے خود ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے اس تحریک کے بارے میں جو کچھ محسوس کیا ہے جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے اور جس سے میرا شروع سے بہت قریبی تعلق رہا ہے اس کو کاغذ پر منتقل کر دیا ہے''۔

سچ یہ ہے کہ سردار جعفری نے اس کتاب میں مجموعی تصور تنقید پر کم ترقی پسند تصور ادب وتنقید پر زیادہ گفتگو کی ہے اور تحریک کے اغراض و مقاصد اور تصورات ونظریات کو ہی پیش نظر رکھا ہے اس کو اسی تناظر میں لینے کی ضرورت ہے۔ اس سیاق وسباق میں وہ صاف طور پر کہتے ہیں کہ ادیب کا کام ہے کہ وہ حقیقت میں مداخلت کرے بلکہ مداخلت سے بھی آگے، حقیقت سے دست وگریباں ہو کہ اس کے بغیر ادب وادیب اپنی مکمل ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا کیونکہ ان کا یقین ہے کہ ترقی پسند ادیب وشاعر ادب میں حقیقت کو از سرِ نو تخلیق کرتے ہیں بلکہ مستقبل کی تعمیر میں معاون بھی ہوتے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ ہیئت پرستی، اشارے کنایے، تخلیق کو ابہام کی طرف لے جاتے ہیں۔ کمزور ادیب یہ سمجھتے ہیں کہ وہ فن کی قدروں کو چھو رہے ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ایسی پرواز ہیئت پرستی کی فضاؤں میں اسیر ہو جاتی ہے۔ یہ رویہ گریز کا ہے۔ جعفری ایسے درمیانی رویئے کی وکالت کرتے ہیں جس میں گہری سماجی بصیرت ہو اور فنی شعور بھی۔ ایسی کئی نظموں کے وہ حوالے بھی دیتے ہیں جہاں فکر وفن کا حسین امتزاج ہوا ہے۔ اور پھر وہ حتمی نوعیت کی بات کرتے ہیں۔

> ''حقیقت پسندی کے سوا آرٹ اور ادب کو پرکھنے کی اور کوئی کسوٹی نہیں ہے۔ آپ چاہے جتنے خوبصورت الفاظ استعمال کریں، چاہے جتنے مترنم فقرے اور مصرعے لکھیں، چاہے جتنی اچھی تراش خراش کے ساتھ عبارت آرائی کریں وہ اس وقت دل پر اثر نہیں کرے گی جب تک وہ کسی حقیقت اور سچائی کی ترجمان نہ ہوگی''۔ (ص۔252)

اسی خیال کو وہ مزید تفصیل میں جا کر پیش کرتے ہیں لیکن بار بار وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حقیقت کا جان لینا ہی کافی نہیں ہے اس کو ادب اور آرٹ میں منتقل کرنے کی صلاحیت بھی ضروری ہے۔ دونوں چیزیں لازم وملزوم ہیں اور پھر وہ دلچسپ انداز میں حقیقت اور فن کے رشتوں پر بات کرتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح کے جملے بھی نکلتے ہیں۔

> ''حقیقت نگاری کے لیے ضروری ہے کہ اپنے عہد کی نمائندہ حقیقت کو نمائندہ کرداروں کی شکل میں پیش کیا جائے''۔
>
> ''حقیقت نگاری کے لیے ایک صحیح زاویۂ نگاہ کی بھی ضرورت ہے جو سماجی شعور سے پیدا ہوتا ہے''۔
>
> ''انقلابی حقیقت نگاری کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ادب کا ہیرو وہی ہے جو سماج اور زندگی کا ہیرو ہے''۔
>
> ''دنیا کا بہترین ادب ہمیشہ عوامی رہا ہے۔ عوامی قدروں کے بغیر بہترین ادب کی تخلیق نہیں ہوسکتی''۔

وقت کی تبدیلی، مزاج و مذاق کی تبدیلی ادب کے جوہر اور آلۂ جوہر میں تبدیلی لاتی ہے۔ نئے اقدار نئے معیار قائم کرتے ہیں۔ غزل جیسی روایتی صنف میں تشبیہیں واستعارے تک بدل جاتے ہیں۔ ترقی پسند شعراُ نے یہ تبدیلی کر کے دکھائی اور عوام سے بھی جوڑا۔ خواص کے لیے بھی لکھا لیکن مقصد ایک ہی رہا۔ بعد میں وہ ترقی پسند ادیبوں کا تجزیہ کرتے ہیں کہ وہ کس قدر عوام اور عوامی زندگی سے وابستہ ہیں۔ ایک جگہ تو صاف طور پر یہ کہتے ہیں...... ''ترقی پسند ادیب تمام وعدوں کے باوجود عوامی زندگی سے اتنے قریب نہیں ہیں جیسا کہ ہونا چاہیے۔ انھوں نے سیاسی طور پر انھیں سمجھا لیکن سماجی طور سے سمجھنا ابھی باقی ہے۔

حرفِ آخر میں اعتراف عجز ہے اور یہ وضاحت ؎

''میں نے ترقی پسند تحریک اور اس کے رجحانات کا جائزہ ماوی، تاریخی اور سماجیاتی (عمرانی) نقطۂ نظر سے لیا ہے۔ یہ نقطۂ نظر میرے لیے عقیدت کے بجائے سائنس کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ادب کے لیے خارجی کسوٹی ضروری ہے۔ ممکن ہے کہ بعض حضرات کے لیے میرا نقطۂ نظر قابلِ قبول نہ ہو اور وہ ترقی پسند ادب اور تحریک کا جائزہ کسی دوسرے نقطۂ نظر سے لیں اس طرح نہ محض یہ کہ ادب اور تحریک کے مختلف پہلو اجاگر ہوں گے بلکہ مجموعی طور سے پوری تحریک کو باہمی مباحثہ اور تبادلۂ خیال سے ایک صحیح نقطۂ نظر اختیار کرنے میں آسانی ہوگی...... نقطۂ نظر جتنا حقیقت پسند ہوگا اتنا صحیح ہوگا''۔ (ص۔272)

ترقی پسند ادب 1950 سے قبل لکھی گئی اس وقت سردار جعفری کا ذہن ضرورت سے زیادہ اشتراکیت کی طرف مائل تھا لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا گیا وہ کمیونسٹ پارٹی سے بھی علیحدہ ہوئے۔ فکر و خیال میں توازن آیا اور وہ تصوف، تہذیب اور ثقافت کی طرف مائل ہوتے گئے۔ اسی درمیان انھوں نے کبیر، میرا، میر، غالب وغیرہ کو نہ صرف نئے سرے سے مطالعہ کیا بلکہ ان کے دواوین کو مرتب بھی کیا۔ مقدمے لکھے اور بعد میں ان مقدموں کو یکجا کر کے پیغمبرانِ سخن کے عنوان سے شائع بھی کیا (1970)۔ ان مقدموں میں اور بعد کی تحریروں میں ایک نئے سردار جعفری نظر آتے ہیں جہاں تصوف، تہذیب اور ہندوستان کی اصل معاشرت وثقافت بولتی نظر آتی ہے جو اشتراکیت سے قدرے مختلف ہے۔ کبیر داس سے متعلق یہ خیالات دیکھیے ؎

''جس وقت شمالی ہندوستان میں کھڑی بولی بالغ ہو کر زبان کی شکل اختیار کر رہی تھی اور اردو، ہندی دونوں زبانیں اپنی طفولیت سے گزر رہی تھیں اس وقت ان کو ایک ترقی یافتہ آریائی زبان فارسی سے

سابقہ پڑا۔ جس کے پاس کئی سو برس کی فکر اور شعر کا خزانہ تھا۔ فردوسی، عطار، سنائی، رومی، سعدی، خیام اور حافظ گزر چکے تھے اور ان کے شعر و فکر کا تابناک پرتو ایک طرف تو یورپ پر پڑ رہا تھا جس نے انیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے گوئٹے کو متاثر کیا اور دوسری طرف ہندوستان اور ایشیا کو نئی روشنی دے رہا تھا۔ اس کے زیرِ اثر ہندی زبان نے اپنا نام حاصل کیا اور اردو زبان نے اپنا خوبصورت مزاج جس میں ہندوستانی برہمن کی ٹھوس فکر کے ساتھ ایرانی ذہن کی تتلی کی سی بے تابی شامل ہے۔ علمی حلقوں میں اس حقیقت کا اعتراف بار بار کیا گیا ہے کہ کبیر داس کی عظمت ہندو بھگتی اور مسلم تصوف کے امتزاج کا نتیجہ ہے اور یہ امتزاج نہایت خوبصورت ہے"۔ (دیباچہ)

ان کا خیال ہے کہ عظیم ادب کی جڑیں اس عہد کی زمین میں پیوست ہوتی ہیں لیکن پھل اور پھول عہد کی حدوں کو توڑ کر نکل جاتے ہیں۔ وہ پھل کو محسوس کرنے کے بعد ان کی جڑوں کو بھی تلاش کرتے ہیں جہاں سے شاعر کے چشمے پھوٹتے ہیں چنانچہ کبیر پر بات کرتے وقت وہ جس طرح بھگتی تصوف اور خود کبیر کی خاندانی زندگی' جولاہوں اور کوریوں کی ذات پات ان کا پھیلاؤ اس طرح پیش کرتے چلے جاتے ہیں جس سے صرف ان کا علم ہی نہیں بلکہ انسانوں کے تئیں ان کی محبت و قربت کا صاف پتہ چلتا ہے۔ ہندوستان کی سیاسی، سماجی صورتِ حال اور اس کے بطن سے کبیر کا جنم، رامانند کی شاگردی، فاقہ مستی، انسان دوستی نے کبیر کے تصوف کو جس بلند مقام پر پہنچا دیا تھا وہ سردار جعفری کے مطابق کئی بھگتوں، صوفیوں شاعروں کی ایک آواز بن کر ابھرتا ہے وہ اس آواز کو کہاں کہاں سے ملاتے ہیں ملاحظہ کیجیے......

"بعض مقامات پر منصور کی اناالحق کی گونج کے علاوہ...... کبیر کی تعلیمات پر رومی کے تصورات کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے، جسے انھوں نے ہندو بھگتی کے انداز سے پیش کیا ہے وہی جاہ و جلال، وہی بیتابی اور بے قراری جو رومی کی غزلوں کی خصوصیت ہے، کبیر کی شاعری کا جزوِ اعظم ہے۔ ہندو بھگتی کبیر کو مقام فنا کی سیر کراتی ہے، جہاں عجز و انکسار، خضوع و خشوع ہے اور مسلم تصوف مقام بقا پر پہنچاتا ہے جہاں قوت، عظمت، جلال و جمال، بے باکی اور بلند آہنگی کے ڈنکے بج رہے ہیں"۔ (ص۔ 30-29)

کچھ دیر سردار جعفری بھگتی اور تصوف کا امتزاج کرتے ہیں اور سوال قائم کرتے ہیں بھگتی کے انتر گیان کا تصوف کے وجدان سے کیا تعلق ہے لکھتے ہیں۔

''ایران کے صوفی شعراء عطار، رومی اور حافظ کی فکر نے ہندوستان کی فکر کو جس حد تک متاثر کیا ہے ان کے درمیان کتنی مشترک قدریں ہیں اور اثرات کی یہ بہتی ہوئی گنگا جمنا کبیر کی شاعری میں حسین سنگم حاصل کرتی ہے''۔ (ص۔15)

کبیر کی شاعری اور تعلیم کا بنیادی مقصد انسانی محبت ہے جو مذہب کی تفریق اور ذاتیات کے جھگڑوں سے پاک ہے۔اس کے بعد جعفری کبیر کے عہد اور تاریخ پر گفتگو کرتے ہیں بھگتی کی تاریخ پر سرسری روشنی ڈالتے ہیں۔ بودھ مذہب کے عروج وزوال کا ذکر کرتے ہیں اسلام کا تذکرہ بھی آتا ہے اس کے بعد ان کا یہ خیال ہے کہ عام انسانوں کے لیے آخری پناہ گاہیں بھگتی اور تصوف کی پریم نگریاں بن گئیں اور اُن دونوں خداپرست اور انسانیت دوست تحریکوں کا حسین امتزاج کبیر داس اور ان کی شاعری کی شکل میں ظاہر ہوا۔ بھگتوں اور صوفیوں نے اپنی غریبی اور مفلسی کو ترک دنیا سے رشتہ استوار کر کے اسے انقلابی بنا دیا اور عوام کا بھرپور ساتھ دیا اور سارے دکھاوے، ظاہری مذہب، پنڈت مولوی وغیرہ کی کھلی مخالفت کی۔ ذات پات، اونچ نیچ کی بھی سخت مخالفت کی اور کہا انسان اور کائنات سب مٹی ہے اور گوبند کی شکتی، مایا اس کو بناتی بگاڑتی رہتی ہے۔ ہمارا جسم ایک مٹی کا مندر ہے جس میں ہم نے گیان دھیان کا دیپک جلا رکھا ہے اور سانس کا اُجالا ہے جس سے سارا جگ دکھائی دیتا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

''اس مٹی کی دنیا کا جس کی ذمہ داریوں اور فرائض سے سبکدوش ہونا نجات کے لیے ضروری ہے۔ کبیر کے یہاں پورا احساس ہے اور غالباً بھگتی کا کوئی دوسرا شاعر اس شعور اور احساس میں کبیر کے قریب نہیں پہنچتا۔ اسلام میں انسان کی ذمہ داریاں دو حصّوں میں تقسیم کی گئی ہیں۔ ایک حق اللہ کا ہے اور دوسرا بندوں کا حق ہے۔ کبیر نے دونوں حقوق کا ذکر کیا ہے ؎

سرگن کی سیوا کرو نرگن کا کرو گیان
نرگن سرگن کے پرے تہیں ہمارا دھیان (ص۔23)

ان کی صوفیانہ شخصیت کے بارے میں بھی لکھتے ہیں ؎

''کبیر داس ایک مسلمان صوفی تھے جو ہندو بھگتی کی زبان میں بات کر رہے تھے چونکہ انھوں نے اپنے آپ کو بار بار جولاہا کہا ہے اس لیے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اسلام کو ترک نہیں کیا لیکن ان کی ہندوؤں کی سی تھی۔ ماتھے پر تلک لگاتے تھے اور جسم پر جنیو پہنتے تھے اور پھر

جرأت اتنی تھی کہ برہمنوں پر طنز کرتے تھے۔ ہندوستان کی پوری تاریخ میں اتحاد کے اتنے خوبصورت اور جذباتی مظہر کی مثال نہیں ہے''۔ (ص۔24)

کبیران پڑھ تھے۔ انھوں نے رامانند کو اپنا گرو تسلیم کیا ہے لیکن انھوں نے صوفیوں کی صحبت میں بھی دن گذارے وہ ان نشستوں میں کثرت سے شریک ہوتے تھے جو مسلم صوفیوں اور ہندو سنتوں کے درمیان ہوتی تھیں اور اسرار و رموز، بیان کیے جاتے تھے۔ اسی لیے کبیر کی شخصیت اور شاعری میں ہندو بھگتی اور مسلم تصوف کا حسین سنگم ملتا ہے۔ سردار جعفری تو کبیر پر رومی کا اثر بھی دیکھتے ہیں اور رومی کے کئی شعر پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد کبیر کے دوہے بھی۔ جس کا مطلب بھی پیش کرتے ہیں۔ ایک دوہا دیکھئے ۔

ہندو کہوں تو میں نہیں موسلماں بھی ناہیں

پانچ تتو کا پوتلا گیبی کھیلے ماہیں

(میں نہ ہندو ہوں اور مسلمان میں غیب کے کھیل میں پانچ عناصر کا ایک پتلا ہوں)

ایک جگہ یوں مطلب بیان کرتے ہیں ۔

''رام رحیم الگ الگ کیسے ہوسکتے ہیں۔ ایک سونے کے سب زیور بنائے گئے ہیں۔ یہ سب ایک نماز ایک پوجا کہنے سننے کی باتیں ہیں۔ ان کو اپنے وجود سے دور کر دے۔ وہی مہادیو ہے وہی محمد جو برہما ہے۔ اسی کو آدم کہنا چاہیے''۔ (ص۔35)

ایک دوہے کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں ۔

''انگلیوں کے مضراب کے بغیر تاروں سے نغمے نکل رہے ہیں۔ عیش اور غم کا کھیل جاری ہے کبیر کہتے ہیں کہ جو کوئی اپنی زندگی کو زندگی کے سمندر میں ملا دیتا ہے اس کی روح مہا آنند میں ڈوب جاتی ہے''۔

جعفری رومی کے اشعار اور کبیر کے دوہوں کی مماثلتوں پر گفتگو کرتے ہیں اور دونوں کی جرأت و بے باکی کو مشترک مانتے ہیں جس کی مخالفتیں بھی ہوئیں لیکن ایک وقت یہ بھی آیا کہ ہندو اور مسلمان دونوں کے درمیاں وہ بیحد مقبول بھی ہوئے۔ ڈاکٹر تاراچند کا حوالہ دیتے ہیں ۔

''ڈاکٹر تاراچند کے الفاظ میں...... کبیر پہلا شخص ہے جس نے ایک مرکزی مذہب ایک بیچ کی راہ کا بے باکانہ آگے آکر اعلان کیا۔ اس کا نعرہ پورے ہندوستان میں گونج اٹھا اور سینکڑوں مقامات سے

اس کی آواز کی بازگشت سُنی گئی......کبیر کے پیروان مذہب کی تعداد اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنا کہ کبیر کا وہ اثر جو پنجاب، گجرات تک پھیل گیا اور دورِ مغلیہ میں بڑھتا گیا"۔ (ص۔42)

اور پھر اس طرح کی شاعری کے اثرات کس طرح قرون وسطی کی زندگی میں پڑے۔ خودداری اور عزت نفس کے کچھ نئے ابواب سامنے آئے اور ظالم و بدکار کے خلاف سوچ کی ایک نئی صف تیار ہوئی جو شمالی ہندوستان کے ادب میں بالخصوص سرایت کرگئی۔ گرونانک، ٹیگور میں اس کے اثرات ملتے ہی ہیں۔ وہ میر، غالب اور اقبال کی شاعری میں بھی ان صداؤں کو سنتے ہیں اور ان کا تجزیہ بھی اسی انداز سے کرتے ہیں۔ اقبال کے بارے میں تو وہ بطور خاص کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ کبیر، رومی غرض کہ تمام سنتوں، صوفیوں کی تعلیمات کی نئی تفسیر ہے جو ایک نئی انسانیت کی بشارت لیے ہیں اور اس لیے بھی کرتے ہیں کہ ہمیں آج بھی کبیر کی رہنمائی کی ضرورت ہے اس روشنی کی ضرورت ہے جو اُس صوفی سنت کے دِل میں پیدا ہوئی تھی۔

کبیر کا تجزیہ ان کے دل و دماغ کی نکلی ہوئی آواز ہے جہاں فکر پر جذبہ غالب ہے لیکن جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں جذبہ کم، فکر زیادہ کام کرنے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ میر، غالب کا تجزیہ کرتے ہیں تو صوفی اور شاعر کے فرق کے پیشِ نظر ان کی نگاہیں باریک اور دوربیں ہو جاتی ہیں لیکن زاویۂ نظر وہی ہے جو کبیر سے متعلق تھا۔

آخیر میں جعفری یہ بھی کہتے ہیں۔

"ہمیں آج بھی کبیر کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس روشنی کی ضرورت ہے جو اس سنت صوفی کے دل سے پیدا ہوتی تھی۔ آج دنیا آزاد ہورہی ہے۔ سائنس کی بے پناہ ترقی نے انسان کا اقتدار بڑھا دیا ہے صنعتوں نے اس کے دست و بازو کی قوت میں اضافہ کردیا ہے۔ انسان ستاروں پر کمندیں پھینک رہا ہے، پھر بھی حقیر ہے۔ مصیبت زدہ ہے دردمند ہے قوموں میں تقسیم ہے۔ اس کے درمیان مذہب کی دیواریں کھڑی ہوئی ہیں فرقہ وارانہ نفرتیں ہیں۔ دلوں میں اندھیرے ہیں انسان کو انسان سے دشمن بنا رہے ہیں......اس لیے اس کو ایک نئے یقین، نئے ایمان اور نئی محبت کی ضرورت ہے جو اتنی ہی پرانی ہے جتنی کبیر کی آواز اور اس کی صدائے بازگشت اس عہد کی آواز بن کر سنائی دیتی ہے"۔ (ص۔43)

سردار جعفری نے ''پیغمبرانِ سخن'' کے مقدمے 58ء اور 65ء کے درمیان لکھے اور تینوں مقدموں کو کتابی شکل میں یکجا کرتے وقت اس کا نام ''پیغمبرانِ سخن'' رکھا اور اس کے پہلے صفحہ پر لکھا، ''شاعری جزویست از پیغمبری۔'' اور کبیر، میر، غالب کو سخن کا پیغمبر قرار دیا اور اس طرح عظمتوں کی سب سے اونچی دہلیز پر پہنچا دیا۔ لیکن اس سے پہلے 51-50ء میں لکھی ہوئی کتاب ''ترقی پسند ادب'' کا لہجہ، مزاج، نظریہ قدرے مختلف ہے۔ یہ اس لئے بھی ممکن ہوا کہ دونوں کتابوں کا مزاج کئی مماثلتوں کے باوجود مختلف ہے۔ پھر یہ بھی کہ کبیر، میر، غالب شاعرانہ دنیا کی بازیافت خود ان کی شعر گوئی کے لئے ضروری ہے۔

''میرے لئے کبیر، میر، غالب شاعرانہ دنیا کی بازیافت خود میری شعر گوئی کے لئے ضروری ہے۔''

اسی لئے انھوں نے ان مقدموں میں پیشہ ور نقادوں کا سا رویہ اختیار نہیں کیا لیکن ان کی کتاب 'ترقی پسند ادب' ایک نقاد اور دانشور کے قلم سے نکلی ہوئی فکر و خیال کا نتیجہ لگتی ہے شاید اس وقت ایسی ہی ضرورت تھی جہاں ترقی پسندی ایک ضرورت تو تھی ہی اس سے زیادہ ایک بحث تھی۔ اس لئے اس کتاب میں جتنی بحثیں ہیں کم و بیش اس کتاب کو لے کر ہوئیں جس سے کم از کم یہ فائدہ تو ہوا ہی کہ کتاب ترقی پسندی کی طرح خوب مقبول ہوئی اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ...... ان دونوں کتابوں کے مابین ایک فرق یہ بھی تھا کہ ان تینوں شاعروں کی انسان دوستی، ترقی پسندی ایک فارمولے، ایک نظریہ سے زیادہ ایک جذبہ، ایک فطرت کا درجہ رکھتی تھی اور بیسویں صدی کے بیشتر فنکاروں میں بالعموم اور ترقی پسند فنکاروں میں بالخصوص ایک سوچا، سمجھا اور کبھی کبھی اوڑھا ہوا فلسفہ اور فیشن زدہ، فکر کا درجہ رکھتی تھی۔ اس لیے بحث طلب تھی اور تحقیق و توجہ طلب تھی۔ پھر بھی اس رجحان اور اس کتاب کی تاریخی حیثیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہیں پر یہ بھی خیال آتا ہے کہ انسانی پیکروں کے متلاشی ادب میں براہ راست انسانی عوامی قدروں کے حامل، زندگی اور سماج کی تبدیلی و ترقی کے ہمنوا اور ان کی تلاش و جستجو میں سرگرداں سردار جعفری کا قلم و ذہن نظیر اکبرآبادی جیسے عوامی شاعر اور میر انیس جیسے حق و صداقت پسند شاعر کے بارے میں کچھ نہیں لکھ سکا؟ اور دوسرا خیال یہ بھی کہ عوامی شاعر، ایجی ٹیشنل شاعری، انسان دوستی کی شاعری کے مدح و ذم اور نزاکتوں و لطافتوں پر خوب خوب باتیں کرنے والے شاعر و مفکر سردار جعفری کیا خود اپنی شاعری اور اس کے اسلوب کے بارے میں کوئی منفرد، عوامی اور ترسیل آمیز راہ نکال سکے؟ کیا وہ خود کبیر و میر کی راہوں پر چل سکے؟ کیا عوامی شاعری، ترقی پسندی و حقیقت پسندی کا وسیع ترین تصور پیش کر سکے جس کی وہ تعریف کرتے ہیں اور دوسرے شاعروں سے توقع بھی رکھتے ہیں۔ کیا وہ اردو کی معیار پرست

شاعری اور بالخصوص انیس، اقبال، جوش وغیرہ کے ملے جلے آہنگ واثر سے اپنے کو نکال کر اپنا کوئی شعری کردار ومذاق اور شناخت بنا سکے۔ کیا وہ اس عظیم تخلیقی ادب کو پیش کر سکے جس کے اثرات پھل پھول کی طرح عہد کی حدوں کو توڑ کر نکل جایا کرتے ہیں۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ سردار جعفری خواہ وہ نثر میں ہوں یا نظم میں، ان کا تخلیقی وتنقیدی ذہن جس طرح تہذیب انسانیت کے سر چشمے، انسانی ہاتھوں کے کرشمے، حیات وکائنات کے کارنامے، آزادی و تبدیلی، ترقی اور ان سب کے بطن سے انسانیت کے فلاح و بہبود کے راستے تلاش کرتا ہے اور تلاش کرتا ہوا جس طرح یورپ، ایران وعرب، ہندوستان کی تہذیبوں کی رنگارنگی اور اس کی وحدت کو تلاش کرتا ہوا ایک طرف حافظ، گوئٹے، اقبال وغیرہ دوسری طرف رومی، کبیر، گرونانک، ٹیگور وغیرہ، تیسری طرف پابلونرودا، ناظم حکمت، نذرالاسلام اور جوش وغیرہ کو مختلف لڑیوں میں پروتا چلا جاتا ہے......وہ سردار کی عالم انسانیت پر گہری نظر، تہذیبی یک جہتی کا ہمہ گیر مطالعہ اور دنیا کے انسانوں کی عظمت کی اصل شناخت کا زبردست مظہر بنتا ہے اور جس طرح وہ دنیا کے مظاہر، دنیا کے انقلابات اور دنیا بھر کے شاعروں اور فنکاروں کے حوالے سے اردو شاعروں کو پرکھتے اور پیش کرتے چلے جاتے ہیں وہ ان کو عام شاعروں ونقادوں کی صف سے بہت اوپر اٹھا کر ایک عظیم مفکر ودانشور کی صف میں لاکھڑا کر دیتا ہے۔ اور وہ اردو کے ترقی پسند نقادوں کی صف سے اٹھ کر اپنی تاریخی بصیرت، تہذیبی شعور اور بے مثال انسان دوستی کی سرشاری انھیں اردو کی ترقی پسند فکر ودانشوری کی عظیم روایت سے جوڑتا ہے جہاں غالب، اقبال، سجاد ظہیر، سبطِ حسن جیسے دانشور نظر آتے ہیں، جن کا دبستان فکر تمام دبستانوں سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ عظیم اور یادگار......کیا سردار جعفری کی محض یہ انفرادیت ہی انھیں ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے کافی نہیں ہے ؟

پروفیسر علی احمد فاطمی معروف نقاد' شعبہ اردو' الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ ان کی تصانیف کی ایک طویل فہرست ہے۔ جس میں ۲۸ کتابیں شامل ہیں۔ 'عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار' 'نظیر اکبر آبادی' 'تاریخی ناول فن اور اصول' 'فراق گورکھپوری فن اور شخصیت' 'علی سردار جعفری شخصیت اور فن' 'جوش ملیح آبادی نئے تناظر میں' 'نئی تنقید نئے انداز' 'تین ترقی پسند شاعر (سردار جعفری' مجروح اور کیفی)' 'ترقی پسند تحریک۔ سفر در سفر' 'سجاد ظہیر: ایک تاریخ ایک تحریک' 'فیض ایک نیا مطالعہ' 'مجاز: شخص اور شاعر' وغیرہ اور مرتب کردہ کتابوں میں 'کلیات سردار جعفری' پانچ جلدوں میں' 'بیس نئی کہانیاں' 'انتخاب مضامین شرر' وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے رپورتاژ بھی لکھے ہیں جن میں 'سفر ہے شرط' 'جزیں اور کونپلیں' 'جرمنی میں دس روز' وغیرہ ہیں۔ انھیں مختلف اداروں اور اکیڈمیوں نے انعامات واعزازت سے نوازا ہے جن میں یوپی اردو اکیڈمی' آل انڈیا میر اکیڈمی' فراق ایوارڈ اور آل انڈیا پروگریسو رائٹرس اسوسی ایشن کا 'نشانِ سجاد ظہیر' اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی دیگر علمی وتعلیمی سرگرمیوں کی فہرست بہت طویل ہے۔

علی سردار جعفری کی اقبال شناسی

پروفیسر انور معظم

اقبال ہمیشہ سے ایک انتہائی مقبول اور انتہائی نزاعی موضوع رہے ہیں۔ اقبال کو مختلف لقب دیے گئے ہیں۔ شاعر، مفکر، فلسفی، حکیم الامت، مسلم فرقہ پرست، فسطائی وغیرہ۔ یہ صرف لقب نہیں مطالعۂ اقبال کے مختلف موضوعات بھی بن گئے ہیں۔ ان پر بہت لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔ اس کی وجہ اقبال کی فکر کی تکثیر ہے۔ اقبال ان مفکرین میں سے ہیں جنہوں نے مشرق اور مغرب کے تہذیبی اور فکری مطالعے کے بعد روایت اور اس میں وقت کے ساتھ ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں ایک زاویۂ فکر تشکیل دیا۔ اس کی مدد سے اپنی علمی اور تہذیبی اقدار کے ایک نظام کو تشکیل دیا اور ان اقدار کا اپنے عہد کے مسائل پر اطلاق کیا۔ ایک ایسا نظام اقدار تشکیل دینا جو حال کو ایک بہتر مستقبل میں تبدیل کرنے کا اہل ہو ایک اعلیٰ ذہن ہی کے بس کی بات ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ مشکل کام اپنے عہد پر ان اقدار کے اطلاق کو قابلِ عمل بنانا ہے۔ تبدیلی کے دونوں نظام فکر و عمل بے حد پیچیدہ اور باہم متصادم نظریات، مفروضات اور عقائد اپنے اقدار کا ایک سلسلہ رکھتے ہیں۔ ایک مفکر جس کی فکر کا ذریعۂ اظہار اعلیٰ درجے کی شاعری ہے، اسے محسوس کرنے اور سمجھنے کے لیے مانوس اور روائتی علمی نقاطِ نظر اور تصورات کے پیمانے کام نہیں آسکتے۔ اقبال کی ہر نظم، مثنوی کی اشاعت پر ایسی تمام کوششیں ہوتی رہیں اور تحسین اقبال کو مزید نزاعی بناتی رہیں۔ اقبالی فکر کی تکثیر نے متعدد موضوعات بحث فراہم کر رکھے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کی فکری تکثیر کو دھار دار اخلاقی نوعیت دینے میں ان کے شعری وجدان اور شعری اظہار کا بہت بڑا حصہ ہے۔ (اس کے مقابلے میں نثر میں اقبال کے فکری رویے بالکل واضح اور معین ہیں)۔ یہی کیفیت ہمیں رومی اور غالب میں بھی ملتی ہے۔

اقبال ہمیشہ سے ایک انتہائی فکر انگیز مگر نزاعی موضوع رہے ہیں۔ علی سردار جعفری کو بھی اقبال کے اس پہلو دار فکری تکثیر کی بھول بھلیوں سے گزرنا پڑا۔ اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں جعفری نے اقبال پر تبصرہ کیا

ہے۔اس وقت انھیں اقبال کے طاقت، خودی اور فوق البشر جیسے تصورات میں فاشزم کا مکروہ چہرہ دکھائی دیا۔

''اقبال نے اپنے شاہین کو تیمور، ابدالی، نپولین اور مسولینی کی شکل میں دیکھا اور اقبال کے نزدیک پوری انسانی تاریخ ایسے ہی خودی سے سرشار افراد کے اشاروں پر چلتی ہے اور فوق البشر کی تلاش میں ہے۔ یہ انفرادیت پرستی اور ہیرو پرستی خالص بورژوا تصور ہے جو اپنی آخری شکل میں فاشسٹ ڈکٹیٹر کا روپ دھار لیتا ہے اور یہ ڈکٹیٹر (شاہین) لہو گرم رکھنے کے بہانہ ڈھونڈنے کے لیے جاتا ہے تو اقبال کا انسان دوست دل تڑپ اٹھتا ہے''۔ (۱)

ترقی پسند تحریک کے ابتدائی جذباتی ہیجان کے ٹھنڈے پڑنے اور ترقی پسند ادبی تخلیقات کے مسلسل سامنے آنے کے بعد جعفری کے سماجی اور ادبی تصورات میں تیزی سے تبدیلی آئی۔ اس کی ایک مثال اقبال کے بارے میں ان کی رائے کی تبدیلی ہے۔ اب ان کے لیے اقبال ایک عظیم عالمی شاعر بن گیا۔ رائے کی اس تبدیلی میں اشتراکیت کی جانب اقبال کا مثبت رویے کا یقیناً ہاتھ رہا ہوگا۔ لیکن رفتہ رفتہ اقبال کے نظام اقدار نے بھی انہیں اپنی طرف متوجہ کیا جس نے اشتراکی عصبیت کو اپنے اندر جذب کر لیا۔

''اقبال شناسی'' بڑی حد تک اقبال کی فکر کا اشتراکی نقطہ نظر سے ایک مطالعہ ہے۔ اس کے تین ابواب ''شاعر مشرق'' ''اقبال اور فرنگی'' اور ''اقبال کا تصور وقت'' ہیں اور ان میں فکر اقبال کے ان تصورات کے تجزیے پر مشتمل ہے جو زیادہ تر بیسویں صدی کے پہلے نصف کے قومی اور بین قومی افکار اور واقعات پر ردعمل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جعفری نے اقبال کے ان تصورات کو منتخب کیا ہے جو اشتراکی فلسفۂ حیات سے ہم آہنگ نظر آئے۔ ایسا کرتے ہوئے اقبال کے اسلامی زاویہ فکر سے تعلق رکھنے والے تصورات اور اقدار کا معروضی انداز سے تجزیہ کیا ہے۔ غالباً اشتراکی زاویہ فکر سے فکرِ اقبال کا یہ پہلا مطالعہ ہے اور اس لیے قابل غور بن جاتا ہے۔

جعفری اقبال کی فکر کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہیں۔ ان کے لیے اقبال مسلم بیداری، ہندوستان کی بیداری جس میں پوری تحریک آزادی شامل ہے اور انسانیت کی بیداری شامل ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کی فکر میں اشتراکیت کی فتح اور کارل مارکس اور لینن کے افکار کی عظمت بھی شامل ہے۔ (ص ۱۱) وہ وضاحت کرتے ہیں کہ ہندوستان کی بیداری اور انسانیت کی بیداری ان کی مسلم بیداری کے مقصد کی تردید نہیں بلکہ توضیع اور توثیق کرتی ہے کیونکہ ''ہندوستان اور ایشیا کی مسلم بیداری انسانیت کی بیداری کا حصہ ہے۔'' اور اس

طرح جعفری اقبال کو صحیح معنوں میں عالمی شاعر قرار دیتے ہیں۔ (ص ۱۱)

وہ کہتے ہیں ان تینوں عناصر نے تین قسم کے سوچنے والوں کو تیار کیا ہے۔ اقبال کی انقلابی فکر نے ترقی پسند شاعروں (فیض، مخدوم، جعفری وغیرہ) کو، قوم پرست ذہنوں (جیسے ذاکر حسین، عابد حسین، خواجہ غلام السیدین، شیخ عبداللہ) اور مسلم فرقہ پرست ذہن کو متاثر کیا ہے جنھوں نے اقبال کو اپنی اغراض کے لیے استعمال کیا۔ جعفری نے اقبال کے اثرات کو بھی تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے جو آج بھی اقبال پر لکھی جانے والی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ اقبال شناسوں کا ایک ایسا گروہ بھی ہے جو اقبال کو ایک ایسے مفکر شاعر کی طرح دیکھتا ہے جو عہد حاضر کی فلسفیانہ، تہذیبی، سیاسی اور معاشی اصطلاحوں میں اسلام کی تعبیر کرنا چاہتا ہے اور اس طرح اقبال عالمی اقدار کے قیام کے لیے اسلام کو ایک اہم ذریعہ قرار دیتا ہے۔ جعفری اقبال میں سیاست اور دین کی آمیزش پر گفتگو کرتے ہوئے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے پہلے نصف کے دوران ہندوستان کی سیاسی اور فرقہ وارانہ فضا کا حوالہ دیتے ہیں اور بتاتے ہیں (ص ۲۳۔۲۴) کہ کس طرح بیسویں صدی کے اوائل ہی سے ہندو و مسلمان ایک دوسرے سے مختلف اور بالقوۃ متصادم سیاسی شناختوں کے حامل ہونے لگے تھے۔ جنوری ۱۹۱۱ء میں شائع رابندر ناتھ ٹیگور کے ایک مضمون کا حوالہ دیتے ہیں جس میں ٹیگور اصرار کرتے ہیں کہ ہمیں مان لینا چاہیے کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ہندو اپنی ہندویت پر اصرار کرنے لگے ہیں اور مسلمان اپنی مسلم یت پر۔

جعفری اس واقعے کو نتیجہ قرار دیتے ہیں انگریزوں کے لائے ہوئے دورِ غلامی میں ''بیداری کی نفسیات'' سے جو ہندو اور مسلم احیا پرستی میں نمایاں ہوا۔ ہندو رام راجیہ کی طرف اور مسلمان دورِ رسالت اور خلافت راشدہ کی بات کرنے لگے۔ جعفری کا خیال ہے کہ اس ماحول میں جب کہ ہندو دھرم اور اسلام کے احیا کی باتیں ہو رہی تھیں اگر اقبال دین اور سیاست کی آمیزش کی بات کر رہے تھے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

جلال بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس صورت حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے جعفری کہتے ہیں کہ سیاست میں دین کی آمیزش پر اصرار بتاتا ہے کہ اقبال اور دوسرے ہندو مسلم دانشوروں کے پاس اخلاقی اور سیاسی نظام کا کوئی سیکولر تصور نہیں تھا۔ سیکولر تصور صرف جواہر لال نہرو کے پاس تھا۔ (ص ۴۷)

اقبال اور اشتراکیت:

جعفری کا خیال ہے کہ اقبال نے اشتراکی انقلاب کا خیر مقدم کیا۔ لیکن اس کے ساتھ انھوں نے...... کی مادیت پر تنقید کی اور مادیت میں روحانیت کی آمیزش کا مشورہ بھی دیا۔ ایسے نظام کو اقبال اسلام کا جدید معاشی نظام قرار دیتے ہیں۔ (ص ۲۷)

ضرب کلیم اور بال جبریل میں اقبال نے اشتراکی فلسفے پر نظمیں لکھیں۔ 'لینن' 'فرشتوں کا گیت' 'فرمان خدا فرشتوں کے نام' فارسی نظم 'نوائے مزدور' بھی اسی موضوع پر ہے۔ انقلاب کا رنگ اقبال کی شاعری میں ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے بعد آیا۔ زبور عجم (۱۹۲۷ء) میں ایک نظم انقلاب پر لکھی۔ مارکس کو وہ بغیر کتاب والا پیغمبر قرار دیتے ہیں۔ (ص ۵۵۔۶۰)

جعفری اقبال کے تصور خودی کی تشریح سماجی' سائنسی اور کچھ فلسفیانہ انداز میں کرتے ہیں۔ مسلم فکری روایت سے اس کا رشتہ نہیں جوڑتے۔ ان کی نظر میں اقبال کے فلسفے میں نظام عالم اور تسلسل حیات خودی کے استحکام پر منحصر ہے۔ اثبات اور نفی دو جدلیاتی قوتیں ہیں جس کی تکرار اور کشمکش سے خودی ترقی کرتی ہے۔ قوت تخلیق اور قوت عمل خودی کے مظاہر ہیں۔ خودی کو عشق پائندہ تر کرتا ہے۔ کائنات کی تسخیر بھی خودی سے ممکن ہے۔ (ص ۱۳۸) جعفری بتاتے ہیں کہ اقبال کی نظر میں آدم کا زمین پر بھیجا جانا کسی زوال کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ یہ آغاز ہے انسان کی اشرف المخلوقات بننے کے لیے جدوجہد کے آغاز کا۔ مقصد تسخیر کائنات ہے۔ اس لیے اقبال اپنی بندگی کو خدائی سے بدلنے کے لیے تیار نہیں۔ (ص ۳۹۔۴۰)

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

خودی اقبال کی فکر کا مرکزی نقطہ ہے۔ اس کی تشریح ان کی اپنی تشریح ہے جس کے لیے انھوں نے بعض اسلامی تصورات کو جیسے وحدت الوجود کو رد کیا اور مغربی عالم سے مدد لی۔ (ص ۱۳) جعفری توجہ دلاتے ہیں کہ وہ اقبال سے پہلے اردو شاعری میں خودی کا تذکرہ قابل احترام نہیں تھا"۔ (ص ۱۸)

جعفری ایک دلچسپ رائے دیتے ہیں کہ اقبال کا فلسفہ خودی ہندوستان کی تحریک آزادی کی عطا کی ہوئی بیداری سے ہم آہنگ ہے جس سے انفرادی اور اجتماعی خود شناسی اور خود فکری پیدا ہو رہی تھی (ص ۴۳)

انقلاب روسی میں بھی اقبال کو خودی کی بیداری نظر آئی۔ (ص ۴۴)

میں نہیں سمجھتا کہ تصور خودی کی تشکیل میں تحریک آزادی ہند یا انقلاب روسی کا کوئی حصہ رہا ہے۔ اقبال اس سے بہت پہلے (ص ۱۹) اسرار خودی میں اس تصور کی وضاحت کر چکے تھے۔ خودی سیاسی اور معاشی سے زیادہ روحانی اور اخلاقی تصور ہے اور تمام سیاسی اور معاشی تبدیلیوں سے ماوراہے۔

جعفری اقبال کی فکر کو اشتراکیت سے قریب تر بتانے کے ساتھ اقبال کی روحانیت کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ''اقبال کی اشتراکیت کے معاشی نظام میں مذہبی روحانیت کی آمیزش کے قائل تھے۔ اسی لیے انھوں نے کارل مارکس کو 'کلیم بے تجلی' 'مسیح بے صلیب' اور 'نیست پیغمبر و لے دارد کتاب' کہا ہے۔ (ص ۴۴)

'اقبال شناسی' کا تیسرا باب اقبال کے تصورِ طلب کی تشریح کرتا ہے۔ انھوں نے واضح کر دیا کہ وہ فلسفی نہیں ہیں۔ وہ وقت کے فلسفیانہ یا سائنسی تجزیے کی کوشش نہیں کریں گے۔ وہ کہتے ہیں ''میں نے وقت کو شاعرانہ طریقے سے محسوس کیا ہے' کبھی ایک طاقت کی طرح اور کبھی حسن کی طرح۔ (ص ۸۲) وہ کہتے ہیں کہ اقبال نے بھی وقت کو ایک شاعر کی طرح محسوس کیا ہے۔ روزمرہ کے وقت (serial time) اور سرسری وقت (pure duration) کا حوالہ دیتے ہوئے جعفری اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اقبال کے لیے خدا وقت سے باہر ہے۔ (ص ۱۰۱) اقبال کے تصور وقت کا تیسرا عنصر وہ ہے جس پر یہ گماں کا اثر کرے۔ یہ گماں کے نزدیک حقیقت اپنی بنیادی فطرت میں تخلیقی ارتقا یعنی وقت ہر لحظہ تغیر پذیر ہے۔

فریب نظر ہے سکون	تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھیرتا نہیں کاروان وجود	کہ ہر لحظہ ہے کاشانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی	فقط ذوق پرواز ہے زندگی

جعفری کے نزدیک یہ اندازِ فکر جدلی مادیت سے بہت قریب ہے جو حرکت اور تغیر کی سائنٹفک تعبیر ہے۔

جعفری اقبال کے اس تصور زماں کو بھی مادی اصطلاحات میں بیان کرتے ہیں۔ ''خارجی حقیقت ہمارے وجود سے آزاد اپنا وجود رکھتی ہے اور ہمارے اور ادراک و شعور کے آئینے میں منعکس ہوتی ہے۔ یہ حقیقت مادہ ہے جو حرکت کے معتبر وجود پذیر اور ظہور پذیر نہیں ہوسکتا۔ نہ مادے کا وجود بغیر حرکت کے ممکن ہے

اور نہ حرکت کا وجود مادے کے بغیر........ کوئی دنیا میں مادے کی تخلیق نہیں کرسکتا۔ کوئی مادے کی تخریب نہیں کرسکتا...... اسی طرح زماں و مکاں کی بھی تخلیق و تخریب ممکن نہیں۔'' پھر جعفری اضافہ کرتے ہیں۔ ''مذہبی زبان میں اسے یوں کہا جاسکتا ہے کہ خدا نے مادے کو قوت تخلیق ودیعت فرمائی ہے۔ بیج میں درخت اور پھول بننے کی اور پھول میں پھل بننے کی صلاحیت موجود ہے۔'' اور وہ اقبال کا یہ شعر اس کی تائید میں دکھاتے ہیں:

یہ کائنات چھپاتی نہیں ضمیر اپنا

کہ ذرے ذرے میں ہے ذوق آشکارائی (ص۱۰۲)

جعفری اقبال کے مجرد وقت کے تصور کو نظر انداز کر کے یقین کو صرف محسوس دور خالق تغیرات کی حیثیتوں سے ذکر کرتے ہیں۔ جعفری نے فلسفۂ خودی کو بھی اسی طرح مادی اصطلاحوں میں بیان کیا ہے۔

''اقبال شناسی'' اقبال کی کائنات فکر کا جزوی احاطہ کرتی ہے۔ خودی' بے خودی' فوق البشر' زماں و مکان جیسے تصورات کا جعفری نے ایک اشتراکی ترقی پسند کی طرح اقبال کو عہد حاضر کے فکری' سیاسی' معاشی اور تہذیبی تناظر میں رکھ کر وہ نتائج اخذ کیے ہیں جو اشتراکی زاویۂ فکر کی مطابقت کرتے ہوں۔ اسے اقبال کو اشتراکی زاویۂ نظر سے دیکھنے کی ایک فکر انگیز کوشش قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگر اقبال اس کتاب کو پڑھتے تو ناراض نہیں بلکہ یقیناً خوش ہوتے۔ اس لیے خوش ہوتے کہ جعفری نے جس کائنات اور تبدیلی (جدلیات) کو اقبال میں دیکھا اور دکھایا وہ وہاں موجود ہیں۔

مجھے جعفری سے ایک شکایت ہے۔ انھوں نے اقبال کے نظامِ فکر کے ایک مرکزی تصور ''تبدیلی انقلاب'' پر اتنی توجہ نہیں دی جس کا وہ مستحق تھا۔ اگر تبدیلی کے تصور کے توسط سے اقبال کی فکر کا تجزیہ کیا جاتا تو نہ صرف اقبال کی مادی اور روحانی فکر پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے بلکہ وہ تصورات بھی جنھیں عام طور پر ''تضادات'' کہا جاتا ہے (جعفری بھی ایسا سمجھتے ہیں) تضادات نہیں رہتے بلکہ ایک وسیع انسانی نظام اقدار کا حصہ بن جاتے ہیں۔

پروفیسر انور معظم عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز میں پروفیسر و صدر شعبہ کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں۔

سردار جعفری کے خیالات ومحسوسات

خطوط کے آئینے میں

پروفیسر نسیم الدین فریس

خط جذبات وخیالات کے غیر رسمی اظہار کا اہم وسیلہ ہوتا ہے۔ مختلف مسائل وموضوعات کی بابت جس بے تکلفی اور بے ساختگی کے ساتھ اظہار خیال کی جیسی گنجائش خط میں ہوتی ہے ادب کی کسی اور صنف میں ویسی شاید ہی پائی جاتی ہے۔ خط عموماً دوستوں اور عزیزوں کو لکھے جاتے ہیں۔ جن سے کسی بات کا کوئی پردہ نہیں ہوتا اس لیے خط میں مکتوب نگار اپنا رازِ دل عیاں کردیتا ہے۔ مکتوبات کا مطالعہ علمی، ادبی، تاریخی، تہذیبی غرض کئی جہتوں سے افادیت کا اہل ہوتا ہے۔ اردو میں مکتوبات کی اہمیت پر تنقیدی نقطہ نظر سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جس کی تکرار تحصیل حاصل کے علاوہ کچھ نہیں، لہذا مکتوب نگاری کی فنی بحث سے گریز کرتے ہیں۔ اس مقالے میں ہم علی سردار جعفری کے مکتوبات کے نمایاں خدوخال اور اہم موضوعات ومسائل پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے ان مکتوبات کے حوالے سے جعفری صاحب کے افکار ومشاہدات کا مطالعہ کریں گے۔ جعفری صاحب نے یہ خطوط اپنے دوست احباب، جامعات کے پروفیسروں، انجمنوں کے عہدیداروں، ادیبوں اور شاعروں کے نام لکھے ہیں۔ ان خطوط کی زبان سلیس ورواں اور لہجہ بے تکلفانہ ہے۔ خطوط میں جعفری صاحب کی سیرت وشخصیت کے کئی پہلو مبرہن ہوئے ہیں۔ ان میں کہیں وہ قبیلے کے تجربہ کار سردار کی طرح نوجوانوں کو آگہی بانٹتے اور مفید مشورے دیتے نظر آتے ہیں تو کہیں ہم عصر وہم عمر احباب پر خلوص ومحبت نچھاور کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان خطوط میں دوستداری بھی ہے اور غم خواری بھی، دانشورانہ انداز بھی ہے اور مجبوری وبے بسی کی حکایات بھی، اپنی بیماری کی کیفیت بھی ہے اور عزیزوں کی وفات کا نوحہ بھی، اپنوں سے التفات بھی ہے اور مخالفین پر برہمی بھی، خودنگری بھی ہے اور خودستائی بھی، کہیں شفیق باپ کے دل کی دھڑکن بول رہی ہے تو کہیں محبت کرنے والے شوہر کی نظر، کہیں سمیناروں کے منتظمین کو صلاح دی جارہی ہے تو کہیں رسالوں کے مدیروں کی حوصلہ

افزائی ودل جوئی کی جارہی ہے۔ غرض جعفری صاحب اپنے رقعات ومراسلات میں اپنی ہمہ جہت شخصیت کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔ ان خطوط میں وہ خطابیہ اسلوب اور پر شکوہ آہنگ جوان کی شاعری کی پہچان ہے دور دور تک نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس شروع سے آخر تک نرمی وشیرینی اور دل آسائی کی فضا محسوس ہوتی ہے۔ جعفری صاحب کے مکاتیب کے مافیہ اوران کی مکتوب نگاری کی جملہ خوبیوں کا احاطہ اس مضمون میں ممکن ہے نہ مقصود ہے اس لیے یہاں صرف مختلف مہمات، مسائل، افراداور جماعتوں کے بارے میں جعفری صاحب کے افکار ومشاہدات اور تنقیدی خیالات کوموضوع بحث بنایا گیا ہے۔ جعفری صاحب کے خطوط نمبر جس کے مرتب پروفیسر خلیق انجم ہیں۔ یہ نمبراس رسالے کی اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۰ء سے لیے گئے ہیں۔

سردار جعفری کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن، ترقی پسند تحریک کے پر جوش علمبرداراور اردو تحریک کے صاحب بصیرت قافلہ سالار تھے۔ انہوں نے اپنے خطوط میں ہندوستانی سیاست، سماجی زندگی، تاریخ، شعروادب اور مختلف معاصر شخصیتوں اور تحریکوں کے بارے میں اپنے افکار ومشاہدات کا صداقت اور دیانتداری کے ساتھ اظہار کیا ہے۔ اس زاویے سے ان کے خطوط ان کی دانش وبینش کو سمجھنے اوران کے تنقیدی افکاروتصورات کی تشخیص کا اہم وسیلہ ہیں۔

علی سردار جعفری ہندوستان میں اشتراکی تحریک انجمن ترقی پسند مصنفین اوراردوتحریک کے سرکردہ قائد تھے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا شمار بھی ان تحریکوں کے اہم قائدین میں ہوتا ہے۔ ان تحریکوں کی سرگرمیوں کے حوالے سے دونوں کے مابین طویل مراسلت رہی۔ سردار جعفری راج بہادر گوڑ کو ہم مسلک وہم خیال سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ گوڑ صاحب کے نام انہوں نے جو خط لکھے ہیں ان میں مختلف مسائل وموضوعات اور مختلف اشخاص وانجمنوں کے متعلق کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مکتوبات ویسے بھی جذبات وخیالات کے فطری اور بے ساختہ اظہار کا وسیلہ ہوتے ہیں لیکن جب مکتوب الیہ ہمراز ودمساز ہوتو مکتوب نگار تحریر میں اپنا دل چیر کر رکھ دیتا ہے۔ گوڑ صاحب کے نام جعفری صاحب کے مکاتیب میں یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ یہاں وہ مختلف اہم، نازک اور متنازعہ مسائل پر پوری بے تکلفی اور بے باکی کے ساتھ اپنے دلی جذبات بیان کرتے ہیں۔ گوڑ صاحب کے نام سردار جعفری کے تین مکاتیب مواد وموضوع کے اعتبار سے نہایت اہم ہیں۔ ان میں ایک خط وہ ہے جس میں جعفری صاحب نے اقبال اور شری وویکا نند کی شخصیتوں اوران کے افکار کا تقابل کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"سوامی وویکانند اور اقبال میں عجیب وغریب مماثلت ہے۔ وہ محترم (یعنی وویکانند) آزادی کے پروانے مگر ہندو احیا پرست (Hindu Revivalist) تھے۔ اقبال مسلم احیا پرست تھے۔ یہ احیا پرستی انیسویں صدی میں راجہ رام موہن رائے میں بھی مل جائے گی اور سرسید میں بھی۔ پہلے کلکتہ میں ہندو کالج بنا پھر علی گڑھ میں مسلم اورینٹل کالج۔ پہلے بنارس میں ہندو یونیورسٹی قائم ہوئی پھر علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی۔ اور بنارس کی یونیورسٹی کے ساتھ ہندو کے لفظ پر ٹیگور نے اصرار کیا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہندو احیا پرستی نیشنلزم کے لبادے میں چھپ جاتی ہے اور مسلم احیاء پرستی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اقبال مسلم بیداری کا شاعر ہے مسلم احیا پرستی کے ساتھ ہندوستان کی بیداری کا شاعر ہے حب الوطنی کے ساتھ، اور عالم گیر انسانیت کی بیداری کا شاعر ہے اشتراکیت کے معاشی نظام میں اسلامی روحانیت کی آمیزش کے ساتھ۔ سوامی وویکانند ہندو بیداری کے نقیب ہیں ہندو روحانیت کی آمیزش کے ساتھ، ہندوستان کی بیداری کے نقیب ہیں حب الوطنی اور ماضی پرستی کے ساتھ جس میں مسلمان کی سمائی نہیں ہے اور عالم گیر انسانیت کی بادیر کے نقیب ہیں ہندو روحانیت کی آمیزش کے ساتھ لیکن اشتراکیت یا معاشی نظام کا کوئی انقلابی پہلو ان کے یہاں نہیں ہے۔ لیکن ان کی یادگار آزاد ہندوستان میں بڑے شاندار طریقے سے قائم کی گئی ہے اور اقبال کو گزشتہ ستائیس سال سے راندۂ درگاہ بنا کر رکھا گیا ہے"۔ (مکتوب بنام راج بہادر گوڑ۔ مورخہ ۹/ جنوری ۱۹۷۵ء)

مندرجہ بالا مکتوب میں سردار جعفری کا یہ تجزیہ کہ اکثریتی فرقہ پرستی نیشنلزم کے لبادے میں چھپ جاتی ہے اور اقلیتی احیا پرستی نمایاں ہو جاتی ہے۔ کس قدر صائب اور درست ہے! جعفری صاحب نے یہ رائے یوں ہی قائم نہیں کی ہے اس کے پیچھے تاریخ کا گہرا مطالعہ اور دونوں فرقوں کی نفسیات سے گہری آگہی کارفرما ہے۔ گوڑ صاحب کے نام جعفری صاحب کا دوسرا اہم مکتوب وہ ہے جس میں انہوں نے اردو تحریک کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے اس میں ایک لاکھ اردو دوستوں کی شمولیت پر زور دیا ہے۔ ان کا یہ احساس ہے کہ کمیونسٹ پارٹی یہ کام بہ آسانی کر سکتی ہے لیکن انھیں پارٹی سے یہ شکایت ہے کہ اس کے بعض ممبر "اردو بےزار" ہیں۔ اس مسئلے پر اپنی بے لاگ رائے کا دیانتدارانہ اظہار کرتے ہوئے وہ گوڑ صاحب کو لکھتے ہیں۔

"اردو کا مسئلہ صرف سیاسی ہے اور صرف سیاسی سطح پر طے ہوگا۔ درخواستوں اور تجویزوں سے کام نہیں چلے گا۔ ایک بڑی تحریک کی ضرورت ہے جو صرف کمیونسٹ پارٹی کی رہنمائی میں چلائی جاسکتی ہے جیسا میں نے اپنے خط میں لکھا تھا ایک لاکھ اردو دوستوں (جعفری صاحب کی مراد غالباً غیر

مسلم اردو دوست ہے) کی تحریک میں پارٹی کی تنظیموں کے ذریعہ سے مزدور، کسان اور درمیانی طبقے کے سارے عناصر شامل کیے جائیں پھر اس تحریک کو فرقہ وارانہ رنگ نہیں دیا جاسکے گا......

پارٹی یہ کام ایک سال کے اندر کر سکتی ہے لیکن اصلی دشواری یہ ہے کہ اردو کے معاملے میں جو خود پارٹی کی پالیسی واضح نہیں ہے۔ پارٹی اردو کے معاملے میں جو بھی موقف اختیار کرتی ہے اس کو ہندی والے پارٹی ممبر قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ چند سال پہلے جب بنے بھائی (سجاد ظہیر) بہ حیات تھے اور پارٹی کا دفتر آصف علی روڈ پر تھا اردو کے بارے میں پارٹی نے ایک مشاورتی جلسہ کیا تھا۔ رام بلاس شرما اس وقت پارٹی کے ممبر تھے۔ انہوں نے جلسے میں شرکت کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ایسی بے شمار مثالیں ہیں۔"

(مکتوب بنام راج بہادر گوڑ مورخہ ۲ جولائی ۱۹۸۷ء)

جب کمیونسٹ پارٹی جیسی سیکولر اور روشن خیال جماعت کے ہندی والوں کا اردو کے بارے میں یہ رویہ ہو تو دیگر افراد اور جماعتوں کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس مکتوب کے بین السطور میں جعفری صاحب نے اردو والوں کو غور کرنے کے لیے بہت کچھ دیا ہے۔ گوڑ صاحب کے نام جعفری صاحب کا تیسرا اہم خط وہ ہے جس میں انہوں نے اردو زبان کے بارے میں ہندی ادیبوں کی تنگ ذہنیت کا شکوہ کیا ہے۔ اس خط میں انہوں نے اس حقیقت کا بھی احساس دلایا ہے کہ اردو زبان اب آہستہ آہستہ سکڑ کر صرف ایک فرقہ کی زبان بن گئی ہے۔ لسانی سیاست کے گندے کھیل نے اردو کے ہمہ قومی کردار کو ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ خامہ طراز ہیں:

"تم نے ہندی والوں کے جس رویے کی شکایت کی ہے وہ بہت پرانا ہے۔ ہندی کے بڑے اور چھوٹے ادیب چاہے وہ راہل تیاگی ہوں، چاہے وہ پال اور چاہے آج کے امرت رائے...... سب نے ہمیشہ اردو کی مخالفت کی ہے......"

"ہندوستان میں زبان کی پالیسی ناقص ہے اس لیے ہر بار زبان کا فیصلہ فرقہ وارانہ صورت اختیار کر لیتا ہے اور ہم اس کے خاموش تماشائی ہیں۔ ہم اس حقیقت کو تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ اردو زبان آہستہ آہستہ مسلمانوں کی زبان کی شکل میں محدود ہوتی جا رہی ہے۔ اب اردو کے نام لیوا جو ہندو ادیب ہیں وہ کشمیری پنڈت ہیں یا پنجابی، جن کو ہندی ساہتیہ سمیلن نے ۱۹۳۵ء میں ٹیڑھی نظر سے دیکھا تھا۔ شمالی ہندوستان کے باشندوں میں صرف چند کایستھ خاندان

اردو کا دم بھرتے ہیں۔کوئی برہمن کوئی ٹھاکر خاندان مشکل سے ملے گا۔یہی وجہ ہے کہ ہندی کے ادیب اردو کی مانگ کی مخالفت یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ اس سے ملک پھر تقسیم ہو جائے گا"۔

(مکتوب بنام راج بہادر گوڑ مورخہ ۲۶ مئی ۱۹۸۴ء)

سردار جعفری اپنے مکاتیب میں مکتوب الیہ کی دلچسپی اور رجحان طبع کی پاسداری بھی کرتے نظر آتے ہیں۔مثلاً پروفیسر گیان چند جین کے نام ایک خط میں تحقیق سے ان کی شغف کے پیش نظر انہیں ایک نادر کتاب کی دستیابی کا ذکر کیا ہے۔لکھتے ہیں:

"میں آپ کے لیے ایک تحفہ لانے والا ہوں۔اس کا نام "پنجۂ نگاریں" ہے۔یہ ایک شاعر خلیل حسن خلیل تلمیذ منشی امیر احمد مینائی کی پانچ مثنویوں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۱۳ء میں مکمل ہوا اور ۱۹۱۴ء میں مطبع ہند عام آگرہ میں طبع ہوا۔شائع بلرام پور ریاست سے ہوا۔اس میں شکنتلا اور میگھ دوت کے ترجمے شامل ہیں جو براہ راست سنسکرت سے کیے گئے ہیں...... میرا خیال ہے کہ آپ کی کتاب "اردو مثنوی" میں ان مثنویوں کا ذکر نہیں ہے۔میں نے کہیں اور بھی نہیں دیکھا"۔

(مکتوب بنام پروفیسر گیان چند جین مورخہ ۲۷ جنوری ۱۹۷۰ء)

علی سردار جعفری کا شمار ترقی پسند تحریک کے نظریہ سازوں اور اساس گزاروں میں ہوتا ہے۔انہوں نے اس تحریک کے اصولوں کے مطابق شاعری بھی کی اور تنقید بھی لکھی۔اپنی تنقیدی تحریروں میں انہوں نے ترقی پسند تحریک پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب دیا اور پوری شدومد کے ساتھ ترقی پسند تحریک کی مدافعت کی۔وہ ترقی پسندی کے رنگ میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ مکتوبات میں بھی وہ حسب موقع اس تحریک کے وکیل دفاع کا رول انجام دیتے نظر آتے ہیں۔ایک مرتبہ مظہر امام نے جعفری صاحب کو اپنے خط میں لکھا تھا کہ " میرے نزدیک ترقی پسندی چند مخصوص سکہ بند موضوعات میں محصور ہونے کا نام نہیں" مظہر امام کے اشارے کی تہہ تک پہنچتے ہوئے،جعفری صاحب انہیں جواب دیتے ہیں۔

"مجھے آپ کے اس رویے سے بالکل اختلاف نہیں۔لیکن اگر اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ ترقی پسند شعرا چند مخصوص سکہ بند موضوعات میں محصور ہیں تو مجھے شدید اختلاف ہے۔کیا آپ کا خیال ہے مجاز،فیض،مخدوم،جاں نثار اختر،کیفی اعظمی کی شاعری سکہ بند تصورات میں محصور ہے؟"

آگے وہ جدیدیت کے علمبرداروں کو ہدف تعریض بناتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"ذرا فرصت ملے تو میں اس پر ذرا تفصیل سے بات کروں گا اور ان سکہ بند تصورات کی فہرست پیش کروں گا جو ہر جدیدیت کے حامی شاعر کے یہاں دوہرائے جارہے ہیں اور بری اور کمزور شاعری کی شکل میں دوہرائے جارہے ہیں"۔ (مکتوب بنام مظہر امام۔ مورخہ ۴ اگست ۱۹۷۵ء)

شاعری کے علاوہ سردار جعفری نے صحافت کے شعبے میں بھی اپنے فکر وفن کے گہرے نقوش ثبت کیے۔ اردو کی ادبی صحافت میں ان کا اہم کارنامہ رسالہ "گفتگو" پر ہے جس میں شائع شدہ تخلیقات اور تنقیدی مقالات نے ترقی پسند شعروادب کے فروغ نیز اس کی تفہیم وتحسین اور اس کی قدر وقیمت کے تعین میں نہایت اہم حصہ لیا۔ سردار جعفری گفتگو کا "ترقی پسند ادب نمبر" نکالنا چاہتے تھے۔ اس کی مجلس ادارت میں انہوں نے (پروفیسر) سید محمد عقیل رضوی کو بھی شامل کیا تھا اور ترقی پسند افسانے کے انتخاب کی ذمہ داری انہیں سونپی تھی۔ اس سلسلے میں عقیل صاحب سے ان کی طویل مراسلت رہی جس کے دوران عقیل صاحب نے ان سے استفسار کیا کہ اس انتخاب میں کن ادیبوں کو شامل کیا جائے؟ اس کے جواب میں جعفری صاحب نے انہیں جو خط لکھا اس سے مختلف ادیبوں کے بارے میں ان کے نقطہ نظر کا برملا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ اس دور کی ادبی شخصیتوں کی آویزش چپقلش کا پورا منظر نامہ قاری کے سامنے آتا ہے۔ جعفری صاحب اپنی رائے کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں

"آپ کا یہ سوال اہم ہے کہ انتخاب میں کن ادیبوں کو شامل کیا جائے۔ اس کے بارے میں اپنی رائے غالباً پہلے لکھ چکا ہوں۔ قمر رئیس میرے اس اپروچ سے متفق ہیں۔

(۱) مستند ترقی پسند ادیبوں کی تخلیقات جیسے کرشن، فیض، مخدوم۔

(۲) ان ادیبوں کی تخلیقات جنہوں نے اپنے آپ کو ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں کیا اور شاید کبھی کبھی اختلاف بھی کیا لیکن ترقی پسند تخلیقات کرتے رہے جیسے ن۔م۔ راشد اور اختر الایمان۔

(۳) ترقی پسند تحریک کے مخالفوں کی وہ تخلیقات جن پر ترقی پسند فکر کا اثر پڑا ہے۔ یعنی وہ اپنے آپ کو اس سورج کی روشنی سے نہ بچا سکے۔ بلراج کومل، ندا فاضلی، وغیرہ۔

مجھے یہی اپروچ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یقیناً فائدہ ہوگا۔ اس کے بغیر بہتری دشواریاں پیدا ہوں گی۔ مثال کے طور پر بیدی اور منٹو کو بھی شامل کرنا دشوار ہوگا۔ منٹو نے حسن عسکری کے ساتھ مل کر تحریک کو بہت

گالیاں دی ہیں۔ بعض طنزیہ مضامین میں بھی ترقی پسندی کے خلاف بھی لکھا۔ نہایت رجعت پرست اور بیمار افسانے بھی تخلیق کیے ہیں۔ بیدی گزشتہ چند سال سے باقر مہدی کے ہم نوا ہو گئے ہیں۔ باقر کے رسالے ''اظہار'' کے اجرا پر انھوں نے جو مضمون لکھا تھا وہ ''ہماری زبان'' میں شائع ہوا تھا۔ اس میں یہ بیان موجود ہے کہ میں ترقی پسند نہیں ہوں لیکن ترقی پسند مجھے ترقی پسند کہتے ہیں۔ اس میں مارکسزم کے خلاف بھی مہمل بیانات ہیں۔ بلراج مین را کا بھی کچھ یہی حال ہے۔ بلکہ زیادہ پیچیدہ۔ وہ اپنے آپ کو مارکسٹ کہتے ہیں اور یہ بھی خبر ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہیں۔ لیکن جو تخلیق کرتے ہیں وہ کچھ اور ہے۔ انور عظیم کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ ترقی پسندی کے مخالف نہیں ہیں۔ کبھی کبھی ناقدانہ انداز اختیار کرتے ہیں اس میں مضائقہ نہیں۔ ''شعور'' کے تازہ انداز شمارے میں انھوں نے ریختی پر لکھا ہے۔ مین را کا اور ان کا ساتھ نظر انداز کر دینے کی چیز ہے۔ طبقاتی سماج کے اندر ادیب مختلف موقف اختیار کرتے رہتے ہیں۔ سارتر کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس لیے ان کو ان کی تخلیقات پر جانچنا چاہئے۔ کوئی سخت گیر رویہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ بالزاک سیاست میں سو فیصدی رجعت پرست تھا۔ لیکن تخلیقی سطح پر کارل مارکس کا محبوب ادیب تھا۔ ہماری تحریک میں ادیبوں کے آنے جانے کا سلسلہ جاری رہے گا''۔ (مکتوب بنام پروفیسر سید محمد عقیل رضوی۔ مؤرخہ ۲۵ جون ۱۹۷۹ء)

سردار جعفری خطوط میں مختلف مسائل و موضوعات کے علاوہ مختلف معاصر اہل قلم کے بارے میں بھی بے جھجک اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کسی ذہنی تحفظ یا مصلحت سے کام نہیں لیتے۔ ایک خط میں باقر مہدی کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''باقر مہدی کی کتاب ''تنقیدی کش مکش'' میری نظر سے گزری ویسے میں ان کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہوں۔ کنفیوژن پھیلانا ان کا سب سے بڑا حربہ ہے۔ میں ان کو نظر انداز کرتا رہتا ہوں۔ ان کی شاعری، شخصیت، بغاوت، انقلاب وغیرہ کے محمد حسن بہت قائل ہیں۔''

(مکتوب بنام سید محمد عقیل رضوی مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۷۹ء)

پروفیسر سید محمد عقیل رضوی صاحب نے اپنے خط میں فیض احمد فیض کی نظم ''آج بازار میں پا بجولاں چلو'' کو رثائی ادب میں شامل کیا تھا۔ لیکن جعفری صاحب کو ان سے اتفاق نہیں تھا۔ جوابی خط میں انھوں نے فیض کی زیر بحث نظم کے بارے میں اپنے تاثرات اس طرح قلمبند کیے:

''آپ نے فیض کی نظم ''آج بازار میں پابجولاں چلو'' کا ذکر کیا ہے۔ میرے نزدیک وہ جدید مرثیہ نہیں ہے۔ بلکہ مرثیہ ایک سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس میں مست رقصاں اور دست افشاں قسم کے الفاظ بھی ہیں۔ یہ نظم عثمان ہارونی کی فارسی غزل سے متاثر ہے جس کا مشہور شعر ہے۔

بیا جاناں تماشا کن کہ درانبوہِ جاں بازاں
بصد سامانِ رسوائی سرِ بازار می رقصم
منم عثمانِ ہارونی کہ یارِ شیخ منصورم
ملامت می کند خلقے ومن برداری می رقصم

فیض کے آہنگ میں اس اشعار کا گاتا اور گنگناتا ہوا رقص الفاظ نہیں، تالیاں بجانے کی آواز ہے۔ اچھی نظم ہے۔ صرف ایک مصرعہ کھٹکتا ہے ''دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے'' یہ غالب کے مصرعے کی نئی تشکیل ہے۔ (مکتوب بنام سید محمد عقیل رضوی مورخہ ۳۰ مئی ۱۹۹۱ء)

سردار جعفری جدیدیت اور جدیدیت سے متاثر فن کاروں سے راضی نہیں تھے۔ وہ اپنی ناراضی مخفی بھی نہیں رکھتے بلکہ واشگاف انداز میں اس کا اظہار کرتے تھے۔ پروفیسر عقیل رضوی کو جدید افسانہ نگاروں کے متعلق اپنی رائے سے مطلع کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں۔

''باقی افسانے پنجرے کا آدمی (رتن سنگھ)، چوراہے پر ننگا ہوا آدمی (انور قمر)، سواری (خالدہ اصغر)، دو بھیگے ہوئے لوگ (اقبال مجید) اور کالے ناگ کے پجاری (سلام بن رزاق) میرے نزدیک خراب افسانے ہیں۔ یہ جدیدیت کے اس نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کرتے ہیں کہ انسان ازلی اور ابدی طور سے بے بس ہے۔ ظالم اور مظلوم کا فرق نمایاں کرنا ترقی پسندی اور پروپیگنڈا ہے اور جدید افسانہ اس سے بے نیاز ہے۔ زبان اور بیان کے اعتبار سے بھی یہ افسانے کمزور ہیں۔ جہاں تک سمبالک (Symbolic) افسانہ نگاری کا تعلق ہے اس کی بہترین مثالیں ہمارے انتخاب میں شامل ہیں جیسے کشتی (انتظار حسین)، کونپل (انور سجاد) اور بجوکا (سریندر پرکاش) اس بات کی ابتدا کہ ظالم اور مظلوم کا فرق ضروری نہیں ہے حسن عسکری نے پاکستان بننے کے بعد کی تھی اور انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ قرآن کے اعتبار سے زمانہ ظالم اور جاہل ہے۔ اس بیان کو میں قرآن کی غلط تاویل سمجھتا ہوں۔ رتن سنگھ، انور قمر، خالدہ اصغر، اقبال مجید اور سلام بن رزاق نے جس ذہنیت کا

اظہار افسانوں میں کیا ہے اس کی تشکیل ۱۹۳۰ء کے بعد کالنگ ووز (R.G Collingwood) نے اپنی کتاب The Principle of Art میں کی تھی ...... جن افسانوں کا میں نے اوپر نام لیا ہے وہ اس قسم کی ذہنیت کے ترجمان ہیں۔ لیکن ان کے مصنف باشعور رجعت پرست نہیں ہیں۔ وہ سب کے سب جدیدیت کے پروپیگنڈے کا شکار ہیں...... فی الحال ان کو ترقی پسند ادب نمبر میں شامل کرنا مناسب نہیں ہے"۔ (مکتوب بنام پروفیسر سید محمد عقیل رضوی ۱۰ نومبر ۱۹۷۹ء)

لطف یہ ہے کہ جدیدیت سے اس ابا اور جدیدیت پسندوں سے اس ابتکار کے باوجود سوائے خالدہ اصغر کے مذکورہ بالا تمام افسانہ نگاروں کے افسانے جعفری صاحب نے گفتگو کے ترقی پسند ادب نمبر میں شامل کیے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں!

جدیدیت سے جعفری صاحب کی بیزاری اس قدر قوی اور شدید تھی کہ وہ اس کے بھی روادار نہیں تھے کی ان کے قبیلے کا آدمی جدید ادیبوں کے تخلیقات پر تبصرہ لکھے۔ پروفیسر سید محمد عقیل رضوی الہ آبادی سے "اندازے" کے نام سے ایک مختصر رسالہ نکالتے تھے۔ اس کی ایک اشاعت میں انھوں نے جن کتابوں پر تبصرے شائع کیے ان میں بیشتر جدید شاعروں کے شعری مجموعے تھے۔ اس پر سردار جعفری نے عقیل صاحب کو اپنے فہمایشی خط میں لکھا:

"اندازے کے تازہ شمارے میں بہت سارے شعری مجموعوں پر تبصرے ہیں اور یہ زیادہ تر جدید شاعروں کے مجموعے ہیں۔ ان میں تین چار سال پرانی کتابیں بھی شامل ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ میری کتاب "لہو پکارتا ہے" کیفی کی "آوارہ سجدے" فیض کی "شام شہر یاراں" اور تاباں کی ساہتیہ اکیڈمی انعام حاصل کرنے والی کتاب کو اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ ان پر تبصرہ کیا جائے۔ اگر "اندازے" جدیدیوں کا پرچہ ہوتا تو یہ بات کچھ سمجھ میں آسکتی تھی کہ انھوں نے ترقی پسند شعرا کو نظر انداز کیا ہے۔ لیکن آپ کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے لیے یہ ضروری ہے کہ ترقی پسند شعرا کی تخلیقات کا بھی جائزہ لیا جائے تاکہ تقابلی طور پر یہ پتہ چل سکے کہ اس عہد میں صرف بری شاعری نہیں ہو رہی، اچھی شاعری بھی ہو رہی ہے۔"

(مکتوب بنام پروفیسر سید محمد عقیل رضوی۔ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۸۰ء)

علی سردار جعفری نہ صرف اردو زبان کے والہ وشیدا تھے بلکہ اردو تحریک کے سپہ سالار بھی تھے۔ اردو زبان کے فروغ وتحفظ اوراس کے آئینی حقوق کی جدوجہد کے سلسلے میں وہ کئی کمیٹیوں سے وابستہ تھے۔ اردو کو اس کا دستوری حق دینے کے معاملے میں ارباب اقتدار کی بے اعتنائی اور اہل سیاست کی دورخی پالیسی سے وہ شاکی اور نالاں رہتے تھے۔ ایسے میں اگر کوئی اردو والا ہی اردو کے خلاف بیان دیتا تو جعفری صاحب بڑے برافروختہ ہوجاتے تھے۔ معروف شاعر کمار پاشی نے کہا تھا کہ وہ اردو کو مردہ زبان سمجھتے ہیں لیکن مجبوراً اردو میں شاعری کرتے ہیں کیوں کہ کوئی اور زبان میں وہ شعر نہیں کہہ سکتے۔ جعفری صاحب کے دل میں کمار پاشی کا یہ بیان کانٹے کی خلش چھوڑ گیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد خلیق انجم نے ''ہماری زبان'' میں کمار پاشی کی غزل شائع کی تو جعفری صاحب سے رہا نہیں گیا اور انھوں نے بلا خوف لومتہ لائم خلیق انجم کو لکھا۔

''ہماری زبان کی اس اشاعت میں کمار پاشی کی غزل بھی دیکھی کیا آپ کی نظر سے ان کا یہ بیان گزرا ہے'' میں اپنے احساسات کا اظہار اردو زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں نہیں کرسکتا۔ اس لیے میں ایک ایسی زبان میں لکھنے پر مجبور ہوں جس سے مجھے محبت نہیں اور جس کا ادبی ورثہ شاندار نہیں۔ یہ (اردو) ایک مردہ زبان ہے'' اس اعتراف کے بعد کمار پاشی کو اردو زبان سے محبت نہیں ہے اور وہ اس کو ایک مردہ زبان سمجھتے ہیں، ان کی شاعری کو انجمن ترقی اردو کے پرچے میں جگہ دینا اردو زبان کی توہین ہے''۔ (مکتوب بنام پروفیسر خلیق انجم مورخہ ۱۰ جون ۱۹۷۵ء)

مکاتیب کے گل ہائے رنگا رنگ سے سردار جعفری کے افکار وتاثرات کی اخاذی کے آخر میں ہم بعض افراد موضوعات کے بارے میں جعفری صاحب کی چیدہ چیدہ آراء نقل کرتے ہیں۔

جوش:

''جوش صاحب توجہ کے مستحق ہیں ان کی عظمت سے انکار کر کے ترقی پسند ادب اور تحریک کو آگے نہیں بڑھایا جاسکتا''۔ (مکتوب بنام ڈاکٹر علی احمد فاطمی مورخہ ۱۰ اگست)

سجاد ظہیر:

''سجاد ظہیر کی خدمات یادگار اور بے مثال ہیں۔ وہ ہمارے لیڈر تھے اور اچھے انسان اور دوست۔ جو انھوں نے کیا اس کو سنہرے حروف میں لکھا جائے گا''۔

(مکتوب بنام ڈاکٹر علی احمد فاطمی مورخہ ۱۶ مارچ ۱۹۹۶ء)

غزل

''اردو کا نظام شاعری غزل کا پروردہ ہے اس لیے شاعری کے نئے مزاج سے نا آشنائی عام ہے۔
میں غزل کا عاشق ہوں لیکن غزل زدہ ہونے کو نیک فال نہیں سمجھتا''

(مکتوب بنام ڈاکٹر علی احمد فاطمی مورخہ ۱۴ جنوری ۱۹۸۸ء)

یونانی آرٹ:

''یونانی آرٹ کے موضوع (Content) اور ہیت (Form) الگ الگ نہیں کیے جاسکتے۔ Form بغیر Content کے اپنا کوئی وجود نہیں رکھتا اور Content کے بغیر Form ظاہر نہیں ہوسکتا۔ بغیر لفظوں کے ہم سوچ نہیں سکتے اور معنی کے بغیر کوئی لفظ زبان سے ادا نہیں ہوسکتا۔ پھر وہ جانور کی آواز ہوگا۔ انسان کی زبان سے نکلا ہوا لفظ نہیں ہوگا۔''

رومانیت:

''رومانیت کے بارے میں میرا جو نظریہ ہے وہ بھی ٹھیک سے نہیں سمجھا گیا ہے۔ اسی وجہ سے یہ غلطی ہورہی ہے کہ میرے سر یہ الزام آگیا ہے کہ میں پچھلے پندرہ سال کی ساری شاعری کو رومانی شاعری کہہ کر نظر انداز کر رہا ہوں۔ میں رومانیت کے خلاف نہیں ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ غیر رومانیت ہے۔ میں دراصل Obscure Romanticism کے خلاف ہوں۔''

(مکتوب بنام سلطانہ جعفری۔ مورخہ ۷ مئی ۱۹۵۰ء)

سردار جعفری کے مکتوبات مختلف شخصیتوں پر ان کے Remarks مختلف سیاسی واقعات اور ادبی صورت حال پر ان کے Comments، مختلف موضوعات پر ان کے افکار اور مختلف مسائل میں ان کے موقف کا آئینہ ہیں۔ ان میں جعفری صاحب کے وسیع علم و مطالعہ کے علاوہ عمیق غور و تفکر اور برسوں کا تجربہ و مشاہدہ شامل ہے۔ ان خطوط کے مطالعہ سے بصیرت و آگہی کے نئے دریچے روشن ہوتے ہیں اس لیے گاہے گاہے اس دفتر کی بازخوانی فائدہ سے خالی نہیں۔

پروفیسر نسیم الدین فریس مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بحیثیت پروفیسر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

علی سردار جعفری کا ''سرمایۂ سخن''

پروفیسر وہاب قیصر

''سرمایۂ سخن'' علی سردار جعفری کی مرتب کردہ اردو اشعار کی ایک مختصر سی لغت ہے جو ان کے سانحۂ ارتحال کے پورے ایک سال بعد 2001ء میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ ان کی تمام شائع شدہ کتابوں میں یہ سب سے آخری کتاب ہے جو لغت نویسی کی روایت سے ہٹ کر مختلف انداز میں لکھی گئی ہے۔ وہ اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ یہ لغت کسی فرہنگ نویس کی لکھی ہوئی نہیں ہے بلکہ یہ ایک شاعر کی لکھی ہوئی ہے جو اپنے ذوق سخن کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس لیے اس میں لغت نویسی کے آداب کی پوری پابندی نہیں کی گئی ہے۔ ''سرمایۂ سخن'' کا پیش لفظ شاہد مہدی نے ''پیش گفتار'' کے زیر عنوان لکھا ہے۔ جس میں انھوں نے اس کو لغت نویسی اور تذکرہ نگاری سے مختلف قرار دیا ہے۔ انھوں نے علی سردار جعفری کی ستائش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے اس کام کے ذریعہ اپنے اجتہادی ذہن کا ثبوت دیا ہے۔

علی سردار جعفری کی اس لغت کی ندرت پر بات کرنے سے پہلے جب ہم اردو کی دستیاب فرہنگوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں مختلف اقسام کی لغات سے سابقہ پڑتا ہے۔ اکثر و بیشتر ہم نے ایسی لغات دیکھی ہیں جن میں عربی، فارسی اور ترکی کے قدیم و مروجہ الفاظ، مرکبات، محاورات، ضرب الامثال کے تلفظ کے ساتھ معنی و مفہوم تحریر کر دیے گئے ہیں۔ ان میں فیروز اللغات، کریم اللغات، غیاث اللغات، لغات کشوری، لغات فیروزی، لغات سعیدی، لغات اردو، اردو لغت، مختصر اردو لغت، فرہنگ عامرہ، فرہنگ امیر، جمع الالفاظ اور مجموعۂ الفاظ ضروری شامل ہیں۔ ایسی بھی لغات ہماری نظروں سے گزری ہیں جن میں الفاظ کا مفہوم تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ آصف اللغات کا شمار ایسی ہی لغت میں ہوتا ہے۔ عصری لغت کے نام سے پروفیسر عبدالحق کی مرتب کردہ ایک ایسی لغت ہے جس میں اردو الفاظ اور ان کی تراکیب کے معنی دیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں اس میں معنی کے ساتھ ان کی تصاویر کی طباعت بھی عمل میں لائی گئی ہے۔ چند لغات ایسی بھی مرتب کی گئی ہیں جن

میں جہاں کہیں ضروری ہو معنی و مفہوم کے ساتھ الفاظ پر مشتمل اشعار دے دیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر نور اللغات اور فرہنگ آصفیہ کی جلدیں قابل ذکر ہیں۔

ہمارے علم کے مطابق ترقی اردو بورڈ کراچی سے پانچ جلدوں پر مشتمل ''اردو لغت'' کے نام سے ایک ایسی فرہنگ شائع ہوئی ہے۔ جس میں الفاظ کے معنی و مفہوم کے ساتھ کہیں کہیں ان الفاظ پر مشتمل اشعار دیے گئے ہیں اور کہیں مشہور کتابوں سے ان الفاظ پر مشتمل جملے نقل کر دیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں تو اشعار اور جملے دونوں ہی پیش کر دیے گئے ہیں۔ ہمارے مشاہدے میں ایسی فرہنگیں بھی آئی ہیں جو صرف الفاظ کے صحیح تلفظ کی جانکاری کے لیے لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ علی احمد جلیلی نے ''اردو تلفظِ لغت'' کو مرتب کیا ہے۔ جس کو آندھرا پردیش اردو اکیڈمی نے شائع کیا تھا۔ اس لغت میں حروف تہجی میں الفاظ اور ان کے مقابل الفاظ پر مشتمل مشہور شعرا کا ایک ایک شعر مع تخلص نقل کر دیا گیا ہے۔ عصمت جاوید نے ''تلفظ نما اردو لغت'' کے نام سے ایک نادر لغت مرتب کی ہے۔ جس میں حروف تہجی میں مرتب کیے گئے ہر لفظ کی عربی، فارسی اور ہندی ماخذ کی نشاندہی، ہجوں کے ساتھ تلفظ اور ان کے معنی درج کر دیے گئے ہیں۔ بقول عصمت جاوید ''یہ لغت اپنی نوعیت کی پہلی لغت ہے۔ جس میں اردو تلفظ کو پہلی بار سند کا درجہ دیا گیا ہے۔''

شان الحق حقی نے الفاظ کے تلفظ کے لیے ''فرہنگ تلفظ'' مرتب کیا ہے۔ جس کو مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے شائع کیا ہے۔ اس میں الفاظ کے حقیقی تلفظ کے بجائے اردو الفاظ کے معیاری تلفظ خاص کر جو دہلی میں مروج تھا اس کو پیش کیا گیا ہے۔ وارث سرہندی نے اردو ضرب الامثال کا ایک جامع مجمع ''جامع الامثال'' نام سے لغت مرتب کی تھی جس کی نظر ثانی شان الحق حقی نے کی ہے اور مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد نے شائع کیا ہے۔ اس لغت میں حروف تہجی میں ضرب الامثال کا مفہوم تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

علی سردار جعفری نے سرمایۂ سخن میں اپنے دیباچے کے علاوہ ذوق جمال، لحنِ داؤدی، مقبول استعاروں کا خزانہ، استفادہ اور ضمیمہ جیسے عنوانات کے تحت الفاظ اور شعری آہنگ کا حسین امتزاج پیش کیا ہے۔ دیباچے میں وہ لکھتے ہیں کہ اس لغت کے مرتب کرنے میں ان کی یہ خواہش تھی کہ الفاظ کو ڈھونڈ کر شعر کا مطلب سمجھنے کی بجائے فرہنگ میں دیے گئے ترجمے کی مدد سے غالبؔ کے الفاظ کو پہچاننے کی کوشش کی جائے۔ جس کے نتیجے میں الفاظ اپنے حسن کو چھپا نہیں سکیں گے۔ ان کا یہ ماننا تھا کہ لفظ سے معنی تک پہونچنا ایک جمالیاتی عمل ہے اور

لفظ صرف پڑھے ہی نہیں جاتے بلکہ چکھے اور سونگھے بھی جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ سنگیت کی طرح سنے بھی جاتے ہیں۔ یہ بات تو سمجھ میں آجاتی ہے کہ جب کوئی اچھی لحن رکھنے والا قاری بہ آواز بلند کسی تحریر کی قرأت کرتا ہے تو اس تحریر کے الفاظ سنگیت کی طرح سنے جاسکتے ہیں۔ لیکن الفاظ کے چکھنے اور سونگھنے کی بات انشاء پردازی کی حد تک تو ٹھیک ہے مگر عملی طور پر اس کی صداقت کے سلسلے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ علی سردار جعفری کے اس دیباچے سے ایک نئی بات کا علم ہوا کہ انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں بیت بازی کے لیے جو اشعار یاد کیے تھے وہ اس لغت کے مرتب کرنے میں بڑے معاون ثابت ہوئے۔

سرمایۂ سخن میں ''لحنِ داؤدی'' کے زیرعنوان انھوں نے اپنے مقالے میں شاعری سے متعلق سیر حاصل بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ماقبل تاریخ کا انسان اشعار بولنے اور گانے لگا تھا۔ اس کے لیے شاعری ہی رقص و نغمہ تھی۔ یہاں تک کہ قدیم آسمانی صحیفوں کی تحریریں یا تو شاعری میں تھیں یا شاعری کا درجہ رکھتی تھیں جو پہلی مرتبہ ہونٹوں سے نکل کر لوگوں کے کانوں تک پہنچی اور انھیں متاثر کیا۔ شاعری سے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ یہ گانے سنانے اور سننے کی چیز ہے۔ شاعری اگر اچھی ہو تو یہ تحریر میں بھی اچھی ہوتی ہے اور سنانے میں بھی۔ یہاں تک تو یہ باتیں ٹھیک لگتی ہیں۔ لیکن اس مقالے میں دو باتیں کھٹکتی ہیں۔ ایک اس کا عنوان 'لحنِ داؤدی' کیوں کر ہوسکتا ہے جب کہ اس میں شاعری اور نثر میں شاعرانہ انداز تحریر پر بات کی گئی ہے۔ اس میں آہنگ کو تو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ دوسری بات وہ جملہ ہے جس سے یہ تحریر شروع ہوتی ہے:

''شاعری لحنِ داؤدی ہے۔''

لحن کا تعلق تو آواز یا خوش خوانی سے ہے۔ داؤد علیہ السلام جب اپنی خوش خوانی میں زبور کی تلاوت کیا کرتے تھے تو پرندے ان کے اطراف جمع ہوجاتے تھے۔ یہ ممکن ہے کہ زبور کے الفاظ میں نغمگی ہو۔ لیکن الفاظ کی ترتیب لحن نہیں ہوسکتی۔ ایسی صورت میں علی سردار جعفری کا یہ بیان کہ شاعری لحنِ داؤدی ہے کی صحت پر ایک سوالیہ نشان کھڑا ہوجاتا ہے۔

سرمایۂ سخن میں علی سردار جعفری کی تصنیف ''ترقی پسند ادب 1953'' سے ایک اقتباس کو ''ذوقِ جمال'' کے عنوان کے تحت شامل کیا گیا ہے۔ جب کہ ''استفادہ'' کے عنوان کے تحت ان کی ایک مختصر سی تحریر بھی شامل ہے۔ اپنی اس تحریر میں وہ دو باتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ پہلی بات شاعری میں چوں کہ ایک ہی لفظ کا الگ

الگ استعاروں کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے سرمایۂ سخن میں بعض مقامات پر مضامین کے تکرار کا گمان ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ پیش رو شعرا اور اساتذہ کے کلام سے متاخرین شعرا کے استفادہ کی پوری پوری گنجائش باقی رہتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس کی چند مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ جیسے ذوقؔ کا ایک شعر ہے جس میں ''چراغ رخِ زیبا'' کی ترکیب استعمال ہوئی ہے اور اسی ترکیب کو اقبالؔ نے اپنی نظم ''شکوہ'' میں استعمال کیا ہے۔ دونوں شعرا کے اشعار ملاحظہ کیجیے۔

ذوقؔ کا شعر ہے:

مجھ سا مشتاقِ جمال ایک نہ پاؤگے کہیں
لاکھ ڈھونڈوگے چراغ رخِ زیبا لے کر

اقبالؔ کہتے ہیں:

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈ چراغ رخِ زیبا لے کر

علی سردار جعفری نے ایسے الفاظ جو شاعری میں ایک ہی طرح سے استعاروں کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں اور ان استعاروں کو مختلف شعراء نے اپنے کن کن اشعار میں استعمال کیا ہے انھیں ''مقبول استعاروں کا خزانہ'' کے زیرِ عنوان یکجا کر دیا ہے۔ اس ترتیب کے لیے انھوں نے دس مثالیں رقم کی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک ہی طرح کے استعاروں کے لیے الفاظ پیش کیے جاتے ہیں۔ گل، گلستاں، گلزار، چمن، باغ، باغیچہ، کلی، غنچہ، خار، کانٹا، بلبل، آشیاں، قفس، صیاد، سرو، شمشاد، صنوبر، باغباں، گل چیں، قمری، نسیم، بادصبا، بادِنسیم، بہار، خزاں، روِش، سبزہ، خیاباں، برگ، بار، پتہ، بوٹا وغیرہ۔ ان استعاروں کے لیے انھوں نے یہ اشعار پیش کیے ہیں:

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا (میر تقی میرؔ)

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی (سوداؔ)

چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا (مصحفی)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں (غالبؔ)

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے (ثاقب لکھنوی)

ہم ہی گلشن میں نہ آئے لوٹ کر
موسم گل بار بار آتا رہا (جاں نثار اختر)

سرمایۂ سخن میں علی سردار جعفری نے جو لغت مرتب کی ہے وہ ''ضمیمہ'' کے زیر عنوان شامل ہے۔ اس لغت کی ندرت یہ ہے کہ الفاظ اور ان کی تراکیب کے تمام شیڈس معنی کے ساتھ اور ان پر مشتمل اشعار دیے گئے ہیں۔ اس میں انھوں نے کہیں ایک، کہیں دو اور کہیں تو 137 اشعار تک کا سہارا لیا ہے۔ اس لغت کو انھوں نے اتنا مفصل لکھا ہے کہ وہ ''آ'' سے شروع ہوکر ''آیۂ رحمت'' پر ختم ہو جاتی ہے جو 260 صفحات پر محیط ہے۔ اس پوری لغت میں جہاں بھی کوئی لفظ ایسا آیا ہے جو کسی شاعر کا تخلص ہو تو اس کی مکمل سوانح کے ساتھ اس شاعر کا منتخب کلام بھی پیش کیا گیا ہے۔ ان شعرا میں نجم الدین آبروؔ، حیدر علی آتشؔ، منشی شیو نارائن آرامؔ، سید انوار حسین آرزوؔ لکھنوی، سراج الدین آرزوؔ، جگن ناتھ آزادؔ، محمد حسین آزادؔ، الطاف احمد آزادؔ انصاری، کپتان الکزنڈر لی آزادؔ اور صدر الدین آزردہؔ شامل ہیں۔ اس لغت میں جہاں پر لفظ آدمی آیا تو علی سردار جعفری نے نظیر اکبر آبادی کی شاہکار طویل نظم ''آدمی نامہ'' کے تمام بند پیش کر دیے ہیں۔ لغت میں جہاں لفظ آوارہ آیا تو انھوں نے اس کے تمام معنی اور اختر واجد علی شاہ کا اس پر مشتمل یہ شعر پیش کیا ہے:

فاحشہ ہے وہ سخت آوارہ
یار ہیں اس کے اب بھی دس بارہ

علی سردار جعفری لفظ آوارہ سے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ جدید اردو شاعری کا اہم لفظ ہے جس نے اپنے دامن میں ترقی پسند اور اس کے بعد آنے والی نئی شاعری کے بہت سے تصورات کو سمیٹ لیا ہے اور ان تصورات نے اس بدنام لفظ کو ایک شاعرانہ بانکپن دے دیا ہے''۔ (صفحہ 258)

اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ کس طرح میر تقی میر نے لفظ آوارہ کو پریشان حالی' مصیبت اور در بدر مارے پھرنے کے مفہوم میں اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ اس کے بعد غالب کے ذریعہ لفظ آوارگی کو اپنے اشعار میں استعمال کرنے کا تذکرہ اور پھر مجاز کی نظم ''آوارہ'' کو قلم بند کرتے ہوئے اس کا تفصیلی جائزہ لیا اور اس نظم کی ملک میں مچی دھوم پر روشنی ڈالی ہے۔

علی سردار جعفری کی اس لغت سے یہاں چند الفاظ' ان کے معنی اور ان پر مشتمل اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

آتش بار= آگ برساتا ہو — جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے (غالب)

آدمیت=انسانیت — میں شراب و ہم آبائی کا متوالا نہیں
آدمیت سے کوئی شے دہر میں بالا نہیں (جوش ملیح آبادی)

اک نہ اک در پر جبینِ شوق جھکتی ہی رہی
آدمیت ظلم کی چکّی میں پستی ہی رہی

''آ'' کو لفظ کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں وہ رقم طراز ہیں کہ یہ لفظ دراصل وہ آواز ہے جس سے کسی کو بلایا جاتا ہے۔ اردو شاعری میں معنی کی نازک تبدیلیوں اور محاوروں کے ساتھ بڑے ہی خوبصورت انداز سے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا ایک استعمال پیار کے ساتھ بلانا' مخاطب کرنا یا اپنے ساتھ شریک کرنا ہے۔ تھوڑے سے طنز اور بے تابی کے ساتھ بلانا' غصے میں آواز دینا یا مقابلے کے لیے بلانا بھی ہے۔ ایک مفہوم آ کا بے قرار ہو جانا بھی ہے۔

اشعار میں ان تمام معنوں کے لیے آ کا استعمال کس طرح ہوا ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

پیار کے ساتھ بلانا: — آ کہ میری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے (غالب)

تھوڑا سا طنز اور بے تابی:
آ کہیں وعدہ فراموش کہ فرصت کم ہے
دم کوئی دم میں قدم بوسِ قضا ہوتا ہے (تسلیم)

غصے میں آواز دینا:
دون کی لیتا ہے مسجد میں سر منبر شیخ
مردی گر ہے تو بزم بت مے نوش میں آ (میر)

مقابلے کے لیے بلانا:
آ نکل کے میدان میں دورخی کے خانے سے
کام چل نہیں سکتا اب کسی بہانے سے (مجروح)

گویوں کو سر ملانے اور سم بتانے کی آواز:
گانے میں غضب کملو یاروں کو رجھاتی ہے
ہر لے کے دھماکے پر آ کہہ کے بلاتی ہے (نامعلوم)

بے قرار ہو جانا:
پیاس ایسی تھی آ آ گئی جاں ہونٹوں پر
صبر ایسا تھا کہ پھیری نہ زباں ہونٹوں پر (انیس)

علی سردار جعفری کے مطابق ''آخر'' کے آٹھ معنی ہوتے ہیں۔ اس کے معنوں کے ساتھ تفہیم کے لیے اشعار دیے گئے ہیں:

(1) پیچھے، پچھلا، ختم ہونے کے قریب، تمام
اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مدت کے بعد وہ شاہیں زیر دام آیا (اقبال)

(2) اول کی ضد، انت، انتہا، انجام، زیادہ، نتیجہ، حاصل
غفلت میں جوانی کی نہ پیری سے ہو غافل
لازم ہے کہ ہر شام کے آخر سحر آوے (جرأت)

(3) تمام اور ختم ہونے کے معنی میں
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانہ ہرگز (حالی)

(4) پچھلا اور پچھلا سرا (صفت)
آغاز کسی شے کا نہ انجام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا (نظیر اکبر آبادی)

(5) ضرور، مناسب، واجب، لازمی
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر
تا نہ دے باد ز مہریر آزاد (غالب)

(6) تھک ہار کر، مجبوراً، ناچار

جب سبزہ و گل میں لہلہاتے
صحبت کے مزے ہیں یاد آتے
آخر نہیں پایا جب کسی کو
دیتا ہوں دعائیں بیکسی کو (حالیؔ)

(7) آخرالامر، آخر کار، ایک دن

یہ شوخیاں تمہاری لکھی ہوئی ہیں دل پر
آخر کبھی تو میرے قابو میں آئے گا (شہیدیؔ)

(8) قطعی، ہرگز

تم اپنے ظلم سے آخر نہ باز آؤ گے یار
چلا نظیر بھی لیجے سلام رخصت کا (نظیر اکبرآبادی))

علی سردار جعفری آخر کی اس بحث کے آخر میں لکھتے ہیں: ''اقبالؔ کی ایک شاندار غزل ہے جس میں ردیف کے طور پر آخر کا بہت بھرپور اور بلیغ استعمال ہے۔'' اس کے بعد انھوں نے پوری غزل رقم کر دی ہے جس کا مطلع ہے:

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر اٹھتے ہیں حجاب آخر (بال جبریل)

سرمایۂ سخن کا بھرپور جائزہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس میں غالبؔ اور اقبال چھائے ہوئے ہیں۔ یعنی ان کے کلام سے بہت زیادہ استفادہ کیا گیا ہے۔ جہاں غالب کی فکر اور شاعرانہ لطافت اس کے صفحات پر بکھری پڑی ہے تو وہیں پر اقبالؔ کی فکر اور ان کا فلسفہ جا بجا زندگی کی گتھیاں سلجھاتا ہوا نظر آتا ہے۔

پروفیسر وہاب قیصر نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اچھا ادبی ذوق اور تنقیدی بصیرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ادبی تحریروں کو سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوئے دلچسپ نتائج اخذ کیے ہیں' 'سائنس کے نئے افق''، ''سوالوں میں رنگ بھرے''، ''مولانا آزاد کے سائنسی مضامین'' (سائنسی مضامین) کے ساتھ ساتھ چار اور تصانیف ہیں جن کا تعلق ادب سے ہے۔ سائنس اور غالب' مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت' مولانا ابوالکلام آزاد اور منظر بچشم غالب شامل ہیں۔ 1968ء میں افسانہ نگاری کے ذریعے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ 300 سے زائد مضامین ملک کے قومی اخبارات اور رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ سائنس اور علمی مضامین اسکول اور یونیورسٹی کی سطح پر مختلف ریاستوں کے اردو نصاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے 2004ء میں حبیب الرحمن کارنامہ حیات ایوارڈ برائے درس و تدریس سے نوازا۔ کتابوں پر بہار، راجستھان، اتر پردیش اور آندھرا پردیش کی اکیڈیموں نے انعامات سے نوازا ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں مختلف اہم اور بڑے عہدوں پر خدمات انجام دے چکے ہیں۔

پیغمبرانِ سخن اور میرؔ

ڈاکٹر ریشماں پروین

اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ایک انقلابی تحریک تھی جس نے قدیم کلاسیکی روایات سے بغاوت کی اور اردو زبان وادب کا رشتہ زندگی اور سماج سے جوڑا، اب تک ادب مسرت آفرینی اور لطف اندوزی کا ذریعہ تھا زندگی سے تعلق کا ذکر یا حالات کا تذکرہ غیر شعوری طور پر اشعار میں آجائے تو آجائے ورنہ ایسے تذکروں کو لوگ شاعری میں نظر انداز ہی کر دیتے تھے ترقی پسند تحریک نے پہلی بار شعوری طور پر سماجی حقیقت نگاری پر زور دیا اور صرف زور ہی نہیں دیا بلکہ ادب کو سماجی تبدیلی کے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا۔

ترقی پسند تحریک نے شعروادب میں ایسی تمام چیزوں کو رد کر دیا جن کا تعلق خیال آرائی اور تصنع سے تھا یہاں تک کہ ایک زمانے میں غزل کی شدید مخالفت کی گئی جو مناسب بات نہیں تھی اور بعض ترقی پسند ناقدین نے اسے ناپسند بھی قرار دیا لیکن غزل کی اس مخالفت سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ نظم گوئی کو فروغ ہوا اور نظم میں موضوع اور ہیئت کے تجربوں کے نئے دروازے وا ہو گئے یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ ایک طرف ترقی پسند تحریک قدامت پرستی، غزل اور قدیم روایات کو رد کر رہی تھی اور دوسری طرف میر کی از سرِ نو بازیافت کی کوشش کر رہی تھی' ترقی پسند ناقدین کی تحریروں نے میرؔ کو ایک نئے سیاق میں سمجھنے کی کوشش کی' مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، آل احمد سرورؔ اور دوسرے ترقی پسند ناقدین نے میرؔ پر مضامین لکھے اور میر کو سماجیاتی مطالعے اور عہد میر کے سیاسی اور سماجی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی ترقی پسند ناقدین کا تفہیم میرؔ کے سلسلے میں یہ بہت بڑا کارنامہ تھا۔

میرؔ کے بارے میں ایک اہم نکتہ جس کی طرف تمام ترقی پسند ناقدین نے توجہ دلائی وہ میر کے قنوطی شاعر ہونے کی تردید ہے ترقی پسند ناقدین نے میرؔ کو ایک ایسا شاعر قرار دیا ہے کہ جس نے ایک طرف توظلم وستم کی انتہا کو رمزیہ انداز میں پیش کیا وہیں دوسری طرف مظلوموں کے انتقام، ان کے احتجاج اور ان کی شان مقاومت کو بھی بیان کیا۔ ان کا خیال ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے میرؔ کی شاعری ان کی زندگی کی پوری طرح

عکاسی کرتی ہے ہم میرؔ کے عہد کو ان کی شاعری میں زندہ سانس لیتا، چلتا دیکھتے ہیں اس اہم نکتہ کی طرف سب سے پہلے ترقی پسند ناقدین نے اشارہ کیا۔ صرف میرؔ ہی نہیں بلکہ تمام شخصیتوں کے مطالعے میں ترقی پسند ناقدین نے اسی نقطۂ نظر سے کام لیا' حالانکہ ترقی پسند ناقدین نے غالبؔ یا کسی اور شاعر کے مقابلے میں میرؔ پر کم لکھا ہے لیکن انھوں نے میرؔ کے بارے میں عام نقطۂ نظر کو تبدیل کر دیا کہ میرؔ حرماں نصیب یاس پرست شاعر ہیں ترقی پسندوں کے نزدیک میرؔ زندگی کے شاعر ہیں جو زندگی وہ جیتے ہیں اسی کو اپنے اشعار میں پیش کرتے ہیں ترقی پسند تنقید فنی تخلیقات کو ماحول، سماج، اور زمانے سے جوڑتی ہے ترقی پسند تنقید نے اُردو شاعری کے استعاراتی اور علامتی نظام کو جس طرح ایک نئی معنویت بخشی' اُسی طرح ترقی پسند ناقدین نے میرؔ کی صوفیانہ یا عاشقانہ علامتوں کو ایک نئی جہت دینے کی کوشش کی۔ ترقی پسند تنقید سے پہلے میرؔ عاشق اور قنوطی تھے یا پھر تصوف کے گیت گاتے تھے ترقی پسند ناقدین نے کلام میرؔ کو صرف ان کے اپنے عہد کا عکاس نہیں قرار دیا بلکہ اس کا سلسلہ ہمارے عہد سے بھی ملا دیا' اسی وجہ سے آج ہم میرؔ کو غالبؔ کی بہ نسبت زیادہ قریب محسوس کرتے ہیں اور میرؔ کے کلام میں اپنے جذبات واحساسات کی مصوری کے ساتھ اس تناؤ اور کشمکش کو دیکھ سکتے ہیں جس سے ہم دوچار ہیں اور کلام میرؔ اس تناؤ اور کشمکش کی تنقیہ کرتا ہے۔

ترقی پسند ناقدین میں علی سردار جعفری نقدِ میرؔ کے سلسلے کے اہم نقاد ہیں ان کی کتاب ''پیغمبرانِ سخن'' ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی' مگر میرؔ کی شاعری پر ان کا مضمون رسالہ شاعر میں ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا اس کی اشاعت بعد میں دیوانِ میرؔ کے دیباچے کے طور پر ہوئی' مجنوں گورکھپوری اور احتشام حسین کی طرح علی سردار جعفری نے بھی میرؔ کی شاعری کا سلسلہ ان کے عہد میں تلاش کیا۔ علی سردار جعفری نے لکھا ہے کہ عظیم ادب کی جڑیں اس عہد کی زمین میں پیوست ہوتی ہیں لیکن پھول اور پھل عہد کی حدوں کو توڑ کر باہر نکل آتے ہیں علی سردار جعفری کا خیال ہے کہ میرؔ کی شاعری ان کے عہد سے مربوط بھی ہے اور ماوراء بھی' یہی سبب ہے کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے وقت نوجوان شاعروں نے دو سو برس گزر جانے کے بعد بھی غالبؔ، اقبالؔ اور جوشؔ کو چھوڑ کر میرؔ کے دامن میں پناہ لی' میرؔ کے عہد کے اقتصادی خسارے اور معاشرتی زوال کی اندوہناک تصویریں ان کی شاعری میں محفوظ ہیں۔

پیغمبرانِ سخن میں علی سردار جعفری نے مطالعہ میرؔ کے چار عنوانات قائم کیے ہیں:

(۱) تمہید (۲) افسانہ (۳) حقیقت (۴) شاعری

میرؔ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے علی سردار جعفری ان کو خدائے سخن کہتے ہیں، ان کے خیال میں غالبؔ اور اقبالؔ عظیم شاعر ضرور ہیں مگر میرؔ کی استادانہ حیثیت مسلم ہے ہر بڑے شاعر نے میر کی شاعرانہ عظمت اور میرؔ سے اثر پذیری کا اعتراف کیا ہے ۱۹۴۷ء اور میر کے عہد میں ایک طویل فاصلہ ہے، خود جعفری نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی پورے دو سو برس۔ اس دو سو برس بعد بھی اگر میرؔ کی شاعری دوسرے شعراء کو اپنے دامن میں پناہ دیتی ہے تو یہ میرؔ کا زبردست کارنامہ ہے جعفری نے اس کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

''عظیم شاعری صدیاں گزر جانے اور حالات تبدیل ہو جانے اور زبان کے انداز بدل جانے کے بعد بھی ہماری تسکین کا باعث ہوتی ہے خود میرؔ نے بار بار یہ بتایا ہے کہ ان کی شاعری ان کے عہد کی ترجمان ہے''۔ [۱]

''حقیقت'' عنوان کے تحت علی سردار جعفری میرؔ کی زندگی میں پیش آنے والے ان حالات کا ذکر کرتے ہیں جن کا سامنا میرؔ نے زبردست ہمت و حوصلے کے ساتھ کیا دراصل اس حصے میں انھوں نے ''ذکر میرؔ'' سے ان واقعات کو نقل کیا ہے جنھوں نے کلامِ میرؔ پر گہرے نقش ثبت کیے' میرؔ کا بچپن تلاشِ معاش میں گزرا، والد کے ایک مربی امیر الامراء صمصام الدولہ بھی طویل عرصہ تک ان کا ساتھ نہ دے سکے' تلاش معاش نے دوبارہ دلّی جانے پر مجبور کر دیا مگر میرؔ کا دل اس بار کہیں لگ چکا تھا۔

آگرے اور محبوب سے جدائی نے میرؔ کے دل میں غم عشق اور غم روزگار دونوں کی آگ کو بھڑکا دیا اور بقول جعفری ''دونوں غم اس طرح گھل مل گئے تھے کہ پھر عمر بھر پتہ نہ چلا کہ میرؔ نے اپنے شعر میں کون سا غم پیش کیا'' مگر میرؔ کے دوبارہ دہلی پہنچنے تک دلی نادر شاہی حملے میں فقیر ہو چکی تھی، میرؔ کچھ روز اپنے ماموں سراج الدین علی خاں آرزوؔ کے یہاں رہے ۱۷۴۸ء میں وہ رعایت خاں کے مصاحب ہو گئے مگر یہ مصاحبت تھوڑے ہی عرصے قائم رہی کیونکہ اس دور کی دلّی کی بنیادوں میں طوفان چھپے ہوئے تھے یہ مغل سلطنت کے زوال اور خانہ جنگیوں کا دور تھا پہلے سے کمزور دلّی کو نادر شاہی حملوں نے اور کمزور کر دیا' صوبے داروں کی بغاوت نے مزید تباہی لا دی' چاروں طرف افلاس کا عالم تھا، شہزادے اور شہزادیاں تک فاقے کا شکار تھے اسی تباہ حالی میں مغربی سرحدوں کی طرف سے احمد شاہ ابدالی کے حملے شروع ہو گئے جن کا سلسلہ ۱۷۴۸ء سے تقریباً بیس برس تک جاری رہا۔ ان متواتر حملوں اور خانہ جنگیوں سے دلّی ایسی تباہ و برباد ہوئی کہ پھر ڈیڑھ دو سو برس تک آباد نہ ہو سکی'

کتنے ہی ہنگامے میرؔ کی آنکھوں کے سامنے بھی ہوئے اور کتنی ہی بار موجِ خون دہلی کے سر سے گزر گئی میرؔ خود بھی بہت سی لڑائیوں میں ہاتھ میں تلوار لے کر گئے، انھوں نے فتح سے زیادہ شکست دیکھی احمد شاہ ابدالی کے پہلے حملے کے وقت میرؔ ۱۷۴۸ء میں رعایت خاں کے ساتھ لاہور میں موجود تھے اور پانی پت کی تیسری لڑائی ۱۷۶۱ء کے تماشائی بھی تھے اسی لڑائی میں میرؔ کا گھر بھی تباہ ہوا۔ علی سردار جعفری نے لکھا ہے:

''اس عہد کے مالی نقصان اور اخلاقی پستی کی اندوہناک تصویریں میرؔ کی شاعری اور آپ بیتی ''ذکرِ میرؔ'' میں محفوظ ہیں''۔ ۲

وہ '' ذکرِ میرؔ'' سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جب میرؔ اچانک اس محلے میں جا نکلتے ہیں جہاں انھوں نے کبھی ایک بارونق زندگی دیکھی تھی مگر احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے بعد وہاں کی حالت میرؔ کی زبانی سنئے۔

''ناگاہ اس محلے میں آنکلا۔ جہاں میں لمبی لمبی زلفوں والوں کے ساتھ رہتا تھا اب کوئی ایسا مانوس چہرہ نظر نہ آیا جس سے دو باتیں کر لیتا اس وحشت انگیز گلی سے نکل کر ویران راستے پر آ کھڑا ہوا اور حیرت سے دیکھتا رہا۔ بہت صدمہ اٹھایا اور یہ عہد کیا کہ اب ادھر نہ آؤں گا اور جب تک زندہ رہوں گا شہر کا قصد نہ کروں گا''۔ ۳

دہلی کی اس تباہی اور بربادی کا شکار عام لوگوں کے ساتھ ساتھ میرؔ کی سرپرستی کرنے والے امرا اور روسا بھی ہوئے ان تلخ تجربات کا عکس میرؔ کے کلام میں جا بجا نظر آتا ہے:

کس طرح آہ خاکِ مذلت سے میں اٹھوں
افتادہ تر جو مجھ سے مرا دستگیر ہو

تو ہے بے چارہ گدا میرؔ ترا کیا مذکور
مل گئے خاک میں یاں صاحب افسر کتنے

بادشاہ احمد شاہ کا ۱۷۵۴ء میں اندھا کیا جانا اور پھر اس کی جگہ عالمگیر ثانی کا پچپن سال کی عمر میں تخت پر بٹھایا جانا، اور بہت سے نااہل اور ذلیل لوگوں کا برسرِ اقتدار آنا یہ اور ایسے بہت سے واقعات تھے جن کی طرف میرؔ نے اپنے کلام میں اشارہ کیا ہے ان تمام حالات سے پریشان ہو کر میرؔ نے گوشہ نشینی اور فاقہ کشی کی زندگی اختیار کر لی، مگر وہاں بھی انھیں سکون نہ مل سکا اور مرنے کی خواہش نے دل میں سر اٹھانا شروع کیا:

رہتے ہیں داغ اکثر نان و نمک کی خاطر

جینے کا اس سمے میں اب کیا مزا رہا ہے

فکر معاش یعنی زیست تابہ کے

مر جایئے کہیں کہ ٹک آرام پایئے

میرؔ کی قسمت بھی عجیب تھی، انھیں زندگی میں کبھی سکون نہ مل سکا۔ دلّی کی تباہی و بربادی (۱۷۸۲-۸۳ء) اور اجڑنے کے بعد میرؔ نے لکھنؤ کی راہ لی مگر وہاں بھی انھیں اطمینان میسر نہ ہو سکا' جس کی غمازی ان کے اشعار سے بخوبی ہوتی ہے۔

علی سردار جعفری کلام میرؔ میں صرف اُن کے عہد کی عکاسی کا ہی ذکر نہیں کرتے بلکہ اُن کے خیال میں قرونِ وسطیٰ میں شروع ہوئی تصوّف کی تحریک نے جس انسان دوستی کا درس دیا اُس کے اثرات بھی میرؔ کے یہاں موجود ہیں میرؔ کا غم انفرادی نہیں اجتماعی ہے، میرؔ کے عہد کے انسان کی طرح میرؔ کی شاعری کا عاشق بھی ایک ایسا مجروح شخص ہے جو اپنا کھویا ہوا وقار واپس مانگ رہا ہے۔

جعفری نے میرؔ کی غزلوں کا تجزیہ جس خوبصورت انداز میں کیا ہے، وہ قابل تحسین ہے ان کا خیال ہے کہ میرؔ کی غزلوں میں ایسے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے جس میں انھوں نے براہ راست سماجی معاشی اور سیاسی مضامین کو شعر کے پیکر ڈھال دیا ہے ظالم حکمرانوں کے سامنے کسی بات کا براہِ راست کہنا مشکل امر ہے، یہی سبب ہے کہ شاعر یا ادیب اپنی بات اشاروں اور کنایوں میں کہتا ہے، خود ترقی پسند شعراء نے اپنی بات کہنے کے لیے علامتوں کا سہارا لیا یہی خوبی سردار جعفری کو کلامِ میرؔ میں نظر آئی' لکھتے ہیں:

''اس براہِ راست انداز بیان کے علاوہ میرؔ نے اپنے عہد کے مظالم اور انسانی شخصیت کی شکست و ریخت کو محبوب کے پردے میں بھی بیان کیا ہے اور پردے کو اُٹھانے کی خود ہی ترغیب بھی دی ہے''۔ ؎

اس دور کے بیرونی حملوں میں ہوئے مظالم اور اس عہد کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے ہوئی تباہی میں معاشرہ جس طرح ٹوٹ کر بکھرا، اور پھر کس طرح اس عہد کے لوگ اپنا وقار اور اپنی شخصیت کھو بیٹھے' کس طرح لوگوں کے بسے بسائے گھر اُجڑ گئے؟ میرؔ نے بقول جعفری ''ان تمام واقعات کو علامتوں کے ذریعہ بیان کیا'' کیونکہ براہِ راست کوئی بات کہنا شاید میرؔ کے لیے اس وقت ممکن نہ تھا اسی لیے وہ محبوب کو ظالم' سفاک، گھٹیا،

کمینہ، اوباش، بدمعاش، خونخوار، خوں ریز، جھوٹا، مکّار، سبھی کچھ کہہ کر اپنی بات کو علامت کے پردے میں ادا کرتے ہیں اس کی وضاحت جعفری ایک تمثیل کے ذریعہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''محبوب کی سیہ آنکھوں کی تعریف سبھی شعراء نے کی ہے لیکن میرؔ نے ان کو''سیہ رو''اور''سیہ کاسہ'' کہہ کر گالی بھی دی ہے سیہ رو کے معنی بدچلن اور بدنام کے ہیں اور''سیہ کاسہ'' کنجوس کو کہتے ہیں۔ میرؔ کے عہد کی ایک لغت (مرتبہ: شیکسپیر) میں اس کے معنی چنڈال بھی لکھے ہیں اور میرؔ یقیناً اس مفہوم سے واقف ہوں گے اس شاعری میں صرف آسمان ہی نہیں جو تقدیر اور وقت کا کنایہ ہے (اور سماجی نظام کا مفہوم بھی اختیار کر لیتا ہے) بلکہ محبوب کی آنکھ بھی سیہ کاسہ اور سیہ رو ہے ساتھ ہی ساتھ یہ محبوب ظالم اور سفاک بادشاہوں، حکمرانوں اور فاتحوں کی ذات میں تبدیل ہو جاتا ہے اس کا آنا تباہی لاتا ہے اس کے راستوں میں خون کے دریا موجیں مارتے ہیں لاشیں پڑی رہتی ہیں اور زمین کے سینے پر فوجوں کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔[5]

جعفری نے میرؔ کے ایسے بہت سے اشعار بطور مثال پیش کئے ہیں، جہاں محبوب کو مخاطب کر کے میرؔ نے اپنے عہد کی کشمکش اور خوں ریزی کی پوری داستان شعر کے پردے میں بیان کر دی ہے۔

سردار جعفری کے مضمون کو پڑھ کر نہ صرف یہ کہ میرؔ کی شاعرانہ عظمت کے کئی نئے پہلو سامنے آتے ہیں بلکہ خود ترقی پسند تنقید کے تصورات سے بھی واقفیت ہوتی ہے، یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ میرؔ پر سردار جعفری کا یہ مضمون اُردو میں سماجیاتی تنقید کا نقشِ اوّل ہے سماجی تنقید پر تو ہر ترقی پسند نقاد نے زور دیا یعنی شاعر کے ماحول اور اس کے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کے پیشِ نظر شاعر کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن سردار جعفری نے شاعر کے کلام اور شعر کے استعاراتی اور علامتی نظام کی تشریح و توضیح کے ذریعہ اس زمانے کے حالات اور تصورات کا مطالعہ کیا، جس کی وجہ سے میرؔ کا یہ مطالعہ تفہیمِ میرؔ کا ایک نیا لطف رکھتا ہے۔

میرؔ کے تصورِ محبوب کے سلسلے میں سردار جعفری نے ایک بہت اہم بات لکھی ہے جس پر جتنا غور کیا جائیگا اس سے اتنے ہی نکات برآمد ہوتے رہیں گے انھوں نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ:

''شیکسپیر کے ڈرامے میکبتھ میں جب اپنے مجرم ضمیر کی ستائی ہوئی لیڈی میکبتھ خواب میں چلتی ہے تو وہ اپنے ہاتھوں کو اس انداز سے ملتی رہتی ہے جیسے انھیں دھونے کی کوشش کر رہی ہو لیکن خونِ بے گناہ کے دھبے کسی طرح نہیں چھوٹتے اور وہ بڑبڑاتی ہے کہ عرب کا عطر بھی اس کے ہاتھوں سے

خون کی بو کو دور نہیں کر سکتا''۔ میر کا وہ محبوب بھی جو سفاک بادشاہوں اور خون ریز فاتحوں کا کنایہ ہے، اپنے ہاتھ ملتا رہتا ہے اس نے اپنی آرائش مظلوموں کے خون سے کی ہے انسانوں کے کلیجے پر ہاتھ ڈالا ہے تب ہتھیلیوں نے حنا کا رنگ اختیار کیا ہے اور یہ خون کسی طرح نہیں چھوٹتا''۔ ٦

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سردار جعفری نے میر کی شاعری میں معنوی تہہ داری اور سماجی اشاروں کی جس دنیا کو دریافت کیا اس پر اس سے پہلے اس طرح سے غور نہیں کیا گیا تھا ترقی پسند تنقید شاعری یا دوسری فنی تخلیقات کو ماحول، سماج، زمانہ اور ذرائع پیداوار سے جوڑتی ہے بظاہر یہ باتیں بہت عجیب لگتی ہیں کہ شاعری سے ان باتوں کا کیا تعلق، شاعری، شاعری ہے اسی بات پر بعد کے جدید ناقدین نے زور دیا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ شاعری یا کسی بھی فنی تخلیق کو اس کے ان رشتوں سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا جن سے خود اس کا تخلیق کار وابستہ ہے اسی لیے جب سردار جعفری کا یہ مضمون سامنے آتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ میر کی شاعری صرف ان کے دل کا درد و کرب نہیں ان کے عہد کی ایک ایسی چیخ ہے جس کی گونج آج تک سنائی دیتی ہے۔

سردار جعفری کا مضمون ترقی پسند نقطۂ نظر سے دیکھا جائے یا صرف مطالعہ میر کے حوالے سے یہ بہر صورت نقد میر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ترقی پسند تحریک نے اردو شاعری کے استعاراتی اور علامتی نظام کو جس طرح نئی معنویت عطا کی ہے اسی طرح ''مطالعۂ میر'' میں سردار جعفری نے میر کی عصری علامتوں کو ایک نئی سمت دینے کی کوشش کی ہے اس طرح تفہیم میر کے سلسلے میں علی سردار جعفری ایک منفرد اور اہم مقام رکھتے ہیں، ان کے نظریۂ تنقید نے میر ہی نہیں بلکہ دوسرے شعراء کے مطالعے کے سلسلے میں بھی نئی راہوں کا اضافہ کیا۔

١۔ علی سردار جعفری۔ پیغمبران سخن۔ دیباچہ ص۔ ٦٧۔ مکتبہ گفتگو، بمبئی ١٩٧٠ء

٢۔ علی سردار جعفری۔ پیغمبران سخن۔ دیباچہ ص۔ ١٠٥۔ مکتبہ گفتگو، بمبئی ١٩٧٠ء

٣۔ میر تقی میر۔ ذکر میر بحوالہ۔ آپ بیتی۔ پیغمبران سخن ص۔ ١٠٨

٤۔ علی سردار جعفری۔ پیغمبرانِ سخن۔ ص۔ ١٢٥۔ مکتبہ گفتگو، بمبئی ١٩٧٠ء

٥۔ علی سردار جعفری۔ پیغمبرانِ سخن۔ ص۔ ١٢٦۔ مکتبہ گفتگو، بمبئی ١٩٧٠ء

٦۔ علی سردار جعفری۔ پیغمبرانِ سخن۔ ص۔ ١٣٣۔ ١٣١۔ مکتبہ گفتگو، بمبئی ١٩٧٠ء

ڈاکٹر ریشماں پروین کھن کھن جی گرلس پی جی کالج، لکھنو میں صدر شعبۂ اردو کے عہدے پر فائز ہیں۔ ان کی دو تصانیف 'میر تنقید' (2009) اور 'زیدی ہوں جو سوچ کر دیکھو' (2014) میں منظر عام پر آچکی ہیں۔

علی سردار جعفری بہ حیثیت افسانہ نگار
(منتخب افسانوں کی روشنی میں)

شیخ عمران

سردار جعفری نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا جس سے اُنہیں مقبولیت بھی حاصل ہوئی اور اُن کی شناخت بھی قائم ہوئی لیکن اسی زمانے میں وہ نثری ادب میں بھی دلچسپی لینے لگے تھے جس کا سلسلہ اُن کے انتقال تک قائم رہا۔ جہاں تک سردار جعفری کے افسانوں کا تعلق ہے تو انہوں نے اپنے زیادہ تر افسانے آزادی سے قبل سپردِ قلم کیے ہیں۔ عموماً یہ بات سامنے آتی ہے کہ سردار جعفری کی شخصیت یا شاعری پر بہت زیادہ لکھا جا چکا ہے اور آج بھی اس کا سلسلہ جاری و ساری ہے لیکن اُن کی افسانہ نگاری کے تعلق سے بہت کم لکھا گیا ہے اور اس کی طرف خاطر خواہ کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اُن کے افسانوں میں چند فنی خامیاں موجود ہیں۔ اور وہ افسانے کے معیار پر پورے نہ اُترتے ہو لیکن اس بات کو ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ سردار جعفری کے افسانوں میں ان کا عہد، عورتوں کے مسائل، مزدور، غریبوں کے حالات، امیروں کی نفسیات، اس عہد کی سوچ و فکر اور پورا سماج سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ جس کی نظیر دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں ملنی مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ چند افسانوں کی روشنی میں علی سردار جعفری کی افسانہ نگاری کو بیان کیا جا سکتا ہے۔

سردار جعفری نے اپنا پہلا افسانہ شمع تفاول کے نام سے جنوری ۱۹۳۶ء میں لکھا اور یہ وہی سال ہے کہ ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ سردار جعفری نے اپنے اس افسانے کے ذریعہ افسانوی دنیا میں پہلا قدم رکھا تھا۔ اُن کا یہ افسانہ علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا۔ اس افسانہ میں علی سردار جعفری نے دو گڈریوں پریم اور کامنی کے عشق کی داستان کو خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ اس افسانہ میں اُنہوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ 'پریم' اور 'کامنی' چراگاہ میں گائیں چراتے اور ایک دوسرے سے عشق کرتے نظر آتے ہیں۔ اس افسانہ کی کہانی سحر انگیز ہے۔ افسانے کی پوری فضا پر ایک طرح کا رومان چھایا ہوا ہے جو قاری کو بار بار کرشن چندر کی یاد دلاتا

ہے۔ سردار جعفری نے اس افسانے میں کرداروں کی تخلیق اس چابک دستی سے کی ہے کہ طبقہ کے اعتبار سے ان کے عقائد اور ان کی زبان کافی مطابقت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ تجسس کا عنصر بھی اس افسانہ میں نظر آتا ہے۔ غرض شمع تقاول اُن کا ایک بہترین افسانہ ہے۔

پچھمی سردار جعفری کا دوسرا اہم افسانہ ہے۔ جس میں اُنہوں نے پچھمی نامی ایک لڑکی کے کردار کی جوانی اور بڑھاپے کی زندگی کو مرکزی حوالہ بنا کر مزدوروں اور بے سہاروں کی مجبوریاں، رہن سہن اور ان کی نفسیات کو بیان کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ اس افسانہ کا مرکزی کردار پچھمی ہے۔ جو اپنی جوانی کے آغاز ہی میں بیوہ ہو جاتی ہے اور در بدر ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے اور بالآخر ایک مل میں معمولی سا کام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ لیکن وہاں پر پچھمی کو جان توڑ محنت کرنے کے باوجود مل کے مالک کی جنسی ہوس کا شکار ہونا پڑتا ہے اور جب یہ بات مل کے مزدوروں کو پتہ چلتی ہے وہ سب مل کر مالک کے خلاف احتجاج پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور مل مالک کو پچھمی سے شادی کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ اس بات سے انکار کر دیتا ہے اور مزدوروں کو جان سے مارنے کے لیے فوج بلاتا ہے لیکن مزدور فوج کی گولی سے مارے جانے پر خودکشی کو ترجیح دیتے ہیں اور سب مل کر اجتماعی خودسوزی کر لیتے ہیں اور پچھمی انصاف حاصل کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ افسانہ فنی اعتبار سے تھوڑا کمزور نظر آتا ہے اور اس میں کچھ کمیاں پائی گئی۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''آخر ظلم کے ہاتھوں نے غریب پچھمی کو اس حجلہ عشرت تک پہنچا دیا جہاں گناہوں کے فانوس میں ارتکاب جرم کی شمع جل رہی تھیں۔ جہاں سے کلیاں پھولوں کی شکل میں اور پھول بکھری ہوئی پنکھڑیوں کی صورت میں باہر آتے تھے۔ اس شبستان عشرت میں حسن کے بیسیوں گلدستے اور شباب کے سینکڑوں شیرازے بکھر چکے تھے اور ہزاروں دوشیزائیں سسک سسک کر دم توڑ چکی تھیں۔ یہاں بھی پچھمی کا تشنہ کام شباب زہر آلودہ جاموں سے سیراب کیا گیا، اور سرمایہ کی چوکھٹ پر غربت اور بے بسی کی ناقابل قبول قربانی چڑھا دی گئی''۔

علی سردار جعفری نے اپنا پہلا اور آخری افسانوی مجموعہ منزل اس نام سے شائع کیا۔ اُن کے اس افسانوی مجموعہ میں چار افسانے اور ایک ڈرامہ شامل ہے اپنے اس افسانوی مجموعہ کے تعلق سے سردار جعفری خود لکھتے ہیں کہ:

''ایک افسانے کو چھوڑ کر باقی تمام افسانوں کے کردار اس طبقہ کے لیے گئے ہیں جو زندگی کی راحتوں سے محروم ہیں۔ ان میں دہقاں کے لہو کی حرارت، مزدور کے آنکھوں کی تھکن، مفلس چہرے کی اُداسی اور زندگی کے ہونٹوں کا زہریلا تبسم ہے۔ یہ چیزیں اگر آپ کو گوارہ ہیں تو منہ بنانے کی ضرورت نہیں اور اگر بار خاطر ہیں تو پھر آج اس نظام کو کیوں ختم نہیں کر دیتے جس میں یہ چیزیں پل رہی ہیں''۔

سردار جعفری کے تمام افسانوں میں بارہ آنے ایک معیاری افسانہ تسلیم کیا جاتا ہے اور دوسرے افسانوں سے بہتر افسانہ نظر آتا ہے۔ یہ ایک ایسا افسانہ ہے جس میں سردار جعفری نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ غربت میں انسان کس حد تک گر سکتا ہے۔ اور اپنا پیٹ بھرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتا۔ اس افسانے کا ایک اہم کردار رامی ہے۔ جو ایک انتہائی غریب لڑکی ہے اور اپنے ہی معاشرے کے دوسری غریب مجبور لڑکیوں کے جسم کی سوداگری میں ایک اہم رول ادا کرتی اور پیسے کماتی ہے۔ اس پورے افسانے میں غربت کی فضا بے حسی بن کر اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ یہ کہانی ایک فرد یا طبقہ سے منسلک نہیں بلکہ اُس ہر شخص کی ہے جو غربت کے ناسور میں مبتلا ہے۔ یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ افسانے میں عورتوں کے استحصال میں سب سے بڑی مددگار بھی عورت ہی ثابت ہوئی ہے۔ اس افسانے کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں افسانے کا ماحول، کرداروں کی نفسیات، ان کی زبان، رہن سہن سب ایک دوسرے سے پوری طرح ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ اور سردار جعفری کا یہ واحد افسانہ ہے جس میں مقصدیت نے تبلیغ کی صورت اختیار نہیں کی بلکہ قاری کو غور وفکر کی دعوت دیتا اور معاشرے کو بدلنے پر آمادہ کرتا ہے۔ رامی جو اس افسانے کا مرکزی کردار ہے اُس کے خیالات کچھ اس طرح ہیں کہ مجبور لڑکیوں اور غریب عورتوں کو آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں اپنے آپ کو بیچنا ہی پڑے گا۔ اس کہانی میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک غریب کسان ہے جس کی لڑکی جمنا ہے۔ اور اس کے جسم کا سودا چھ روپے میں طے ہوتا ہے لیکن رامی جمنا کو اُس کے جسم کی قیمت صرف بارہ آنے لا کر دیتی ہے۔ اقتباس پر غور کیجیے:

''جمنا نے آنسو پونچھ کر کہا پیسے لائیں؟'' رامی نے بارہ پیسے اسے دے دیے۔ جمنا نے پیسے ہاتھ میں لے کر گننے اور کہنے لگی ''بس بارہ آنے''؟ ''اور کیا اتنی دیر میں کوئی بارہ روپے ملیں گے''۔ جمنا خاموش ہوگئی اور پیسے اپنے آنچل میں باندھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اندھیری گلی میں پہنچ کر اس نے کہا ''اب میں چلی جاؤں گی''۔ (ص۔ ۶۱)

علی سردار جعفری کا افسانہ آدم زاد بھی ایک اہم افسانہ تصور کیا جاتا ہے۔اس افسانے میں بھی اُنہوں نے عورت کا استحصال ہوتے ہوئے بتایا ہے۔اس افسانے کا مرکزی کردار ایک عورت ہے جس کا نام جھنا کا ہے۔جو ایک بیوہ ہے اور جنگ میں اپنے شوہر کے مارے جانے کے بعد گاؤں میں محنت و مزدوری کر کے اپنی زندگی بسر کرتی ہے۔یہاں سے کہانی کی فضا ایک نیا موڑ لیتی ہے لوگ اس اکیلی اور بے سہارہ عورت کا جنسی استحصال شروع کر دیتے ہیں۔جس میں گاؤں کے معززین بھی شامل ہوتے ہیں، جھنا کا جو ایک بے سہارہ عورت ہے ایک بچہ کو جنم دیتی ہے اور پورے گاؤں میں کہرام مچ جاتا ہے یہ بات ہوا کی طرح پورے گاؤں میں پھیل جاتی ہے اور اس ضمن میں ایک پنچایت بٹھائی جاتی ہے۔گاؤں کے تمام معزز اور باوقار افراد اس پنچایت کا حصہ ہوتے ہیں۔فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ جھنا کا کو ایک بدچلن عورت قرار دیا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے پورے گاؤں کی عزت پر آنچ آ گئی ایسا کہا جاتا ہے، چنانچہ پنچایت یہ فیصلہ سناتی ہے کہ جھنا کا اس گاؤں کو چھوڑ کر کہیں دوسرے گاؤں چلی جائے اُسے اس گاؤں میں رہنے کا کوئی اختیار نہیں۔تبھی جھنا کا مغرور نگاہوں سے مجمع کو دیکھتی ہے اور کہتی ہے کہ ''چودھری یہاں کون ہے جو گنگا نہیں نہایا''۔اس افسانہ میں کچھ خامیاں پائی گئی ہے جس کی اہل علم حضرات نے کچھ حد تک نشاندہی کی ہے لیکن ان خامیوں کے باوجود بھی یہ افسانہ اپنی جگہ اپنی ایک الگ شناخت رکھتا ہے۔

پاپ علی سردار جعفری کی ایک ایسی تخلیق ہے جس میں اُنہوں نے عورت کے جنسی استحصال کو ہی اپنا موضوع بنایا ہے۔عورت کا یہ استحصال ایک دوسری نوعیت کا استحصال ہے۔ایک تو وہی جو مرد عورت کا صدیوں سے کرتا آیا ہے کہ مرد عورت کو اپنے عشق کے جال میں پھنساتا ہے اور اسے سنہرے خواب دکھاتا ہے، اس کے جذبات سے کھیلتا ہے اور اس کے جسم سے لطف اندوز ہوتا ہے۔اور جب عشق کی منزل پر پہنچنے کے بعد بات محبوبہ کو بیوی کا درجہ دینے اور اس کی بدنامی کو نیک نامی سے بدلنے کی آتی ہے تو وہ طرح طرح کے بہانے تراشتا ہے اور اس سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے۔پاپ اس افسانے کا کردار اندرا ہے۔جس کا باپ ایک مندر کا پجاری ہے اور حیوانیت کا عالم دیکھیے وہ خود ہی اپنی بیٹی کا جنسی استحصال کرتا ہے۔اور اُسے (اپنی بیٹی کو) آمادہ کرتا ہے کہ وہ بھی اسی راہ پر گامزن ہو جائے۔اس افسانے ایک بیٹی کا باپ ایک مقدس رشتہ کو پامال کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

علی سردار جعفری کی ایک اور اہم تخلیق مسجد کے زیر سایہ ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک بیوہ عورت ہے۔ جو کام نہ ملنے کی صورت میں بھیک مانگنا شروع کر دیتی ہے۔ اس معاشرے ہر فرد کے سامنے ہاتھ پھیلائے نظر آتی ہے۔ لیکن اپنا پیٹ بھرنے سے قاصر رہتی ہے۔ چنانچہ آخر میں تنگ آ کر وہ اپنی اور اپنے بچہ کی نا قابل برداشت بھوک مٹانے کے لیے ایک خوانچے والے کے چند بڑے لے کر بھاگنے لگتی ہے اور بد قسمتی سے لوگوں کے چیخنے پر وہ پکڑی جاتی ہے جس کے نتیجہ میں اُسے بہت مارا جاتا ہے یہاں تک کے اُس کے منہ سے خون جاری ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں علی سردار جعفری نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کس طرح یہ معاشرہ غریب لوگوں کا استحصال کرتا ہے۔

الغرض سردار جعفری کے تمام افسانوں کا جائزہ لینے کے بعد ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ وہ عورت کی نفسیات اور اُن پر مظالم سے بخوبی واقف تھے اسی وجہ سے اُن کے افسانوں میں اس کا ذکر بار بار آیا ہے۔ عورت کے جنسی استحصال کو بڑے دردناک انداز میں اُنہوں نے بیان کیا ہے۔ فنی خامیوں کی وجہ سردار جعفری کے افسانوں کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی لیکن ان افسانوں میں اُنہوں نے عورت کی جو عکاسی کی ہے اس کی نظیر دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں ملنی مشکل ہے اپنے افسانوں کی کمیوں اور کوتاہیوں کے باوجود علی سردار جعفری اُردو ادب میں ایک اہم افسانہ نگار کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

حواشی:

۱۔ سردار جعفری فن اور شخصیت۔۔۔ نند کشور وکرم

۲۔ زندگی کا مختصر سفر نامہ (خودنوشت)۔۔۔ علی سردار جعفری

۳۔ سردار جعفری کی شخصیت کے چند پہلو (مضمون)۔۔۔ سید مہدی

۴۔ سردار جعفری کا جہاں افسانہ۔۔۔ ابو بکر عباد

۵۔ علی سردار جعفری ایک علمی ایک طلسمی شخصیت (مضمون)۔۔۔ علی احمد فاطمی

شیخ عمران شعبۂ اردو ناندیڑ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے ریسرچ اسکالر ہیں اور 'حیدرآباد کے منتخب اردو اخبارات کی ادبی خدمات' کے موضوع پر تحقیقی کام انجام دے رہے ہیں۔

علی سردار جعفری کے فکر و عمل کا ایک پوشیدہ زاویہ
(سیریل ''کہکشاں'' کے حوالے سے)

ثمینہ بیگم

علی سردار جعفری کا نام سُنتے ہی سب کے ذہنوں میں ترقی پسند شاعر کی شبیہ اُبھرتی ہے یا افسانوں اور ڈراموں کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے یا پھر اُن کے تنقیدی نظریات ذہن میں رونما ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ اگر کسی غیر اُردو داں کے سامنے بھی جعفری صاحب کا نام آجائے تو وہ بے اختیار کہہ اُٹھے گا کہ علی سردار جعفری جسے گیان پیٹھ ایوارڈ اور کئی نیشنل انٹرنیشنل ایوارڈ ملے وہ تو بہت بڑی مہان ہستی ہے۔ لیکن شاید یہ بات کہ انھوں نے سیریل بھی بنایا تھا بہت کم لوگ جانتے ہونگے۔ سیریل کا نام سُنتے ہی سب کے تصور میں 'ساس بہو' والا سین اکثر آجاتا ہے! لیکن جعفری صاحب کا یہ سیریل جس کا نام کہکشاں ہے جو پہلی بار 24 / مارچ 1991ء کو دوردرشن پر دکھایا گیا وہ اس طرح کا سیریل نہیں ہے! اس سیریل میں اُنھوں نے جدید شعرا کی زندگی کے اہم پہلوؤں کو مختلف کرداروں کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ جن میں حسرتؔ موہانی، جگرؔ مرادآبادی، فراقؔ گورکھپوری، جوشؔ ملیح آبادی، مخدومؔ محی الدین اور اسرار الحق مجازؔ شامل ہیں۔ ساتویں شاعر فیض احمد فیضؔ تھے لیکن کسی وجہ سے یہ ادھورا رہ گیا اور اس سیریل کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا اس کی وجہ بجٹ کی کمی اور جعفری صاحب کی خرابی صحت تھی۔

''ہے وہ آج بھی جسم میں روح پھونکنے کا کام کر رہا ہے''

ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا یہ جملہ جس کو اُنھوں نے اپنے مضمون علی سردار جعفری: ذکر فکر اور فن کے عنوان سے بھی پہلے لکھا ہے جو میرے اس مقالہ کا نچوڑ ہے اگر میں اس مقالہ کو صرف ایک ہی جملہ میں کہتی تو شاید یہی کہتی......! کیونکہ جب یہ سیریل دکھایا گیا ان چھ شعراء میں سے کوئی بھی باحیات نہیں تھے لیکن اگر ہم آج بھی اسے دیکھیں گے تو ہمیں ایسا محسوس ہوگا کہ یہ سارے شعراء چلتے پھرتے ہمارے ساتھ موجود ہیں! لوگ اپنے

کارناموں کی وجہ سے دلوں میں زندہ رہ جاتے ہیں لیکن جعفری صاحب کو تو دیکھے اُنھوں نے اپنے کارنامے سے اِن سب شعراء کو ہمارے دل میں ہی نہیں بلکہ ہمارے سامنے زندہ رکھا!

''کہکشاں'' سے پہلے جعفری صاحب نے دوردرشن پر ایک پروگرام محفلِ یاراں کے نام سے پیش کیا جو تقریباً آٹھ سال تک کامیابی کے ساتھ ٹیلی کاسٹ ہوتا رہا۔ شروعات میں یہ پروگرام مہینے میں دو مرتبہ دکھایا جاتا تھا جو بعد میں مہینے میں ایک مرتبہ دکھایا جانے لگا۔ اس پروگرام میں شعروادب کی مختلف عظیم شخصیتوں کو بلایا جاتا۔ ''محفلِ یاراں'' کا وہ پروگرام جس میں فیض احمد فیض اور عصمت چغتائی کو بلایا گیا تھا وہ سب سے زیادہ کامیاب رہا، کئی مہینوں تک اُس کے چرچے ہوتے رہے۔ اگر ''محفلِ یاراں'' کے سارے ویڈیو ہمیں مل جائیں تو یہ کسی انمول خزانے سے کم نہ ہوں گے۔

علی سردار جعفری خود ایک ہمہ جہت اور عظیم شخصیت ہے اس کے باوجود اُنھوں نے دوسری عظیم شخصیتوں کے کارناموں کو آنے والی نسلوں کے لیے یادگار چھوڑا، یہ اُن کی فراخ دلی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ سیریل کے ہر حصّہ میں جب بھی کسی شاعر کی زندگی کا حال شروع ہوتا سب سے پہلے جعفری صاحب اُس شاعر کا تعارف پیش کرتے، اسی طرح جب حسرت موہانی کی کہانی شروع ہوئی اُنھوں نے اُن کا تعارف کچھ اس طرح سے کیا:۔

> ''حسرت موہانی ایک مردِ فقیر تھے مفلسی اُن کی دولت تھی سچائی اُن کی طاقت وہ نیشنلسٹ بھی تھے کمیونسٹ بھی اور سچے مسلمان''۔

سیریل کہکشاں میں حسرت موہانی کی زندگی کا ایک چھوٹا سا حصّہ گرفتاری سے لے کر رہائی تک کا پیش کیا گیا۔ اسی مختصر حصّہ میں علی سردار جعفری نے حسرت کو ظاہری اور باطنی خوبیوں کے ساتھ پیش کیا۔ اداکار فاروق شیخ نے حسرت موہانی کا کردار بہ خوبی نبھایا۔ حسرت کو جتنا ہم نے پڑھا تھا، جانا تھا اور جیسا اُن کا تصور ہمارے تخیل میں محفوظ تھا ٹھیک اُسی طرح جعفری صاحب نے ہمارے سامنے اُنھیں لا کھڑا کیا، ایک منٹ کے لئے لگا کہ یہ سچ مچ حسرت موہانی ہی ہے۔ دیپتی نول نے حسرت کی بیوی نشاط النساء بیگم کا رول ادا کیا ہے اُن کی اداکاری بھی کمال کی رہی۔ اُن کے اس کردار کے ذریعہ ہمیں یہ دیکھنے کو ملا کہ اُس زمانے میں بھی عورتیں پڑھی لکھی ہوتی تھیں اور اپنے شوہر پر جب بھی مصیبت آپڑتی یا پھر وہ قید ہو جاتے تھے تو وہ نہ صرف گھر اور کاروبار کی

باگ دوڑ سنبھالتی بلکہ اپنے مقید شوہر کو خط کے ذریعہ دلاسہ دیتی اُسے حوصلہ عطا کرتی کہ وہ اسی طرح حق کے لیے لڑتا رہے اور راہِ راست پر رہے۔

سیریل میں حسرت اور اُن کی شریکِ حیات کے درمیان آپسی رشتہ کی بہ خوبی عکاسی کی گئی ہے جس میں پیار و محبت بھی ہے غصہ و ناراضگی بھی۔ کبھی اُن دونوں کو فراق کے عالم میں ایک دوسرے کو یاد کر کے تڑپتا ہوا بتایا گیا تو کبھی خطوط کے ذریعہ حوصلہ عطا کرتے ہوئے۔

تاریخِ پیدائش اور تاریخِ وفات کے لحاظ سے جائزہ لیا جائے تو 1913ء سے لے کر 1951ء تک یعنی جعفری صاحب کی پیدائش سے لے کر 38 سال کی عمر تک یہ چھ شعراء باحیات تھے۔ حسرت جعفری صاحب سے 32 سال بڑے ہے، جگر 23 سال، فراق اور جوش 17 سال، مخدوم 5 سال اور مجاز 2 سال بڑے ہے۔ جوش اور مجاز جعفری صاحب کے کافی قریب تھے لیکن مجاز ہم عمر اور ہم جماعت ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی قریب تھے:

کبھی شاخوں سبزوں برق پر، کبھی غنچوں وگل خار پر — میں چمن میں چاہے جہاں رہوں میرا حق ہے فصلِ بہار پر

اس شعر کے ساتھ ہی علی سردار جعفری نے کچھ اس طرح سے جگر مرادآبادی کا تعارف پیش کیا ہے:۔

> ''علی سکندر جگر مرادآبادی غزل کے سب سے زیادہ محبوب و مقبول شاعر اُن کے ہم عصروں میں حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، یگانہ چنگیزی بڑے نام ہیں جنھوں نے اُردو غزل کو بیسویں صدی میں نئی آب و تاب دی۔ نیا وقار بخشا۔ جگر کے غزل کی خصوصیت اُس کی رندی سرمستیوں و سرشاری ہے۔ پھر آواز کے ترنم کا جادو۔ اصغر گونڈوی اُن کے ہم زلف تھے لیکن جگر کو اُن سے ایک روحانی لگاؤ تھا۔ اس لئے اُن کے سامنے باادب رہتے تھے''۔

علی سردار جعفری نے اس سیریل کے ذریعہ جگر مرادآبادی کی ازدواجی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ جس میں اُن کی شراب کی بُری عادت کی وجہ سے اُن کی بیوی نسیم سے اُن کی علاحدگی ہو جاتی ہے۔ نسیم کی بڑی بہن کے اصرار پر اُن کے شوہر اصغر گونڈوی اُسے طلاق دے کر نسیم سے مجبوراً نکاح کر لیتے ہیں جو بدقسمتی سے اُن کے دوست جگر کی متعلقہ ہے لیکن اصغر اپنے انتقال سے پہلے اپنی بیوی سے کہتے ہے کہ اگر جگر شراب چھوڑ دے تو تم اُس سے شادی کر لینا اکیلی مت رہنا لہٰذا جگر کی شادی دوبارہ اپنی متعلقہ بیوی نسیم سے ہو جاتی ہے۔

علی سردار جعفری نے جگر کے ظاہری شکل و صورت اور عادت و اطوار کو نہ صرف ہُو بہ ہُو پیش کیا بلکہ اُن کی باطنی صلاحیت و روحانی پاکیزگی کو بھی صرف دو منٹ کے ایک منظر کے ذریعہ ظاہر کیا ہے جو قابلِ دید ہے

''آنے والی نسلیں تم پر رشک کریں گی ہم عصرو جب یہ خیال آئے گا اُن کو تم نے فراقؔ کو دیکھا تھا''

کتابوں کے درمیان بیٹھے ہوئے صاحب فکر شاعر علی سردار جعفری یہ شعر پڑھتے ہوئے فراقؔ کا تعارف کراتے ہے کہ:-

''پروفیسر رگھوپتی سرائے فراقؔ گورکھپوری الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے اُستاد اور اُردو کے بڑے شاعر، نقاد۔ یہ اُردو شاعری میں ایک نئی آواز تھی جس پر ہندوستان کی صدیوں پرانی تہذیب کی چھوٹ پڑ رہی ہے۔ اُن کی شاعری کے حسن میں ہندو روایات کا شنگار رس گُھلا ہوا ہے گھریلو زندگی کائنات کی تمام چیزوں سے زیادہ مقدس ہے۔ زندگی نے فراقؔ کو تنہا اور اُداس بنا دیا تھا۔ اُنھیں ایک ایسی بدصورتی سے سابقہ پڑا جس نے اُن کے خون میں نفرت کا زہر گھول دیا۔ لیکن جس طرح کیچڑ سے کنول کا پھول نکلتا ہے اُسی طرح فراقؔ کی تنہائی اُداسی اور نفرت کے اندھیرے سے حسن کی وہ کرن پھوٹی جس نے ''روپ'' کے رباعیوں کی شکل اختیار کر لی۔ ستیم شیوم سندرم۔ فراقؔ اُردو کا تنہا شاعر ہے جن کو گیان پیٹھ ایوارڈ ملا اور مرنے کے بعد اُن کا جنازہ سرکاری اعزاز کے ساتھ اُٹھایا گیا''۔

جعفری صاحب نے فراقؔ گورکھپوری کی زندگی کو دو الگ الگ کرداروں کے ذریعہ دکھایا ہے، ایک جوانی والا کردار اور ایک بڑھاپے والا۔ کتابوں کے ذریعہ کسی شاعر کی زندگی کا مشاہدہ کر کے اُنھیں اپنے تصور کی مدد سے دیکھنا ٹھیک ویسا ہے جیسا زمین پر رہ کر دور آسمان پر کہکشاں کا نظارا کرنا۔ لیکن جعفری صاحب اپنی حکمت اور لگن سے کہکشاں کو ہی زمین پر اُتار لائے۔ جس سے ہمیں اُنھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اُن کو اچھی طرح سمجھنے کا احساس ۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
دردوغم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہاں اس میرؔ کے شعر کا کیا کام؟ تو بات دراصل یہ ہے کہ اکثر اُردو کے بڑے شعراء کی کامیابی کا راز اُن کا اپنا دردوغم رہا ہے۔ یہاں فراقؔ جیسے بڑے شاعر کے دکھ درد کی وجہ اُن کی اپنی بیوی تھی جو کہا جاتا ہے کہ نہایت ہی بدصورت تھی۔

علی سردار جعفری نے بڑی خوبی سے فراقؔ بہ حیثیتِ ایک اچھے اُستاد اپنے شاگردوں سے بے پناہ محبت اور اپنی بیوی سے بے انتہا نفرت کو ظاہر کرتے ہوئے اُنھی کے طلباء کی زبانی اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح سے کیا کہ:

''اگر آپ کو آپ کی پسند کی جیون ساتھی مل جاتی تو آپ شعر نہیں کہتے بلکہ اُس کے چرنوں میں بیٹھے رہتے۔''

چڑیوں کی چہچہاوں کے درمیان، درخت کی گھنی چھاؤں میں، سفید شرٹ میں ملبوس، پیچھے کی طرف ہاتھ باندھے ہوئے علی سردار جعفری فراقؔ کی زندگی کے ایک دوسرے حصّہ پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ کہتے ہیں:

''سن 1930ء تک فراقؔ نے اپنی سیاسی زندگی ختم کردی اس دوران میں اپنے بہنوں کی شادی کرنے کے لیے اور باپ کا قرض ادا کرنے کے لیے اُنھوں نے گورکھپور میں اپنے لکشمی بھاون کو بیچ دیا۔ ایم اے پاس کرلیا اور الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرر ہوگئے۔ اُس کے بعد سے اُنھوں نے اپنی ساری زندگی شعروشاعری میں صرف کردی۔''

سیریل کے ایک سین میں فراقؔ، جوشؔ اور مجازؔ کو ایک ساتھ دکھایا گیا جس میں فراقؔ اور جوشؔ کا جھگڑا ہوجاتا ہے۔ جھگڑے کے دوران فراقؔ جوشؔ سے کہتے ہے کہ ''میں عمر بھر تم سے بات نہیں کرونگا۔'' جس کے جواب میں مجازؔ یہ شعر کہتے ہے۔

سر پہ سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسہ بھی نہیں

یہ شعر فراقؔ پر پوری طرح تب فِٹ ہوا جب اگلے ہی سین میں فراقؔ اپنی کتاب 'روپ' (رباعیوں کا مجموعہ) کا انتساب (Dedication) اس طرح لکھواتے ہیں:

''شاعرِ اعظم جوشؔ ملیح آبادی کے نام۔ جوشؔ کچھ دنوں کی بات ہے کہ میرٹھ کے مشاعرے میں ہم تم ساتھ ساتھ ٹھہرے، اس قیام میں مجھ سے تم سے ان بن بھی ہوگئی تھی اور آپس میں تیز تیز باتیں بھی ہوگئی تھی۔ جس کی تکلیف ہم دونوں کو بہت دنوں تک رہی۔ الہ آباد آکر جو پہلی بات مجھ سے ہوئی وہ ایک رباعی ہوئی۔ جس میں میں نے تم ہی کو مخاطب کیا ہے۔

معصوم خلوصِ باطنی کچھ بھی نہیں
وہ حرف وہ خطرۂ باہمی کچھ بھی نہیں
ایک رات کی وہ جھڑپ وہ جھک جھک سب کچھ
اور آٹھ برس کی دوستی کچھ بھی نہیں''

یہ رباعی ''روپ'' کی ان رباعیوں کا سکون تھی۔ اب یہ ترانے جو ''روپ'' کے نام سے شائع ہو رہے ہیں انتہائی خلوص ومحبت سے تمہارے نام میں معنون کرتا ہوں۔

اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے نقاد جعفری صاحب نے شعراء کی زندگی کو ہمارے سامنے رکھنے کے لیے بڑی ہی سچائی ایمانداری اور انصاف پسندی سے کام لیا ہے انھوں نے نہ صرف انسانی فطرت جیسے غصہ ، ناراضگی و نااتفاقی کو ہی نہیں دکھایا بلکہ اُن کے احساسات وجذبات اور ایک دوسرے کے تئیں اپنی محبت وفراخ دلی پر بھی روشنی ڈالی ہیں۔

جوش ملیح آبادی جس کا تعارف پیش کرتے ہوئے علی سردار جعفری کچھ اس طرح مخاطب ہوتے ہیں:

''شبیر حسن خاں جوش، لکھنؤ کے قریب ملیح آباد کی بستی میں کئی سو سال سے حسین وجمیل پٹھانوں کا خاندان آباد ہے۔ جوش ملیح آبادی اسی بستی کے چشم وچراغ ہے اُن کی شاعری میں ہندوستان کے میدانوں کی وسعت اور ہمالیہ کی بلندی ہے، گنگا جمنا کے ساحلوں کی ٹھنڈی ہوائیں اور ریگستان کی گرم لو کے جھونکے، ہندوستان کے پھولوں کی خوشبو اور ببول کے کانٹوں کی تیزی۔ شاعرِ انقلاب کے نام سے اُن کو شہرت ملی لیکن اُن کی شاعری میں حافظ کی غزلیں بھی ہیں اور قیام کی رباعیاں بھی۔ ایک لاکھ سے زیادہ اشعار کا شاعر اُردو شاعری کا ایک لافانی نام جس نے کئی نسلوں کی تربیت کی ہے۔''

علی سردار جعفری نے جوش کو چار سال کی عمر میں بھی دکھایا اور لڑکپن وجوانی کی عمر میں بھی کہ وہ کیسے تھے، اُن کے اندر آزادی کا جذبہ کیسا تھا اور اُن کی سوچ کیا تھی۔ اس کے علاوہ جعفری صاحب نے ملیح آباد کی خوبصورت سرزمین کی سیر کروائی اور خوبصورت مناظرِ قدرت سے بھی ہمیں محظوظ کرایا۔

جوش ملیح آبادی نے اپنی زندگی کے دس سال حیدرآباد میں گذارے تھے جس کے بارے میں ڈاکٹر سید داؤد اشرف نے اپنی کتاب ''بیرونی مشاہیرِ ادب'' میں تفصیلی روشنی ڈالی ہے:

> ''جوش ملیح آبادی اُردو کے بہت بڑے اور اپنے عہد کے نمائندہ شاعر ہیں۔ حیدرآباد سے اُن کا بڑا قریبی تعلق اور گہرا لگاؤ رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ حیدرآباد ہی نے جوش کو جبکہ وہ ایک جواں سال اُبھرتے ہوئے شاعر تھے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور اسی سرزمین پر اُن کی شاعری نے شباب کی منزلیں طے کی تھیں۔ حیدرآباد نے جوش کی سرپرستی بھی کی تھی۔ اُن کے ناز اُٹھائے تھے اور اُن پر عتاب بھی

یہیں پر نازل ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ ریاست بدر کر دیئے گئے تھے۔ جوش نے حیدر آباد میں اپنی عمر عزیز کے لگ بھگ دس سال گذارے تھے۔ اور حیدر آباد کے اس شہرہ آفاق دارالترجمہ میں انھوں نے نو سال سات ماہ تک ذمہ دارانہ خدمات انجام دی تھیں''۔

''بیرونی مشاہیرِ ادب'' مصنف: ڈاکٹر سیّد داؤد اشرف صفحہ نمبر: 105

جس تفصیل سے داؤد صاحب نے جوش کے بارے میں لکھا کہ کس طرح وہ حیدر آباد آئے اور یہاں اُنھوں نے ایسا کیا کیا جس کی وجہ سے وہ شہر بدر کر دے گئے یہ ساری باتیں ٹھیک اُسی طرح بلکہ اُس سے زیادہ جعفری صاحب نے ہمیں دکھایا ہے۔ یہاں تک کہ جوش کا ریاست حیدر آباد سے اخراج کے لیے جو حکم نامہ جاری کیا گیا تھا جعفری صاحب نے ہُو بہ ہُو وہی ہمیں دکھایا ہے جو داؤد اشرف صاحب کی کتاب میں صفحہ نمبر 128 پر بھی موجود ہے جو کہ اصلی حکم نامہ کی ہی ایک فوٹو کاپی ہے۔

اس سیریل میں پریکشت سہانی نے جوش کا کردار نبھایا۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور پنڈت جگن ناتھ آزاد کو بھی دوسرے کرداروں کے ذریعہ دکھایا گیا

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

اس شعر کے سُنتے ہی ذہنوں میں خود بہ خود یہ آجاتا ہے کہ اب مخدوم کی باری ہے۔ جی ہاں! علی سردار جعفری نے بھی سفید رنگ کی شیروانی پہنے، کتابوں کی ڈھیر کے درمیان بیٹھے، مخدوم صاحب کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے ہی یہ شعر کہتے ہے اور پھر کچھ اس طرح ہم سے گفتگو کرتے ہیں

''مخدوم محی الدین عثمانیہ یونیورسٹی کا سپوت سرزمینِ دکن کا قابل فخر فرزند، ترقی پسند شاعری کی کہکشاں کا ایک ستارہ، محنت و محبت کا شاعر، نئے زمانے کا کوکر کہلایا۔ مخدوم نے غلامی کی سیاہ راتوں کے پہاڑ کاٹے اور اُس کا تیشہ اُس کی کدال اُس کی شاعری تھی۔ پرانی ریاست حیدر آباد کے ضلع میدک کا ایک یتیم بچہ جو مسجدوں میں جھاڑو دیتا تھا اور نمازیوں کی خدمت کرتا تھا، بڑا ہوا تو ٹریڈ یونین رہنما، کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر اور انقلابی شاعر بن کر اُبھرا''۔

جعفری صاحب نے مخدوم محی الدین کا کردار نبھانے کے لئے اداکار عرفان خان کو چُنا۔ اُن کے اس انتخاب کی داد دینی چاہیے کیونکہ جس خوبی سے عرفان خان نے مخدوم کا رول ادا کیا وہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا یہاں تک کہ وہ ظاہری شکل وصورت سے بھی مخدوم ہی لگے۔

سیریل کے اس مخدوم والے حصّہ میں نہ صرف شہر حیدرآباد کے مختلف علاقوں کو دکھایا گیا جس میں عثمانیہ یونیورسٹی اور اسمبلی وغیرہ شامل ہیں بلکہ حیدرآباد کی بول چال اور یہاں کے پکوان جیسے قورمہ، مرچی کا سالن، شامی کباب، شکم پُر اور تل کی چٹنی کو بھی دکھایا گیا۔

ایک سین میں مخدوم مسکراتے ہوئے اپنے ساتھیوں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور اختر حسن کے سامنے احمد علی کی عشق کی داستان کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''عاشق زاد احمد علی عاشقوں کے ٹریڈ یونین کے لیڈر رہے اور نلگنڈے کے ایک اسکول میں ٹیچر۔ سن 1944ء میں اپنی معشوقہ معصومہ بی کے فراق میں جیل کی ہوا کھائے تھے اور سن 1947ء میں دونوں عاشق و معشوق تلنگانہ تحریک میں شامل ہو گئے''۔

مخدوم جب ان دونوں سے ملاقات کرنے کے لیے نلگنڈہ پہنچتے ہے تو اُن کی ساری خوشی اُس وقت غم کے اندھیروں میں گم ہو جاتی ہے جب اُنھیں پتہ چلتا ہے کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ جعفری صاحب نے اس سین کو بڑے جذباتی انداز میں فلمایا ہے جسے دیکھ کر بھی کی آنکھیں تر ہو جائیں۔

مخدوم ایک جگہ اپنے بیوی بچوں سے گفتگو کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور اُن کے یہ خیالات کو ہمارے سامنے پیش کرنے کا جعفری صاحب کا مقصد کہیں نہ کہیں اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اُن کا بھی یہی خیال ہے۔ اور وہ خیال یہ کہ 'ہم اپنے بزرگوں کو بھلا بیٹھے ہیں۔'

''میرے محبوب یہ تماشہ دیکھ کہ تیرے چاہنے والوں کے ہجوم میں ہوں اور ہزاروں رسوائیوں کے ساتھ اور ہزاروں بدنامیوں کے ساتھ سرِ بازار بھرے بازار میں ناچ رہا ہوں''۔

یہ درد بھرے الفاظ کس کے ہیں؟ علی سردار جعفری کے؟ بالکل صحیح! یا اسرارالحق مجاز کے؟ یہ بھی صحیح!!! کیونکہ مجاز اور علی سردار جعفری آپس میں گہرے دوست تھے۔ چوٹ مجاز کو لگتی تو درد جعفری صاحب کو ہوتا اور درد مجاز کو ہوتا تو آنسو جعفری صاحب کے نکل آتے۔ اس بات کا ثبوت سیریل کے شروعات میں ہی مل جائے گا جب جعفری صاحب اپنے درد بھرے انداز میں مجاز کا تعارف کچھ اس طرح سے کرواتے ہیں:

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اپنے جن فرزندوں پر ناز ہے اُن میں سے ایک اسرارالحق مجاؔز ہے مجاز کی زندگی ایک ادھوری غزل تھی اُس کی شاعری کا سارا حسن اُس کے ادھورے پن میں ہے۔ سن 1930ء کے آس پاس شاعری کے اُفق پر ایک خوبصورت ستارہ جگمگایا، لوگوں نے حیرت اور مسرت سے اس کی طرف دیکھا، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ آسمان پر چاندی کی ایک لکیر بناتا ہوا گذر گیا۔ مجاز تمام عمر اپنے زخموں سے گھلتا رہا اپنے غموں کو شاعری میں ڈھالتا رہا''۔

سیریل کے اس مجاؔز والے حصّہ میں جعفری صاحب نے نہ صرف اپنے آپ کو دکھایا ہے بلکہ ''ترقی پسند تحریک'' کے بانی سیّد سجاد ظہیر کے علاوہ کیفی اعظمی کو بھی دکھایا۔ یہی نہیں بلکہ مجاز کی ذہنی کشمکش، اُن کی بیماری جس درد کی وجہ سے تھی اُسے بھی محسوس کرانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

مجاز کی کہانی تو ہر کوئی جانتا ہے کسی نے پڑھا ہے اور کسی نے سنا ہے پر کسی نے اُن کے درد کو محسوس نہیں کیا اور اگر کسی نے کیا بھی ہے تو اپنے اپنے خیالات کے سانچے میں ڈھال کے''

اگر حقیقت میں اُن کے درد کو اُن ہی کی طرح محسوس کرنا ہو تو کہکشاں کی سیر لازمی ہے۔ جسے علی سردار جعفری صاحب نے اپنی محنت اور لگن سے تیار کیا ہے۔ جن کا ساتھ بہ حیثیتِ ڈائرکٹر جلال آغا نے دیا، جگجیت سنگھ نے اپنے سنگیت سے سنوارا، اور جعفری صاحب کی شریکِ حیات سلطانہ جعفری صاحبہ بھی اُن کے لیے مددگار ثابت ہوئیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جعفری صاحب کی نگاہوں نے بیش قیمتی ہیرے تلاش کیے تھے اس کہکشاں کے لیے اور یہ کہکشاں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ہر دور میں کہکشاں ہی ثابت ہوا ہے اور ہوتا رہے گا۔

کتابیات

شمارہ نمبر	کتاب	مصنف	مقامِ اشاعت	سن اشاعت
۱	زندگی کا مختصر سفرنامہ (خودنوشت)	علی سردار جعفری	ادارۂ ادبیاتِ اُردو، حیدرآباد	۔
۲	بیرونی مشاہیر ادب اور حیدرآباد	ڈاکٹر سیّد داوٗد اشرف	سرور پرنٹنگ پریس، حیدرآباد	۱۹۹۰ء

۳	اور کچھ بیاں اپنا (تنقیدی مضامین)	ڈاکٹر سیّد داؤد اشرف	نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد	۱۹۸۰ء
۴	علی سردار جعفری: ذکر فکر اور فن (مضمون)	ڈاکٹر ہمایوں اشرف	نوئیڈا	۲۷/نومبر ۲۰۱۱ء

مصاحبے (انٹرویو)

شمارہ نمبر	مصاحبہ	منعقدہ	تاریخ
۱	جناب ناظم جعفری صاحب (فرزند علی سردار جعفری)	بنجارہ ہلز، حیدرآباد	10.01.2014
۲	محترمہ ناہید جعفری (بیگم ناظم جعفری صاحب)	بنجارہ ہلز، حیدرآباد	10.01.2014
۳	محترمہ ایلیز بتھ کورین مونا (شاعرہ)	نامپلی، حیدرآباد	05.01.2014
۴	محترمہ منجو وینکٹ	نامپلی، حیدرآباد	19.01.2014

مشاہدہ:

سیریل ''کہکشاں''

ثمینہ بیگم شعبہ اُردو مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کی طالبہ رہی ہیں۔ انہوں نے ''جنوبی ہند میں ڈھولک کے گیتوں کی روایت'' کے عنوان سے ایم فل کا مقالہ قلمبند کیا ہے۔ وہ شاعری سے شغف رکھتی ہیں، ان کے کلام کا ایک مختصر سا مجموعہ منظر عام پر آیا ہے۔

اردو تحریک اور جعفری کمیٹی

ڈاکٹر ارشاد احمد

آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو بولنے والوں نے تعلیمی، تہذیبی اور انتظامی معاملات میں اردو کے حقوق اور ترقی کے لیے جو مسلسل جدوجہد کی ہے، اسے اردو تحریک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ آزادی سے قبل بھی اردو کے حقوق کی نگہداشت کے لیے سرسید اور ان کے رفقا خصوصاً محسن الملک، شبلی نعمانی اور مولوی عبدالحق وغیرہ نے کوششیں کیں اور 'اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن' اور 'انجمن ترقی اردو' جیسے ادارے قائم کیے۔ ان ہی کوششوں کے نتیجے میں اردو ریاست حیدرآباد کی سرکاری زبان اور عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم بنی۔

تحریک آزادی میں اہم کردار ادا کرنے والی اردو زبان ملک میں لنگوا فرینکا کی حیثیت رکھتی تھی اور ہندوستان کی قومی اور سرکاری زبان بننے کا دعویٰ رکھتی تھی۔ لیکن تقسیم کے بعد ہندوستان میں اردو غلط فہمیوں، حق تلفیوں اور ناانصافیوں کا شکار رہی۔ ۱۹۵۰ء میں دستور ساز اسمبلی میں صدر کے کاسٹنگ ووٹ سے اردو کے مقابلے صرف ہندی ملک کی سرکاری زبان قرار دی گئی۔ اردو کو دستور کے شیڈول آٹھ کے تحت ملک کی دیگر قومی زبانوں میں ایک زبان کی حیثیت سے درج فہرست کیا گیا اور آئین کی رو سے اردو بولنے والے لسانی اقلیت تسلیم کیے گئے۔ اردو کو عجیب وغریب صورت حال کا سامنا تھا۔ ایک جانب اردو، بنگلہ اور تیلگو جیسی علاقائی زبانوں کی طرح ایک ریاست جموں وکشمیر کی سرکاری زبان تھی وہیں دوسری طرف یہ ملک بھر میں رابطے کی زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ ملک کی بیشتر ریاستوں میں اردو بولنے والے دوسرے لسانی گروہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اتر پردیش، بہار، آندھرا پردیش، کرناٹک، مہاراشٹر، مغربی بنگال اور ہماچل پردیش کے علاوہ راجستھان، مدھیہ پردیش اور دیگر کئی ریاستوں میں بھی اردو بولنے والے بڑی تعداد میں موجود تھے۔ یہ اردو آبادی اپنے تعلیمی، ثقافتی اور انتظامی تقاضوں کے لیے اردو زبان کے استعمال پر منحصر

تھی۔ دستورِ ہند میں فراہم کردہ ضمانتوں اور تحفظات کا فائدہ اردو کو کم سے کم ملا۔ علاقائی زبان کے لیے دفعہ ۳۴۷ اور سرکاری زبان کے لیے دفعہ ۳۴۵ موجود تھی لیکن ان کا استعمال کسی ریاست میں نہیں ہوسکا۔ دستور کی دفعات ۳۵۰، ۱۲۰، ۲۱۰ اور ۲۹ میں لسانی اقلیتوں کے لیے گنجائش تھی لیکن ان کا استعمال اردو کے لیے نہیں ہوسکا۔

مذکورہ آئینی تحفظات کے باوجود جب عملاً اردو قومی نظام کا جز نہ بن سکی تو اردو کے قدیم مراکز اتر پردیش اور بہار میں زبردست بے اطمینانی پھیل گئی۔ ان ریاستوں میں اردو ''پہلی نہیں تو دوسری بڑی زبان'' کی حیثیت رکھتی تھی۔ جب ہندستان آزاد ہوا تھا تو اتر پردیش میں تقریباً پچاس ہزار پرائمری اسکول تھے جن میں اردو ذریعۂ تعلیم تھا۔ اردو مخالف رجحان اس قدر شدید تھا کہ آزادی کے پندرہ دنوں کے اندر اتر پردیش کے اسکولوں میں اردو کی تعلیم بند کر دی گئی۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے اردو عوام نے متحد ہو کر اردو کے حقوق کی بازیابی کے لیے جمہوری تحریک چلائی۔ اتر پردیش میں بائیس لاکھ اور بہار میں دس لاکھ دستخطوں کا محضر صدر جمہوریۂ ہند کو دیا گیا اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے مطابق اردو کو ان ریاستوں میں علاقائی زبان قرار دیا جائے۔ اس جمہوری مطالبے کو نظرانداز کر دیا گیا۔ لیکن ملک کے اردو عوام اپنی زبان کے تئیں حساس تھے اور اپنے لسانی حقوق کے حصول کے لیے بیدار اور متحد ہو چکے تھے۔ لہٰذا اردو تحریک کے اثرات سامنے آنے لگے۔ ۱۹۶۹ء میں وزارتِ تعلیم کے تحت اردو بورڈ قائم ہوا۔ ۱۹۷۲ء سے ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اردو اکادمیوں کے قائم ہونے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسی سال (۵ مئی ۱۹۷۲ء) مرکزی وزیر تعلیم نے پارلیمنٹ میں فروغِ اردو کمیٹی کی تشکیل کی تفصیلات پیش کیں جسے پارلیمنٹ نے منظور کر لیا۔ کمیٹی کے چیئرمین وزیرِ مملکت اندر کمار گجرال مقرر کیے گئے۔ کمیٹی سے درخواست کی گئی کہ وہ ''اردو زبان کے فروغ کے سلسلے میں اٹھائے جانے والے اقدامات و نیز اردو بولنے والوں کے لیے تعلیمی، تہذیبی اور انتظامی امور میں خاطر خواہ سہولتیں فراہم کرنے کے بارے میں حکومت کو مشورہ دے۔''(1) گجرال کمیٹی نے تین سال تک ہندوستان کی بیشتر ریاستوں کا دورہ کر کے اردو کے مسائل کا جائزہ لیا اور ۱۸۷ سفارشات پر مبنی رپورٹ ۸ مئی ۱۹۷۵ء کو وزارتِ تعلیم کو سونپ دی۔ یہ رپورٹ ۲۱ فروری ۱۹۷۹ء کو پارلیمنٹ میں پیش کی گئی۔ چونکہ زیادہ تر سفارشات کا تعلق ریاستی حکومتوں سے تھا، لہٰذا یہ سفارشات انھیں بھیج

دی گئیں۔ تقریباً تین ماہ بعد ترقی اردو بورڈ کی سفارش پر وزارت تعلیم نے ایک ذیلی کمیٹی کی تشکیل کی اور بورڈ کے نائب صدر آل احمد سرور کو کمیٹی کا چیئر مین مقرر کیا۔ اس کمیٹی کا مقصد گجرال کمیٹی کی ان سفارشات پر غور کرنا تھا، جن کا تعلق مرکزی حکومت کے وزارتوں سے تھا۔ ۱۲ نومبر ۱۹۸۲ء کو اس ذیلی کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کردی۔ مذکورہ کمیٹیوں کی تشکیل کے دوران ہی اردو تحریک کو دو بڑی کامیابیاں ملیں۔ پہلے ایک غیر ہندی ریاست آندھرا پردیش میں (۱۹۷۷ء) اور پھر ایک ہندی ریاست بہار میں (۱۹۸۰ء) اردو دوسری سرکاری زبان تسلیم کر لی گئی۔ اردو تحریک کی کامیابیوں کے اثرات مذکورہ ذیلی کمیٹی کی سفارشات پر بھی مرتب ہوئے۔ سرور کمیٹی کی سفارشات کا جائزہ لینے والی اسٹینڈنگ کمیٹی نے کافی غور وفکر کے بعد ۲۰ اگست ۱۹۸۳ء کو درج ذیل تجاویز پیش کیں:

(۱) بہار سرکار کے نمونہ پر دوسری ریاستوں میں سرکاری زبان سے متعلق ایکٹس میں تبدیلی کر کے اردو کو سرکاری درجہ دیا جائے۔

(۲) وزارت ایک مستقل اسٹینڈنگ کمیٹی مقرر کرے جو گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کی نگرانی کا کام کرے۔

۱۶ اپریل ۱۹۸۴ء کو ذیلی کمیٹی کی سفارشات ریاستی حکومتوں کو بھیج دی گئیں اور کنور مہندر سنگھ بیدی کی چیئر مین شپ میں کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کے لیے ایک اسٹینڈنگ کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔ ۲۳ مارچ ۱۹۸۹ء کو اسٹینڈنگ کمیٹی کی از سر نو تشکیل کی گئی جس کے چیئر مین سبط رضی ایم پی مقرر کیے گئے۔ یہ سلسلہ دراز ہو رہا تھا کہ اردو تحریک کو ایک اور بڑی کامیابی ملی اور اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ واضح رہے کہ بہار اور اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے سے متعلق کوئی سفارش گجرال کمیٹی کی سفارشات میں شامل ہی نہیں تھی۔ گجرال کمیٹی کی سفارشات کے نفاذ کے لیے اردو تحریک کا مطالبہ تیز تر ہوتا رہا۔ ۱۹۸۹ء کے عام انتخابات میں سیاسی جماعت نے اقتدار حاصل کیا، اس کے انتخابی منشور میں گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کا وعدہ شامل تھا۔ گجرال صاحب نے بھی حکومت کی توجہ اپنی سفارشات کی جانب مبذول کرائی اور ''حکومت نے فیصلہ کیا کہ سفارشات پر عمل آوری کا کام شروع کرنے سے پہلے یہ معلوم کرلیا جائے کہ کتنی سفارشات پر عمل ہوا ہے اور کتنی سفارشات پر عمل ہونا باقی ہے اور پندرہ

سال کی مدت گذرنے کے بعد کتنی سفارشات ایسی ہیں جن کی اب ضرورت نہیں ہے۔"(۲) بہرحال حکومت ہند نے گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کے لیے ۱۵فروری ۱۹۹۰ء کو ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دی اور سردار جعفری کو اس کا چیئرمین مقرر کیا۔ یہ کمیٹی جعفری کمیٹی کے نام سے معروف ہے۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے اردو کے مختلف مسائل خصوصاً اردو تعلیم کے حوالے سے گجرال کمیٹی اور جعفری کمیٹی کی سفارشات سے ہی رجوع کیا ہے۔

سردار جعفری اس سے قبل گجرال کمیٹی کی ایک ذیلی کمیٹی کے رکن رہ چکے تھے۔ اس کے علاوہ گجرال کمیٹی نے اردو کے مسائل پر جن معتبر شخصیات سے گفتگو کی تھی اور ان کی شہادتیں درج کی تھیں، ان شہادت دہندگان میں سردار جعفری شامل تھے۔ وہ جعفری کمیٹی کی ذیلی کمیٹی برائے آندھرا پردیش، کرناٹک اور مہاراشٹر اور قومی تعلیمی پالیسی (۱۹۸۶ء) جائزہ کمیٹی سے تبادلۂ خیالات کرنے والی کمیٹی کے بھی رکن تھے۔ جعفری کمیٹی نے غیر معمولی مستعدی کا ثبوت دیتے ہوئے پانچ ہفتوں میں ہی ۲۰اپریل ۱۹۹۰ء کو اہم ترین سفارشات پر مشتمل ایک عبوری رپورٹ اور ۱۸ستمبر ۱۹۹۰ء کو مکمل رپورٹ وزارتِ تعلیم کو پیش کردی۔

جعفری کمیٹی درحقیقت ایک جانچ کمیٹی تھی جس کا دائرہ کار" گجرال کمیٹی کی سفارشات پر موجودہ عمل آوری کی صورت حال کی جانچ یا ان پر مزید عمل آوری کے طریقہ ہائے کار کے سلسلہ میں مشورہ دینا تھا۔"(۳) کمیٹی نے مذکورہ دونوں امور پر اپنی رپورٹ چھ ماہ کی مختصر مدت میں پیش کردی۔ کمیٹی کا سب سے اہم کام تھا گجرال کمیٹی کی ۱۸۷ سفارشات پر پندرہ سال کی مدت میں ہوئی عمل آوری کا جائزہ لینا۔ ان سفارشات کا تعلق درج ذیل امور سے تھا:

(۱) سہ لسانی فارمولے میں ترمیم، (۲) دس فی صد یا زائد اردو بولنے والی آبادی کے لیے اردو کا سرکاری مقاصد کے لیے استعمال، (۳) اردو لسانی اقلیت کو مناسب تحفظات فراہم کرنا، (۴) اردو کا بحیثیت ذریعۂ تعلیم استعمال، (۵) اردو اساتذہ کی تربیت، (۶) اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام، (۷) یونیورسٹیوں میں اردو مراسلاتی کورس جاری کرنا، ترقی اردو بیورو کو مضبوط کرنا، اردو صحافت و ادب کا فروغ اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اردو نشریات میں اضافہ وغیرہ۔

کمیٹی نے مذکورہ سفارشات پر مرکزی حکومت اور ریاستوں میں عمل آوری کی صورت حال کا علاحدہ علاحدہ جائزہ لیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ ۱۵ سال گذرنے کے بعد بھی تقریباً ۹۵ فی صد سے زائد سفارشات پر عمل آوری نہیں ہوئی۔ رپورٹ کے مطابق ۱۸۷ سفارشات میں سے ۲ سفارشات پر یعنی آل انڈیا ریڈیو اور پی آئی بی سے متعلق گجرال کمیٹی کی زیادہ تر سفارشات پر کم و بیش عمل آوری ہو گئی ہے اور آندھرا پردیش ایسی ریاست ہے جہاں پانچ سفارشات پر جزوی عمل آوری ہوئی ہے۔

جعفری کمیٹی کی رپورٹ نے گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کی حقیقی صورت حال پیش کی جو حکومت اور عوام دونوں کے لیے چشم کشا تھی۔ جعفری کمیٹی نے اس صورت حال پر گرفت کرتے ہوئے اپنی رپورٹ میں لکھا، ''گجرال کمیٹی رپورٹ آزاد ہندوستان میں اردو کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی اہم سفارشات پر عدم عمل آوری اور دوسری بیشتر سفارشات کے سلسلے میں سست روی اردو بولنے والی آبادی کا سب سے بڑا دکھ ہے جس کے نتیجے میں حکومت کی ساکھ کو نقصان پہنچا ہے۔'' (ایضاً ۴۵) اس عدیم المثال عدم عمل آوری کا سبب جعفری کمیٹی نے یہ بتایا کہ ''ان سفارشات کی پشت پر قانونی یا سرکاری منظوری نہ تھی۔ نتیجے کے طور پر ان پر عمل آوری بالکلیہ طور پر انفرادی انداز میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی وزارتوں اور محکمہ جات کے اس وقت کے رویے اور فیصلے پر منحصر رہی''۔ (ایضاً ص ۵) کمیٹی نے اپنی سفارشات پیش کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ ''گجرال کمیٹی کی سفارشات سے جڑے ہوئے مختلف مسائل کا جامع انداز میں جائزہ لیا گیا ہے اور اس طرح رپورٹ میں مستقبل کے لائحہ عمل کے لیے ایک قابلِ عمل اساس فراہم کی گئی ہے تاکہ کمیٹی کی سفارشات پر تیز رفتاری سے عمل آوری میں مدد ملے''۔ (ایضاً) کمیٹی نے عمل آوری کو یقینی بنانے کے لیے حکومت سے پر زور سفارش کی کہ ''کابینہ ہر سفارش پر قطعی فیصلہ کرے اور سفارشات کو ایک جامع قرارداد میں شامل کرے جسے حکومت پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے سامنے توثیق کے لیے پیش کرے۔ ملک کے اردو بولنے والوں کو صرف اسی سے اعتماد پیدا ہوگا۔ اسی کے ساتھ ساتھ سفارشات پر جلد اور معینہ مدت میں عمل آوری کو یقینی بنائے''۔ (ایضاً ۳۹) جعفری کمیٹی کی دیگر اہم سفارشات درج ذیل ہیں:

☆ حکومت کو چاہیے کہ وہ ذرائع ابلاغِ عامہ پر ایک مہم کے ذریعہ منظم طور پر ان غلط فہمیوں کو دور کرے جن کی وجہ سے اردو کو غیر ملکی زبان سمجھا جاتا ہے۔

☆ تعلیم کے میدان میں اردو کے ساتھ جو بے انصافی ہوئی ہے اسے ختم ہونا چاہیے۔ اردو پڑھانے اور اردو میڈیم سے پڑھانے کے لیے فوری اقدامات کیے جائیں۔

☆ ایک کمیٹی مقرر کی جائے جس کے چیئر مین متعلقہ ریاستوں کے وزرائے اعلی ہوں۔ یہ کمیٹی آئین پر عمل آوری کی نگرانی کرے گی۔

☆ ہندی اور غیر ہندی ریاستوں میں اردو لسانی اقلیت کے لیے کچھ خصوصی انتظام کیا جائے۔

☆ (ہندی ریاستوں میں، سہ لسانی فارمولہ) جہاں تک اردو لسانی اقلیت کا تعلق ہے ان کی مادری زبان پہلی زبان ہوگی، ہندی دوسری اور انگریزی یا کوئی یورپی زبان تیسری زبان ہوگی۔

☆ اقلیتی زبان کے سرکاری استعمال کے کم از کم وہی مقاصد ہونے چاہئیں جن کی سفارش آندھرا پردیش کی انجمن ترقی اردو نے ان علاقوں کے لیے کی ہے جہاں کم از کم دس فیصد لوگ اردو اپنی اصل زبان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

☆ ان علاقوں میں جہاں دس فیصد اردو بولنے والے موجود ہیں، وہاں اردو کو مخصوص مقاصد کے لیے انتظامیہ کی زبان بنایا جائے۔

☆ تین ریاستوں یعنی آندھرا پردیش، اتر پردیش اور بہار میں سرکاری زبان سے متعلق ایکٹس میں ترمیم کی گئی ہے۔۔۔ مرکزی سرکار ریاستوں اور مرکزی علاقوں کے لیے قانون سازی کے یکساں رہنما اصول مرتب کرے۔

☆ لسانی اقلیتوں کے لیے تحفظات فراہم کرنے کا ایک نمونہ آندھرا پردیش آفیشیل ایکٹ ہے۔ کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ ریاستوں اور مرکزی علاقوں میں اسی طرح کا نظام ہونا چاہیے۔

☆ آندھرا پردیش اور کرناٹک کی طرح تمام ریاستوں میں سرکاری زبان سے متعلق کمیشن مقرر کیے جائیں جن میں اردو بولنے والوں کا نمائندہ بھی شامل ہو۔

☆ ترقی اردو بیورو کا مرتبہ ایک ماتحت دفتر سے بدل کر خود مختار ادارہ کا کر دیا جائے تا کہ اسے کام کرنے کی آزادی اور مالی اختیارات حاصل ہو سکیں۔

☆ گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کی رفتار پر نظر رکھنے کے لیے ایک مستقل عمل آوری کمیٹی کا تقرر کیا جائے جس کے چیئر مین وزیر اعظم ہوں ایسی ہی کمیٹیاں ریاستی اور مرکزی علاقوں کی سطح پر بھی قائم کی جائیں جن کے چیئر مین وزرائے اعلیٰ اور لیفٹیننٹ گورنر ہوں اور جن کے ممبر سیکریٹری اردو جاننے والے جوائنٹ سیکریٹری ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔

مذکورہ سفارشات جعفری کمیٹی کی ۱۲۷ صفحات پر مشتمل سفارشات کی محض ایک جھلک پیش کرتی ہیں۔ یہ اردو کے مختلف النوع مسائل کی آئینی، قانونی اور تکنیکی پہلوؤں کو ملحوظ رکھ کر پیش کی گئی ہیں۔ گجرال کمیٹی کی سفارشات کی نوعیت بنیادی ہے جس کے فراہم کردہ خطوط پر جعفری کمیٹی نے اپنی توسیعی نوعیت کی سفارشات مرتب کی ہیں۔ گجرال کمیٹی نے ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کو بنیاد بنایا تھا جبکہ جعفری کمیٹی نے ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کو اپنی بنیاد بنایا۔ جعفری کمیٹی نے گیارہ ریاستوں کا دورہ کر کے وہاں اردو کے مختلف مسائل کا جائزہ لیا۔ اس طرح سے یہ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۹۰ء کے درمیان ہونے والی پیش رفت کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ اس کمیٹی کا دائرہ کار بھی گجرال کمیٹی کے کے مساوی تھا۔ سرور کمیٹی نے صرف مرکزی حکومت کی وزارتوں اور محکموں میں گجرال سفارشات کی عمل آوری کا جائزہ لیا تھا۔ جعفری کمیٹی کے بعد اردو کے مسائل پر ہنوز کسی کمیٹی تشکیل عمل میں نہیں آئی۔ سید حامد کمیٹی، عزیز قریشی کمیٹی، سندھیا کمیٹی اور سچر کمیٹی وغیرہ کمیٹیاں اقلیتوں خصوصاً پسماندہ اقلیتوں کی تعلیمی مسائل کے حل کے لیے تشکیل دی گئی تھیں جنہوں نے گجرال کمیٹی کی سفارشات سے بحث کرتے ہوئے انھیں لاگو کرنے کی سفارش کی ہے۔

آندھرا پردیش، بہار، اتر پردیش کے بعد اب دہلی کی ریاست نے بھی اردو کو سرکاری زبان تسلیم کر لیا ہے۔ ملک میں اردو کے تئیں حالات میں کسی حد تک تبدیلی آئی ہے جسے امید افزا کہا جا سکتا ہے۔ اردو تحریک کا رول بھی بدلتے ہوئے منظر نامے کے ساتھ تبدیل ہو چکا ہے۔ گجرال کمیٹی کی سفارشات، جن کی توثیق جعفری کمیٹی نے کی تھی، پر مکمل عمل درآمد اب بھی باقی ہے۔ ان سفارشات پر عمل آوری کی سفارش مذکورہ تمام کمیٹیاں کرتی رہی ہیں، جسے اردو تحریک سے وابستہ افراد اور اداروں کی تائید حاصل رہی ہے۔

۱۔ سفارشات گجرال کمیٹی برائے فروغ اردو کی جانچ کرنے والی کمیٹی کی رپورٹ، ترقی اردو بیورو، وزارت ترقی انسانی وسائل، شعبۂ تعلیم، حکومت ہند، ۱۹۹۰ء، نئی دہلی، صفحہ ۱۷

۲۔ گجرال کمیٹی اور اس سے متعلق دیگر کمیٹیوں کا جائزہ، خلیق انجم، ۱۹۹۸ء، نئی دہلی، صفحہ ۲۰

۳۔ ایضاً صفحہ ۳۹

ڈاکٹر ارشاد احمد، مرکز برائے اُردو زبان، ادب و ثقافت، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ انہوں نے جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے ''امیر خسرو کا عہد اور ان سے منسوب ہندوی کلام کا تنقیدی مطالعہ'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔

Centre for Urdu Language, Literature & Culture
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad